خدابخش لائبریری

جرنل

۴۷



خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

خدا بخش لائبریری

سہ ماہی

جرنل

پٹنہ



خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

رجسٹریشن نمبر : ۳۳۴۴۴/۷۷ | قیمت فی شمارہ : پچیس روپے

شمارہ : سینتالیسواں | سالانہ : ۱۰۰ روپے (ہند)

قیمت : پچیس روپے | ۲۰ ڈالر (ایشیا)، ۴۰ ڈالر (دیگر ممالک)

فہرست

۱۹۸۸ء

خدابخش لائبریری نے پٹنہ لیتھو پریس، رمنا لین، پٹنہ-۴ اور لبرٹی آرٹ پریس دہلی سے چھپوا کر شائع کیا۔

ایڈیٹر: عابد رضا بیدار

آثارِ آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کے اوائلِ عمر کی خود نوشت تحریریں



مرتبہ

پروفیسر سید قدرت اللہ فاطمی
اسلام آباد (پاکستان)

پروفیسر سیّد قدرت اللہ فاطمی (پ ۱۹۱۲ ء) خانوادہ صادق پور (عظیم آباد، پٹنہ) کے چشم و چراغ اور شمس العلماء خان بہادر مولانا محمد یوسف جعفری رنجور عظیم آبادی کے نواسے۔ آپ کے والد مولوی سیّد محمد عبداللہ برطانوی حکومت کے تحت انڈین ممبر بورڈ آف اگزامنرز کے عہدہ پر فائز تھے جن کی تصنیف "الخلافۃ فی خیر الامۃ ردا علی النبوۃ فی خیر الامۃ" علمی حلقوں میں کافی شہرت کی حامل ہے۔ فاطمی صاحب نے ابتدائی تعلیم پٹنہ میں حاصل کی۔ آئی سی ایس کے امتحان میں شریک ہوئے اور کامیاب بھی ہوئے لیکن بعض مشکلات مانع آئیں چنانچہ انگلینڈ جا کر اس کے زبانی (Viva) امتحان میں شریک نہ ہو سکے۔ اس طرح سرکاری افسری کے بجائے آپ کی زندگی علم و ادب کی خدمت کے لیے جو آپ کا خاندانی ورثہ تھی، وقف ہو گئی۔

تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے جہاں ایک مدت تک ترکی ایران پاکستان تنظیم، آر۔ سی۔ ڈی۔ (ریجنل کوآپریشن فار ڈویلپمنٹ Regional co-operation for Development) کے کلچرل سنٹر کی پاکستان شاخ کے ڈائرکٹر رہے۔ کئی سال ملیشیا میں پاکستانی اسٹڈیز کے پروفیسر رہے۔ پاکستانی ٹی وی پر مستقلاً آپ کے علمی ادبی شذرات سننے والوں کے لیے دلآویزی پیدا کرتے رہے ہیں۔ پاکستان اور برصغیر کی تاریخ پر آپ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔

ملازمت سے اب ریٹائر ہو کر اسلام آباد میں مقیم ہیں اور علمی و ادبی سرگرمیوں میں مشغول ہیں۔

مقدمہ

میرے نانا شمس العلما خان بہادر مولانا محمد یوسف جعفری رنجور عظیم آبادی مرحوم و مغفور کے ذاتی کتب خانہ (واقع محلہ نہھیہ بگزار باغ، پٹنہ) میں حضرت مولانا ابوالکلام آزادؔ کے اوائلِ عمر کی چند تحریریں محفوظ ہیں۔ آزادی کے بعد ان کے پوتے عزیزم محمد سبحان جعفری ایم بی اے (ابن مولوی محمد حسان جعفری مرحوم) نے نقل مکانی کر کے کراچی میں سکونت اختیار کی اور وہ یہ نادر خزانہ اپنے ساتھ لے گئے۔ اور ازراہِ سعادتمندی یہ کہتے ہوئے انھوں نے اسے میرے حوالے کر دیا کہ "بھائی جان اس کے مستحق آپ ہیں۔ آپ چاہیں تو اسے اپنے پاس محفوظ رکھیں، یا مناسب سمجھیں تو اسے شائع کر دیجیے۔" مجھے اس سے قبل ان تحریروں کا علم نہ تھا۔ ان کے مطالعے سے پتہ چلا کہ ان میں سے اکثر نجی نوعیت کی ہیں۔ بنابریں حضرت مولانا سے پوچھے بغیر ان کی اشاعت کو میں نے روا نہ رکھا۔ لیکن مولانا سے مشورہ لیا کیسے جائے؟ میں نے اپنے بچپن ہی سے انھیں "آزاد نانا" کی حیثیت سے جانا تھا۔ آزادی سے پہلے بالخصوص انتقالِ اقتدار کے سلسلے میں شملہ مذاکرات کے دوران میں ان سے طویل ملاقاتوں کی سعادت حاصل ہوئی تھی (اس زمانے میں ہم لوگ شملہ میں مقیم تھے) لیکن ۴۷ء کے بعد تو میرے اور مولانا کے درمیان آگ کا دریا حائل تھا! مجھے یقین تھا کہ یہ حالات بہت دیر تک قائم نہیں رہیں گے، دونوں نوآزاد ملکوں کے درمیان ہمسایگی کے رشتے استوار ہوں گے۔ بالآخر حالات نسبتاً بہتر ہوئے۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں اس سے مستفید ہو کر آزاد نانا کی خدمت میں حاضر ہوتا، وہ وہاں چلے گئے جہاں ان سے رابطہ قائم کرنا ممکن نہ تھا۔ یوں یہ تحریریں میرے پاس امانت پڑی رہیں۔

۶۴، ۶۵ء کی بات ہے کہ آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کراچی کے مستعد معتمد جناب (اب ڈاکٹر جناب) ابوسلمان شاہ جہاں پوری مولانا غلام رسول مہر کے تعارف کے ساتھ تشریف لائے اور انسٹی ٹیوٹ کی کارگزاریوں اور مستقبل کے منصوبوں کا انھوں نے ذکر کیا۔ میں نے ان کے اصرار پر حضرت مولانا کی تحریروں میں سے منظومات کا بیشتر حصّہ

ان کے حوالے کر دیا کہ وہ اسے کسی مستند مجلّے میں عکسی تصاویر کے ساتھ شائع کر دیں۔ میں ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنے وعدے کا بخوبی ایفا کیا۔ اور ان منظومات کو انجمن ترقی اردو پاکستان کے سہ ماہی مجلّہ "اردو" میں عکسی چربوں کے ساتھ چھپوایا اور ان پر مفید نوٹ کا اضافہ کیا[1]۔

حضرت مولانا کے انتقال کو تیس سال گزر چکے ہیں۔ ان کی وہ یادداشت جو "انڈیا ونس فریڈم" کے تیس غیر مطبوعہ صفحات پر مشتمل ہے عنقریب واگزار ہو جائے گی اور مولانا کی جامع سوانح عمری لکھنے کا وقت آئے گا۔ یقیناً اب مولانا کے اوائل عمر کی ان تحریروں کو بھی منظر عام پر آ جانا چاہیے، اس لیے کہ مولانا کے ذہنی ارتقا کے بنیادی مراحل کو سمجھنے کے لیے ان کے فکر کے تشکیلی دور کی ان تحریروں کا تجزیاتی مطالعہ ضروری ہے۔ وہ تیس صفحات جن کا اتنا کچھ چرچا ہے، انکے ذہنی سفر کے خاتمۃ الکتاب کے اجزا ہیں تو یہ گمنام تحریریں اسی سفر کے فاتحۃ الکتاب کے اوراقِ پریشاں ہیں۔



ڈاکٹر عابد رضا بیدار لکھتے ہیں: "۱۴، ۱۵ سال کی عمر تھی کہ کپل وستو کے شہزادے گوتم کی طرح کلکتے کے اس مرشد زادے کو بھی حقیقت کی تلاش نے بے چین کر دیا، جس کے نتیجے میں عقیدے ایک ایک کر کے تار تار بکھر گئے"[2]۔ عین اس زمانے میں جب کہ کلکتے کے اس مرشد زادے کے ذہن میں یہ انقلاب آ رہا تھا اس کے پڑوس میں صادق پور کا ایک خاندان آ بسا، جس کے سربراہ محمد یوسف جعفری تھے۔ ان کے والد (مولانا یحییٰ علیؒ شہیدِ انڈمان)، حقیقی چچا (مولانا احمد اللہ شہیدِ انڈمان) اور سگے ماموں (مولانا عبدالرحیمؒ اسیرِ انڈمان) راہِ خدا میں اپنا سب کچھ لٹا چکے تھے۔ "وہابیت" جس سے اس مرشد زادے کے خاندان کو للّٰہی بغض تھا وہ اس نئے پڑوسی کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اس لیے کہ جہاد فی العمل اور اجتہاد فی النظر کی وہ دعوت جو اپنوں اور غیروں —— بالخصوص غیروں —— میں "وہابیت" کے نام سے جانی گئی، اس دعوت کے نقیب ہونے کے جرم کی سزا میں اس کے بزرگوں کو کالے پانی کی عمر قید سزا، مکانات کے انہدام اور خاندانی سرمایے کی ضبطی کی شکل میں بھگتنی پڑی تھی۔ وہ اب بھی اپنے اجداد کے دین پر سختی سے عامل تھا۔ وہ یقیناً چیف مولوی بورڈ آف ایگزامنرز کے عہدے پر متمکن تھا اور حکومتِ برطانیہ کا انتہائی دیانتدار ملازم تھا۔ اتنی بات تو سب جانتے تھے۔ لیکن بیوی بچوں اور مجاہدین کے امیر اور ایک آدھ معتمد بزرگوں کے سوا کسی کو کانوں کان اس کی بھنک نہیں پہنچی تھی کہ وہ اپنی آمدنی کا بڑا حصہ ان مجاہدوں تک بالالتزام

[1] مجلّہ سہ ماہی اردو۔ انجمن ترقی اردو کراچی۔ اکتوبر ۱۹۶۶، ص ص ۱-۱۷ [2] عابد رضا بیدار: مولانا ابوالکلام آزاد —— انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز رامپور، ۱۹۶۸ء، ص ۵۵۔

پہنچایا تھا جواب بھی شمال مغربی سرحد پر واقع آزاد علاقے میں چوکیاں قائم کیے کسی مناسب وقت کے منتظر تھے۔ اپنے اجداد کے ساتھ اس کے ظاہر و باطن کی وفاداری اس قدر قابلِ اعتماد تھی کہ جب وہ رخصت لے کر اپنے آبائی وطن پٹنہ آتا تھا تو اس کے ماموں مولانا عبدالرحیمؒ مصنف تذکرۂ صادقہ جو لارڈ رپن کی عام معافی کے اعلان کے بعد انڈمان سے دہلے اور دوسرے عوارض کی سوغات لے کر لوٹے تھے خاندانی جامع مسجد میں جمعے کے خطبے اور نماز کی امامت کے فرائض اُسی کو سونپتے تھے۔

مولوی محمد یوسف جعفری کی ہمہ جہت شخصیت کا یہ ادنیٰ کرشمہ تھا کہ وہ صرف صادقپوری وہابی نہ تھے بلکہ سید کی علیگ بھی تھے۔ یعنی پیش نظر تحریروں کے مصنف کے قول کے مطابق "علی گڑھ کالج کے اولڈ اسٹوڈنٹس میں ایک ممتاز شخص"۔ ص ۲۲ مولوی محمد یوسف جعفری کی شخصیت کا یہ قرانِ السعدین تاریخ کے جدلیاتی عمل کا عین تقاضا تھا۔ علی گڑھ تحریک کے بانی نے اپنی سب سے عظیم تصنیف 'آثار الصنادید میں'[1] جناب ہدایت انتساب زبدۂ واصلان درگاہ حضرت سید احمد صاحب "طاب ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ" اور محی السنۃ قامع البدعۃ مولانا مولوی محمد اسمٰعیل" کا ذکر اس والہانہ انداز میں کیا ہے جس کی نظیر جماعت مجاہدین کی تصانیف میں بھی نہیں ملتی۔ ان کی تصنیف 'راہ سنت در ردِ بدعت'' تو الطاف حسین حالی کے قول کے مطابق "وہابیت کے جوش کے زمانے" میں لکھی گئی تھی۔[2] لیکن جب ۱۸۷۱ء میں سر ولیم ہنٹر نے وہابیوں کے خلاف سازش کے مقدموں اور ان کے ظالمانہ فیصلوں کی تائید و استحکام کے لیے OUR INDIAN MUSLIM نامی کتاب لکھی تو انھیں نے اس کا سخت درشت اور مدلل جواب انگریزی اخبار پائینیر میں دیا جس کا اردو ترجمہ "ہنٹر پر ہنٹر" کے برمحل عنوان سے شائع ہوا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس "نیچری" کی وہابیت کا جوش ۱۸۷۱ کے انتہائی پرآشوب دور میں اپنے نقطۂ عروج پر تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ وہابیوں کی کوئی بے ضرر سی تحریر کسی کے گھر سے نکل آتی تھی تو اس کو انتہائی سخت سزائیں بھگتنی پڑتی تھیں۔

۱۔ سید احمد خاں، 'آثار الصنادید' مطبع سید الاخبار' دہلی ۱۸۴۷ء ص ۴۲-۴۷ و ص ۱۷، ۹۹-۱۰۳۔ گارساں دتاسی نے اس کتاب کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کیا تھا۔ سیشن جج ایڈورڈ ٹامس اور کلکٹر رابرٹس نے انگریزی میں ترجمہ شروع کیا تھا لیکن اس کی ادق فارسی آمیز طرز عبارت کو آسان کرنے کی فرمائش کی۔ ساتھ ہی یہ مشورہ دیا کہ کتاب آثار قدیمہ پر ہے، اس میں چوتھا طویل باب بعنوان "شاہجہاں آباد کے لوگوں کا بیان معاصرین کے بارے میں ہے، یہ انمل بے جوڑ سی بات ہے۔ سید احمد خاں نے دونوں معقول مشورے قبول کر کے آشوب ۵۷ء سے تین سال پہلے کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔ (حیات جاوید ص ۴۶) یہ خیال کرنا بے موقع ہے سیاسی حالات کے تحت سرسید نے آثار الصنادید میں ترمیم کی تھی' غلط پروپگنڈہ ہے۔ ۲۔ الطاف حسین حالی : حیات جاوید' ترقی اردو بورڈ' نئی دہلی ۱۹۷۹ء ص ۱۲۵

عین اس زمانے میں برملا اپنی وہابیت کا اعلان کر کے علی گڑھ کے "نیچری" نے جس استقامت کا ثبوت دیا تھا' اس سے اسی کی توقع کی جاسکتی تھی کیوں کہ ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد اسی نے "رسالہ اسباب بغاوت ہند" لکھ کر اعلانِ حق کیا اور جہاد بالقلم کا حق ادا کیا تھا۔ تلاش حق کے سفر کے راہی کو جواب غلام محی الدین سے محی الدین احمد ہو چکا تھا' کیونکہ باپ کے دیے ہوئے نام میں اسے "شرک کی بُو" محسوس ہوتی تھی![1] محمد یوسف جعفری کی شکل میں ایک شجرِ سایہ دار ملا۔ والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ والد اور بڑے بھائی (مولانا ابوالنصر غلام یٰسین آہ) اور ماموں "عرب صاحب" سے شدید اختلافات پیدا ہو چکے تھے' جس کی جھلکیاں آپ کو آئندہ صفحات (ص ۱۸-۲۲) پر نظر آئیں گی۔ محمد یوسف جعفری نے باپ اور بڑے بھائی کا خلا پُر کر دیا۔ ملیح آبادی کی روایت کے مطابق مولانا آزاد فرماتے ہیں: "اس زمانے میں مولوی محمد یوسف جعفری سے جواب شمس العلماء خاں بہادر ہو کر ریٹائر ہوئے ہیں' ملاقات بہت بڑھ گئی تھی اور روزانہ دارالاخبار میں ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ ابتداء سے وہ احسن الاخبار' انجمن اور دارالاخبار کی تجویز اور انتظام کے ایک شریک اور معاون رہے تھے۔"[2] روزانہ کی ان ملاقاتوں کے ساتھ ساتھ نصف ملاقات کا سلسلہ بھی جاری تھا جس کے شاہد آئندہ صفحات ہیں۔ محمد یوسف جعفری رنجور اور محی الدین احمد آزاد کی عمروں میں جتنا زیادہ تفاوت تھا' ان کے ذہنوں میں اتنا ہی تطابق تھا۔ اس لیے آزاد اس تعلق کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہ کر پائے۔ چھوٹائی بڑائی اور برابری کے نشیب و فراز سے ان خطوط کے قاری کو قدم قدم پر سابقہ پڑتا ہے۔ بمبئی سے جو خط لکھے گئے ہیں ان میں تو آزاد برابری کی سرحدوں کو بھی پار کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ اب مولوی محمد یوسف جعفری کے خورد نہیں بلکہ بزرگ دکھائی دیتے ہیں۔ "یہ بڑاپن" آزاد کے سوانح نگاروں اور ناقدوں کے لیے ان کی نفسیات کا ایک معمّہ بن کر رہ گیا ہے۔ انگریزی میں کہاوت ہے کہ کچھ لوگ پیدائشی بڑے ہوتے ہیں' کچھ خود اپنی کوشش سے بڑے ہو جاتے ہیں اور کچھ پر بڑائی تھوپ جاتی ہے۔ مولانا عظمت کی ایک چوتھی صنف کے مالک تھے۔ وہ پیدائشی بڑے تھے اور بہت بڑے۔ والد مولانا خیرالدین' پردادا مولانا منورالدین ایک عظیم گھرانے کے عظیم ترین سپوت تھے۔ مولانا نے یہ عظمتیں ورثے میں پائی تھیں۔ انتہائی ذہانت اور غیر معمولی علم و فضیلت کے جوہر بچپن ہی میں آشکار ہو گئے تھے۔ وہ بچپن ہی میں پیر سمجھے جانے لگے تھے۔ لیکن اس موروثی عظمت کو ٹھکرا کر انھوں نے اپنے لیے اکتسابی عظمت کی نئی منزل ڈھونڈی اور ساری عمر اس کی تلاش میں

۱۔ ناموں کی یہ اصلاح وہابی تحریک کے ردِّ شرک کا ایک حصّہ تھی۔ اس اصلاح کی سب سے نمایاں مثال مولانا احمد اللہ شہید انڈمان کا نام نامی ہے جو اصلاً احمد بخش تھا۔ ۲۔ عبدالرزاق ملیح آبادی: آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی بہ روایت ملیح آبادی مکتبۂ اشاعت القرآن' دہلی' ۱۹۶۵ء ص ۲۸۰۔

سفر جاری رکھا۔ اس سفر کا نقشہ اور نشان بنانے کے لیے ان کے پاس صرف ایک نسخہ تھا: نمی روِیم زراہے کہ کارواں رفت ست۔ تنہائی ایسے مسافر کا مقدر ہوتی ہے۔ وہ برابر تنہا رہے۔ باپ نے لڑکپن میں ان کی شادی کر دی تھی۔ لیکن ایسی خاتون نہیں بلکہ بچی کے ساتھ جن سے ذہنی رفاقت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ ان سے صرف ایک بیٹا ہوا جو بچپن ہی میں فوت ہو گیا۔ مولوی محمد یوسف جعفری نے تقریباً چار سال حق رفاقت ادا کیا۔ لیکن ان کی اپنی بھرپور عائلی زندگی تھی۔ وہ اپنے بال بچوں پر جان چھڑکتے تھے۔ اپنے جوان بیٹے بنیامین کے مرنے پر انھوں نے رو رو کر اپنی آنکھیں گنوا دی تھیں اور ان کے ساتھ وہی کچھ ہوا تھا جو ان کے ہمنام کی جدائی میں حضرت یعقوب ؑ کو پیش آیا تھا۔ یعنی وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ؁[1] ظاہر ہے یہ رفاقت دیرپا نہیں ہو سکتی تھی۔ ان کے ختم ہونے سے پہلے ہی مولانا شبلی نے خلا کو پُر کر دیا تھا۔ لیکن راہِ سفر عظمت و عزیمت کا ساتھ مولانا شبلی بھی زیادہ دیر نہ دے سکے۔ تاہم تھوڑے دنوں کی اس رفاقت نے ندوہ والوں کے ساتھ منافست کا در نہیں تو دریچہ ضرور کھول دیا، جس نے شاید آگے کی رفاقتوں کی راہ بند کر دی۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی یا پروفیسر اجمل خاں کی رفاقت کسی بزرگ یا برابری کے درجے کے آدمی کی رفاقت نہ تھی۔ مولانا اس وقت تک اتنے آگے نکل چکے تھے کہ کوئی انکا رفیق نہیں ہو سکتا تھا۔



اس پس منظر میں مولانا کے سوانح نگار قاضی عبدالغفار[2] اور ڈاکٹر عابد رضا بیدار[3] مولانا کی "انانیت" کو ان

۱۔ ترجمہ: "شدت غم سے (روتے روتے) اس کی آنکھیں سفید پڑ گئیں اور اس کا سینہ غم سے لبریز تھا" سورہ یوسف (۱۲: ۸۴)۔ ۲۔ قاضی محمد عبدالغفار: آثار ابوالکلام آزاد: ایک نفسیاتی مطالعہ، نیشنل انفارمیشن اینڈ پبلیکیشنز، بمبئی ۱۹۴۹ء، ص ص ۳-۳۲۔ ۳۔ بیدار، حوالہ ماقبل، ص ۳۲۔ ۴۔ شاید ۳۴ء، ۳۷ء کی بات ہے۔ مولانا کی تفسیر ترجمان القرآن جلد دوم کے بیان ذوالقرنین اور بعض دوسرے مقامات پر اعتراضات نے ہندوستان بالخصوص کلکتے میں شورش کی سی کیفیت اختیار کر لی تھی۔ بعض اصحاب اسے ہوا دے رہے تھے تاکہ کلکتہ میدان میں مولانا عیدین کی نمازوں کی امامت اور خطبے کے فرائض سر انجام دیتے آئے تھے اس پر خود قابض ہو جائیں۔ مولانا ملیح آبادی کا ہفتہ وار "ہند" کلکتہ مولانا کی مدافعت کرتا تھا۔ ایک موقع پر مولانا ملیح آبادی نے مولانا کے اپنے وضاحتی بیان کی ضرورت شدت سے محسوس کی اور مولانا سے اس کے خواستگار ہوئے۔ مفسر قرآن نے وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ اور وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا کی ہدایات قرآنی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اس سے انکار کیا۔ ان کے اصرار پر ملیح آبادی رو دیے کہ مولانا نے کہا: "کمبخت مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی میں کیا پروا کرتا ہوں" ملیح آبادی کے پٹھان کو غصہ آگیا اور ایک تند و تیز اداریہ لکھ ڈالا جس میں مولانا کے "تکبر" پر سخت تنقید تھی۔ حال ہی میں مرحوم I am Henderson Douglas کا تحقیقی مقالہ Abul kalam Azad An Intellectual and Religious Biography ان کے دو فاضل ساتھیوں Gail Minault اور Christian W Troll کی ترتیب، تصحیح اور اضافوں کے ساتھ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس دہلی نے شائع کیا ہے۔ ان مغربی محققوں کو بھی آزاد کی "انانیت" (egotism) بہت کھٹکتی ہے۔ اس کا انھوں نے تجزیہ کیا ہے۔

کی نفسیات کا محوری نکتہ سمجھتے ہیں۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی تحریروں میں بھی اس کی طرف واضح اشارے ملتے ہیں۔
میں نے انتقالِ اقتدار کے زمانے کی طویل صحبتوں میں مولانا کی "انانیت" کا ایک اور رخ دیکھا ہے۔ انتہائی عجز و انکسار کا رخ۔ مولانا نے اپنے ذاتی ملازم عبداللہ کو ہدایت کر رکھی تھی کہ میں جس وقت بھی آؤں وہ مجھے ان کے کمرے میں پہنچا دیں۔ اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے چائے کی پیالی سے تواضع کرتے رہیں۔ (میں نے مولانا کے ہاں "گوری چنبیلی" والی چینی چائے کبھی نہیں دیکھی۔ نہ کبھی خود اُن سے اس کی فرمائش کی۔ میں جانتا تھا کہ یہ مشروب مخصوص ہم شربوں تک محدود شے ہے۔ مولانا زندگی بھر بدل ڈھونڈتے رہے۔ یہ بھی اس کا ایک کرشمہ تھا۔) مجھے ہدایت تھی کہ میں اپنے دفتر کے اوقات کار کے بعد روزانہ اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو ہر دوسرے تیسرے دن حاضری دوں۔ مولانا کے ہاں وفود کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ مجھے یہ حکم تھا کہ کسی اور ملاقاتی یا وفد کے آنے پر ایک طرف ہٹ کے بیٹھا رہوں تاکہ ان کے چلے جانے کے بعد سلسلۂ کلام جاری رہے۔ انتقالِ اقتدار کی پیچیدگیوں کی بنا پر مبہمات امور پر مولانا کی گفتگوئیں ہوتی تھیں۔ میں ملاقاتیوں کے رخصت ہونے کے بعد یا دوسرے اہم تر مقامات سے مولانا کی واپسی کے بعد دخل در معقولات سے نہیں چوکتا تھا۔ ایک تو بر خود غلط تھا، دوسرے نوجوانی کا جوش تھا، اور ان پر مستزاد یہ کہ نانا حوصلہ بڑھاتے تھے۔ میں اکثر مولانا کے اپنے خیالات اور اہم سیاسی فیصلوں پر تنقید کر ڈالتا تھا۔ کبھی کبھی یہ تنقید تلخ بھی ہو جاتی تھی۔ لیکن "انانیت" کے اس دلآویز پتلے کی روشن جبیں پر کبھی شکن نہیں پڑی بلکہ بسا اوقات تنقید جتنی تیز ہوائی قدر ان کی بشاشت میں اضافہ ہوتا تھا۔

پہلے تو میرا خیال یہ تھا کہ ان کی خُلقی فروتنی میری اپنی خِلقی فروتنی کا نتیجہ ہے۔ مولانا اتنے زیادہ قد آور ہیں، اور میں ان کے مقابلے میں اتنا بونا ہوں، کہ از راہِ شفقت مجھ سے ملنے کے لیے انھیں جھکنا پڑتا ہے۔ لیکن ایک دفعہ ایسا واقعہ پیش آیا جس نے مجھے اپنی اس توجیہ میں کسی قدر ترمیم کرنے پر مجبور کیا۔ ہوا یوں کہ کانگریسی خیال کے ایک مسلمان ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تحریکِ پاکستان کا زور تھا۔ کانگریسی ہونے کے سبب وہ مسلمانوں میں معتوب و مغضوب ہو چکے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس جرم کی پاداش میں ان کی دو جوان بیٹیوں کی نسبت توڑ دی گئی تھی۔ کسی باپ کو اس سے بڑی سزا نہیں مل سکتی ہے۔ وہ بچارہ بہت دلگیر تھا۔ مولانا نے اسے تسلی دلاسا دیا۔ جس سے حوصلہ پا کر اس نے مسلم لیگ کے لیڈروں بالخصوص قائداعظمؒ کی شان میں نازیبا کلمات کہنے شروع کیے۔ مولانا کروٹیں بدلنے لگے۔ چہرے پر انتہائی برافروختگی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ لیکن وہ اپنی سی کہے گیا۔ آخر مولانا پھٹ پڑے۔ چیخ کر اس سے کہا کہ اس سارے واقعے کا جناح صاحب سے کیا تعلق ہے؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ان کی شان میں گستاخی کر کے میری خوشنودی حاصل کر لوگے؟ مجھے

تمہاری ان کی شان میں بدکلامی سے سخت تکلیف پہنچی ہے۔ دور ہو جاؤ میری نظروں سے جاؤ۔ دفع ہو جاؤ"۔ وہ روتا دھوتا چلا گیا۔ نانا پر دیر تک انقباضی کیفیت طاری رہی۔ مولانا کے قائدِ اعظمؒ سے سیاسی اختلافات تو تھے ہی، وہ نہ صرف سیاست بلکہ طرزِ معاشرت اور اندازِ فکر میں ایک دوسرے کی ضد تھے۔ قائدِ اعظمؒ نے اپنے ایک اخباری بیان میں مولانا کو "کانگریس کا شو بوائے" کہہ کر بظاہر ان کی انا کو سخت ٹھیس پہنچائی تھی۔ اس صورت میں "انانیت پسند" ابوالکلام کا یہ ردِ عمل میرے لیے ناقابلِ فہم تھا۔

اس واقعے کا تو میں عینی شاہد تھا۔ ایک دوسرا واقعہ میں نے اپنے استادِ محترم پروفیسر اشتیاق حسین قریشی مرحوم سے سنا تھا۔ وہ اس وقت پاکستانی کابینہ کے رکن تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ مولانا مڈل ایسٹ کے غیر سگالی کے دورے پر روانہ ہونے والے تھے۔ اس زمانے میں اتنے لمبے سفر کے لیے نئی دہلی کے ہوائی جہازوں کو کراچی کے ہوائی اڈے پر پٹرول لینے کے لیے اتر پڑتا تھا۔ مولانا وزیرِ تعلیم تھے۔ ہندوستانی کابینہ کے سینئر رکن۔ پاکستانی حکومت کو پیشگی اطلاع بھیجی گئی۔ قائدِ اعظمؒ کے انتقال کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ ان کے مزار کے گرد مہاجروں کی جھگیاں تھیں۔ بیرونی ملکوں کے عمائد کے لیے مزار پر حاضری دینا سفارتی آداب (پروٹوکول) میں داخل ہو گیا تھا۔ عمائد کی آمد کے موقع پر جھگیوں کو قناتوں سے چھپا دیا جاتا تھا۔ اور معزز مہمان کے لیے سرخ بانات اور قالین بچھا دیے جاتے تھے۔ سرکاری حلقوں میں عام تاثر یہ تھا کہ قائدِ اعظم سے مولانا کے سیاسی اختلافات سے قطع نظر کر لیا جائے تب بھی مولانا وہابی ہیں، مزار پر حاضری ان کے مزعومہ دینی عقیدے کے خلاف ہو گی۔ اس لیے ان کی کراچی تشریف آوری بالکل غیر سرکاری قرار پائی، محض پٹرول بھروانے کے لیے۔ اپنے وقت پر جہاز آیا۔ ہوائی اڈے پر ہندوستانی ہائی کمشنر (اس وقت دونوں ملک دولتِ مشترکہ کے رُکن تھے) موجود تھے۔ مولانا ہوائی جہاز سے اترتے ہی ان کی کار میں سوار ہو کر مزارِ قائد پر حاضر ہوئے۔ فاتحہ پڑھی۔ دعائے مغفرت مانگی اور کچھ دیر مراقبے کی سی کیفیت میں رہے۔[1] آمد اور واپسی کے موقع پر جھگی نشین مہاجروں سے سلام اور مصافحے سے جلدی میں فارغ ہوئے۔ پھر سیدھے ہوائی جہاز میں سوار ہو کر اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ انانیت پسند ابوالکلام کے اس رویے نے دونوں ملکوں کے عمالِ حکومت کے لیے تھوڑی سی اُلجھن پیدا کر دی تھی۔

بات چلی تھی مولانا کے بڑے ہونے اور بڑے بننے سے۔ درمیان میں ان کے اکیلے ہونے ــــ گھور اکیلا پن ــــ سے ہوتی ہوئی ان کی انانیت اور انکسار کے گرد گھومتی رہی۔ یہ باتیں ان کے کردار کے اہم ترین پہلوؤں کی نشاندہی کرتی

۱۔ مغربی محققوں کی محولہ بالا تصنیف میں (ماہین ص ص ۱۶۴ - ۱۶۵) اس موقع کی تصویر موجود ہے (گیارہویں تصویر)۔

ہیں۔ اس لیے میں نے کسی قدر درازنفسی سے کام لیا۔



اب آئیے اس مجموعۂ آثار پر پہلی نظر ڈالیں۔ اس مجموعے میں سب سے پرانی تحریر غالباً ۱۹ اکتوبر ۱۹۰۱ء کے ایک مشاعرے کی باسٹھ اشعار پر مشتمل غزل ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اتنے زیادہ اشعار موزوں کر لینے پر بھی جناب آزاد دہلوی کی طبیعت سیر نہیں ہوئی۔ آخری شعر کے بعد ان کے یہاں "وغیرہ وغیرہ" کی تکرار ہے۔ نثر کی سب سے پہلی تحریر اس مجموعے میں شاید ۲۸ مئی ۱۹۰۲ء کا مختصر سا رقعہ (ص ۴۷) ہے جس میں وقت موعودہ پر اپنے گھر پر موجود نہ ہونے کی پیشگی اطلاع دی ہے۔ مولانا کی بہت سی تحریروں پر تاریخ درج نہیں۔ لیکن قیاس یہ کہتا ہے کہ مندرجہ بالا تحریریں ہی اس مجموعے کی قدیم ترین تحریریں ہیں۔ اور ندوۃ العلما لکھنؤ سے لکھا ہوا ۴ مئی ۱۹۰۶ء کا خط اس سلسلے کی آخری کڑی ہے۔[1]

نانا ابا مرحوم و مغفور دو سال قبل یعنی ۱۹۰۴ء میں گلوکوما کے مرض میں مبتلا ہو چکے تھے۔ آنکھوں کی بصارت زائل ہونے لگی تھی۔ بالآخر ۱۹۰۹ء میں وہ حادثہ پیش آیا جس کا ذکر میں اوپر کر آیا ہوں یعنی ہونہار جوان بیٹے کی موت، جس نے بصارت سے یکسر محروم کر دیا۔ اغلب یہ ہے کہ یہ المیہ سلسلۂ مراسلت کے منقطع ہونے کا آخری سبب بنا۔ لیکن اتنا یقینی ہے کہ ۱۹۰۶ء تک پہنچتے ہوئے آزاد اور رنجور کی فکر کی راہیں جدا ہو چلی تھیں۔

حضرت رنجور عظیم آبادی آخر عمر تک عروسِ سخن کی مشاطگی میں مصروف رہے۔ انتہائے غم میں شعر و سخن کی محفلیں ان کے لیے دلچسپی کا سامان فراہم کرتی رہیں۔ اس کے برخلاف حضرت آزاد دہلوی غالباً ۱۹۰۴ء کے اوائل میں شعر گوئی ترک کر چکے تھے۔ ایک دلچسپ قطعہ اس مجموعۂ آثار میں شامل ہے، جس کے آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ "خاک بر سرم باد کہ امروز باز فکر شعر کردم، استغفر اللہ استغفر اللہ" (ص ۱۶۰) یوں تو آخر عمر میں نانا ابا بھی اپنی شعر گوئی پر نادم ہو گئے تھے اور اپنا کلام نذرِ آتش کروا دیا تھا۔ لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے۔ مرحوم کے ضخیم مجموعۂ کلام میں سے صرف چند بیاضیں بچی ہیں۔ ایک بیاض جس میں ایک سو بہتر رباعیاں ہیں اور ایک سو انچاس قطعاتِ تاریخ ہیں، یہ چھوٹے ماموں مولوی محمد حسان جعفری کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ اس میں بعض اضافے خالاؤں کے ہاتھ کے ہیں۔ یہ نانا مرحوم کی اجازت سے بچا لی گئی تھی۔ ماموں مرحوم کے بسلسلۂ ملازمت پٹنے سے باہر رہنے کی وجہ سے لکھنے پڑھنے کے کاموں میں مدد لینے کے لیے مختلف لوگوں کو نانا ابا مرحوم نے گھر پر رکھ لیا تھا۔ چند بیاضیں ان اصحاب کی کوشش سے محفوظ رہ گئیں۔ ان میں سے اول الذکر بیاض میں بعض قطعات تاریخ مولانا آزاد کے سوانح نگار کے مفید مطلب ہیں۔ تین ان کے بڑے بھائی مولانا ابو النصر آہ کی تاریخ وفات پر ہیں۔ ایک سے مولانا آزاد کی ادارت میں اخبار "دار السلطنت" کے اجرائے ثانی

۱۔ ملیح آبادی: آزاد کی کہانی۔ ص ص ۲۹۶۔ ۲۹۷۔

کی تاریخ نکلتی ہے۔ ایک اور سے ان کے رسالہ "لسان الصدق" کی اشاعت کی تاریخ نکلتی ہے۔ "احسن الاخبار" کا مولانا کی صحافتی اور فکری زندگی سے گہرا تعلق رہا ہے۔ اس کے دفتر کا نام مولانا نے دارالاخبار تجویز رکھا تھا۔ اس کا ذکر مولانا کے خطوں اور رقعوں میں بارہا آیا ہے۔ اس اخبار کے مالک و مدیر کے انتقال کی تاریخ پر دو قطعات ہیں۔ آخرالذکر بیاضوں میں سے ایک میں مولانا آزاد کی ایک پر حاصل غزل پر مولانا رنجور کی تضمین ہے۔

○

مولانا آزاد ۱۹۰۵ء میں مولانا شبلی کی رفاقت اور اس کے بعد اخبار "وکیل" امرتسر کی ادارت کے راستے سیاست سے وابستہ ہو چکے تھے اور اب "برکاتِ حکومتِ انگلیسیہ" بیان کرنے کے لیے "میر امّن کے طرز میں" کتاب لکھنے ص ۵۶ کے برخلاف زمرۂ احرار میں شامل ہو چکے تھے۔ اُدھر حضرت رنجور سرکاری فرائضِ منصبی کو سرانجام دینے میں ابشرطِ استواری منہمک تھے۔ آزاد و رنجور کی راہوں کے جدا ہونے کا یقیناً یہ سب سے اہم سبب تھا۔

○

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا یحییٰ علی رح شہید انڈمان کے فرزند کی رفاقت میں مولانا آزاد صادق پور کے بزرگوں کی تحریکِ جہاد سے بخوبی واقف ہو گئے تھے۔ ان کے تعارف کے ذریعہ وہ حضرت مولانا عبدالرحیم رح سے بھی مل چکے تھے۔ "تذکرۂ صادقہ" پر ان کی تقریظ کو حضرت مولانا نے اپنی کتاب میں شامل کر کے اس تعلق پر مہرِ تصدیق و تحسین ثبت کر دیا تھا۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد رسالہ "لسان الصدق" میں جناب آزاد نے اس پر ریویو بھی لکھا۔[۳] انگریز حکمرانوں نے صادق پور کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ اس کے سرکردہ بزرگوں کو کالے پانی بھیج دیا تھا۔ جو بچ گئے تھے اور جو اس وقت بچے تھے اور اب جوان ہو گئے تھے ان سب کو تالیفِ قلوب کے لیے شمس العلماء کے خطاب سے نوازا۔ لیکن مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَیْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰی نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِیْلًا۔[۴] کے مصداق صادق پور کے خاندان کی ایک شاخ یعنی مولانا ولایت علی رح اور مولانا عنایت علی رح کے چھوٹے بھائی مولانا

۱۔ ایضاً ص ص ۲۷۷، ۲۰۹، ۲۰۷۔ ۲۔ ایضاً ص ص ۲۲۵، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۷۶ ۔ ۳۔ قاضی عبدالودود: تذکرۂ صادقہ اور لسان صدق، رسالہ آجکل، منسٹری آف انفارمیشن، نئی دہلی جلد ۱۷، ۱۱ر جون ۱۹۵۹ء ص ۳۰۔ ۴۔ ترجمہ: اہلِ ایمان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انھوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا اس میں سچے اترے سو ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے اور کچھ ان میں کے راستہ دیکھ رہے ہیں اور انھوں نے ذرا فرق نہیں آنے دیا۔ سورۃ الاحزاب (۳۳) ۲۳

عبد اللہؒ کی اولاد مِنْهُم مَّنْ يَّنْتَظِرُ (انتظار کرنے والوں میں سے تھی۔ شمال مغربی سرحد کے علاقۂ آزاد میں اسمست اور چمرکند کے مقامات پر ان منتظرین نے مجاہدین کی چوکیاں قائم کر رکھی تھیں جنھیں پٹنہ سے مالی امداد اور ضروری ہدایات ملتی رہتی تھیں۔" تذکرۂ صادقہ" کے مصنف بدستور رہنمائی کر رہے تھے۔ انڈمان کی اسیری اس میں تبدیلی لا سکی تھی نہ لارڈ رپن کی از راہِ مرحمتِ خسروانہ معافی کی بخشش اور رہائی۔ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب محلہ صادق پور" ڈاکخانہ گلزار باغ" کی جگہ محلہ ننھمیہ" ڈاکخانہ گلزار باغ" مرکز تھا۔ حالات نے بے سروسامانی اور مادی سے کہیں زیادہ روحانی توشے کی کمیابی کو انتہائی حدود تک پہنچایا یا تھا۔ لیکن صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ اپنے پروردگار سے جو معاہدہ انھوں نے کیا تھا اس پر صادق ہونا ہی صادق پور کے بزرگوں کا شیوہ تھا۔ اور مولانا عبدالرحیمؒ ان ہی بزرگوں میں سے تھے۔ مولانا آزاد جیسے ذہین اور غیر معمولی حافظے کے مالک شخص پر مولانا عبدالرحیمؒ سے ملاقات کے نقوش کا مرتسم ہو جانا یقینی تھا۔

یہ نقوش ۱۹۲۱ء میں ابھرے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ نے ہَاجِرُوا ثُمَّ جَاهِدُوا (پہلے ہجرت کرو پھر جہاد) کی سنتِ نبوی پر عمل کرتے ہوئے برِّ عظیم کا طویل سفر ("لانگ مارچ") کر کے سرحدِ آزاد پر اپنے جہاد کے مرکز قائم کیے تھے۔ یہ طویل اور انتہائی پر خطر سفر مجاہدین کی تربیت کے لیے بہت ہی قیمتی ثابت ہوا اور اپنے مرکز کے لیے محلِ وقوع کے انتخاب میں سید شہیدؒ نے جس مجاہدانہ بالغ نظری کا ثبوت دیا تھا اس پر تاریخ شاہدِ عادل ہے۔ مولانا آزاد نے اس سے سبق سیکھا۔ ۱۹۲۰ء میں تحریکِ خلافت و ترکِ موالات میں انھوں نے بحیثیت امام الہند ہجرت کا فتویٰ جاری کر دیا۔[۱] ہندستان بالخصوص پنجاب اور سندھ سے مہاجروں کے قافلے در قافلے سرحدِ آزاد پر پہنچنے لگے۔ مجاہدوں کے مرکزوں نے ان ناخواندہ مہمانوں کا استقبال کیا اور آگے کے سفر کے لیے ان کی راہ ہموار کی۔ لیکن یہ مدد اور رہنمائی انھیں انتہائی مہنگی پڑی۔ ان کی تحریک سراسر انقلابی تھی۔ جب کہ مولانا آزاد کی تحریکِ ہجرت اور اس کی معاون تحریکیں سراسر احتجاجی تھیں۔ مجاہدین کی دعوت کی اولین شرط کتمانِ سر (رازداری) تھی اور اس تحریکِ ہجرت کا بنیادی طریقِ کار عوامی تھا اور اعلانی (میرے دادا ابا علیہ الرحمہ کے قول کے مطابق "اشتہاری") یہ دونوں تحریکیں اپنے مقصد میں متحد لیکن طریقِ کار میں ایک دوسرے کی ضد تھیں۔ مہاجروں کے قافلوں کے ساتھ حکومت کے مخبروں کی فوج ظفر موج نے دھاوا بول دیا۔ اس سے مجاہدوں

۱۔ مؤرخ محققوں کی محولہ بالا تصنیف (ص ۱۴۲ تا ۱۴۳) سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خود مولانا کے اپنے ذہن میں ہجرت کی یہ تحریک جہاد کے انقلابی اقدام کا پیش خیمہ تھی۔ لیکن ان ہی دنوں خلافت اور اس کے فوراً بعد ترکِ موالات کی احتجاجی تحریکوں نے زور پکڑ لیا۔ یوں مولانا کا اپنا انقلابی لائحہ عمل خوابِ پریشاں ہو کر رہ گیا۔ ہجرت کے فتوے کے بارے میں ان کی تحقیق یہ ہے کہ یہ ہفتہ وار "اہلِ حدیث" امرتسر میں شائع ہوا تھا۔ اس کے مدیر مولانا ثناء اللہ امرتسری کے صادق پور کے بزرگوں کے ساتھ روابط کی نوعیت پر الخلافۃ فی خیر الامۃ کے بعض اشاروں سے روشنی پڑتی ہے۔

کے کیمپ کو جو نقصان پہنچا اس کا اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں۔ مولانا عبدالرحیمؒ اس وقت تک بقید حیات تھے۔ وہ جلالی مزاج کے انسان تھے۔ انھوں نے اپنے بھانجے پر جس شدت سے اپنی خفگی کا اظہار کیا' اس کے قصے میں نے والد مرحوم اور بڑی خالہ مرحومہ کی زبانی سنے ہیں: مولانا آزاد کی اپنی زبانی اس خوفناک غلطی پر ندامت کا اظہار میں نے خود سنا ہے۔



حضرت مولانا عبدالرحیمؒ انڈمان سے جو سوغاتیں لائے تھے' ان میں رعشہ بھی تھا۔ اس لیے لکھنے کا کام بیشتر میرے والد مرحوم رضان صاحب مولوی سید عبداللہ افضلی[1] سرانجام دیتے تھے۔ لکھواتے وقت اکثر حضرت مولانا اپنے بین السطور ما فی الضمیر" جانتا ہے جو میں لکھوا رہا ہوں اس سے میرا کنایہ کس بات کی طرف ہے؟" کہ کر بیان کر دیتے تھے اور پھر خود ہی ہنستے اور محظوظ ہوتے تھے۔ میں نے والد مرحوم سے کہا" آپ نے وہ یادداشتیں کیوں نہ محفوظ کر لیں؟" وہ میری نادانی پر ناراض ہوئے اور کہنے لگے" کاغذ پر لکھنا الگ رہا۔ میں تو پوری کوشش کرتا تھا کہ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اسے نکال دوں" دادا ابا علیہ الرحمۃ حضرت مولاناؒ کے رازدار اور مشیر کار تھے۔ وہ اکثر کہتے تھے کہ حضور مجھے وہ ہرگز نہ بتائیے جس کا میں متحمل نہ ہو سکوں۔ مجھے امتحان میں نہ ڈالیے"۔ والد مرحوم کہتے تھے کہ میں تو کس گنتی شمار میں تھا! والد مرحوم کے نام سے مولانا عبدالرحیمؒ نے ایک کتاب شائع کی تھی: الخلافۃ فی خیر الامۃ رداً علی النبوۃ فی خیر الامۃ' یہ حاجی قمرالدین کے مطبع قیومی کانپور سے طبع ہو کر دسمبر ۱۹۱۷ء میں شائع ہوئی۔ متوسط تقطیع کی اٹھاسی صفحات کی اس کتاب پر بحیثیت مصنف میرے والد کا نام درج ہے اور" بفرمائش حضرت مولانا عبدالرحیم صادقپوری" کا ٹائٹل پیج پر اندراج اصل حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے۔ کتاب کے شروع اور آخر میں منشی قاسم علی احمدی ایڈیٹر الحق و رسالہ احمدی کے رسالے پر تنقید ہے اور" ابطال امامت قادیانی" پر اہل سنت کے مختلف مسلکوں کے مشہور علماء کے فتاوی ہیں۔ ان حفاظتی دیواروں کے درمیان حکومت الٰہیہ کے مسلک اس پر قرآن اور حدیث سے دلیلوں اور اس کے حصول کی تدبیروں کا قلعہ تعمیر کیا گیا ہے۔

۱۔ والد مرحوم اپنے آبائی گاؤں افضل پور (پٹنہ) کی نسبت سے افضلی لکھتے تھے۔ جب میں پیدا ہوا اور نانا ابا مرحوم کی گود میں دیا گیا تو انھوں نے مسرت کے ساتھ کئی بار کہا کہ جعفریوں کے گھر میں فاطمی"۔ نانا ابا مرحوم حضرت جعفر بن ابی طالب کی اولاد میں سے تھے' جب کہ دادا ابا علیہ الرحمۃ کا سلسلۂ نسب حضرت سید راجہ سے ہوتا ہوا حضرت علی بن ابی طالب حضرت فاطمہ علیہما السلام تک جاتا ہے۔ اس اظہار مسرت نے خانوادہ صادقپور کے نئے داماد کے دل پر اچھے نقوش چھوڑے۔ جب سرکاری امتحانات کے لیے میرا فارم بھرا جانے لگا تو اس واقعے کو یاد کرتے ہوئے انھوں نے نام کے آگے فاطمی لکھنے کی ہدایت کی یوں یہ نسبت عالیہ میرے نام کا جزو ہو گئی۔ اور خود والد افضلی رہے۔

حضرت مولانا عبدالرحیمؒ کے اس منشورِ مستور کا مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کے رسالہ "منصب امامت" سے تقابلی مطالعہ بہت مفید ہو سکتا ہے۔ خیر، اس تربیت کا نتیجہ تھا کہ والد مرحوم نے ترکِ موالات کیا۔ آئندہ انگریز کی نوکری نہ کرنے کا عہد کیا۔ پچھلی کمائی کی جمع پونجی پر گزر اوقات ہو رہی تھی کہ انھیں پے در پے صدمے اٹھانے پڑے۔ عبدالرحیم نانا، نانا ابا اور میری والدہ (حسنیٰ) کا یکے بعد دیگرے انتقال ہو گیا۔ میری والدہ تین چھوٹے چھوٹے بچوں کو اپنے پیچھے چھوڑ گئی تھیں جن میں میں سب سے بڑا تھا۔ اس سے بہت پہلے میری بڑی خالہ اماں (نجم النساء) جنھوں نے میری والدہ کی تربیت میں حصہ لیا تھا اور خود مجھے پالا پوسا تھا بیوہ ہو چکی تھیں۔ ان کے دو بچے (سید خلیل احمد اور سید انیس احمد) میرے والد اور والدہ ہی کی کفالت میں تھے۔ بزرگوں کا مشورہ یہ ہوا کہ نکاحِ بیوگان کی سنت جس کا احیاء حضرتِ سید شہید کی دعوت جہاد و اجتہاد کا ایک اہم مقصد تھا، لیکن وہ سنت اب پھر مردہ ہو چلی تھی، اسے زندہ کیا جائے۔ مگر یہ سارے بوجھ کیسے اٹھائے جائیں؟ پٹنہ میں رہ کر آزاد پیشہ اختیار کرنے کی راہیں مسدود نہیں تو محدود یقیناً تھیں۔ اس لیے والد مرحوم نے ترکِ موالات کے بعد اب ترکِ وطن کی راہ کا انتخاب کیا۔ اور اپنے دُہرے کنبے کو لے کر دہلی آ بسے۔ یہاں پنجابی سوداگروں کے محلّے میں اقامت گزیں ہوئے۔ سوداگر بچوں کو خط و کتابت کے لیے اردو اور انگریزی، بہی کھاتہ رجسٹر رکھنے کے لیے حساب کتاب، دینی تعلیم اور اخلاقی تربیت کے واسطے مدرسہ باسطیہ[1] کے نام سے اسکول کھول لیا۔ یہ خوب چل نکلا۔ ہم خرما و ہم ثواب۔ قومی تعلیم و تربیت کے مقاصد بھی پورے ہو رہے تھے اور خود اپنے بچوں کی تعلیم اپنے زیرِ نگرانی جاری تھی۔ آمدنی بھی اچھی تھی، ہم سب بہت خوش تھے۔ والد مرحوم کے قویٰ بہت اچھے تھے، صحت قابلِ رشک۔ لیکن ایک سال ایسا ہوا کہ میعادی بخار (تپ محرقہ) میں مبتلا ہو گئے۔ اسکول بیٹھ گیا۔ پردیس، چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ اور ذریعۂ آمدنی انتہائی مخدوش۔ آزاد پیشے کی پابندیاں اب سامنے آئیں۔ انگریز کی غلامی کے تحفظات یاد آئے۔ لیکن انگریز کی ملازمت اصول کی بنا پر ترک کی تھی وہ اصول تو غیر متزلزل تھے۔ اب کیا کیا جائے؟ والد تو صحت یاب ہو گئے۔ مدرسہ باسطیہ کو پھر سنبھال لیا۔ کام پھر چل نکلا۔ لیکن میعادی بخار اپنے پیچھے مستقل تذبذب چھوڑ گیا۔ کچھ عرصہ بعد اخباروں میں مولانا ابوالکلام آزاد کے دہلی تشریف لانے اور ڈاکٹر انصاری مرحوم کی کوٹھی واقع دریا گنج میں مقیم ہونے کی خبر پڑھی جس نے درد دیا تھا اسی سے دوا لینے والد مرحوم چل پڑے۔

احتیاطاً غروبِ آفتاب کے بعد کا وقت چُنا۔ مجھے ساتھ لیا۔ پرچی پر اپنے نام کے بعد "مع نبیرہ مولانا محمد یوسف

۱۔ اوپر صفحہ حاشیہ ایک نام مولانا کی تبدیلی کا ذکر آیا ہے۔ دادا ابا علیہ الرحمہ کا نام کفایت حسین تھا۔ لیکن خاندان صادقپور کے زیرِ اثر آنے کے بعد انھوں نے اپنا نام عبدالباسط رکھ لیا لیکن چلا نہیں۔ لائق فرزند نے مدرسہ باسطیہ نام رکھ کر اپنی دانست میں اس کے احیاء کی کوشش کی تھی۔

جعفری رنجور عظیم آبادی" لکھا۔ میرا سر فخر سے اونچا ہوگیا کہ والد اپنے آپ کو میرے ذریعہ پہنچوا رہے ہیں۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم کی بلند و بالا کوٹھی کی دریا کے رُخ کھلنے والی بالکنی میں دو آرام کرسیاں بچھی تھیں۔ میرے لیے مونڈھا ڈلوا دیا گیا۔ چاندنی رات تھی۔ دور جمنا کی لہروں پر چاند کی کرنیں محوِ رقص تھیں اور میں اس نظارے کے دیکھنے میں غرق تھا۔ والد مرحوم اور آزاد نانا میں بہت طویل گفتگو ہوئی جس میں ظاہر ہے ابوالکلام کا حصہ کہیں زیادہ تھا۔ ایک آدھ بار ایسا محسوس ہوا کہ ان کی آواز گلوگیر ہوگئی۔ میری طفلانہ حرکت تھی کہ میں نے اس اہم گفتگو کو غور سے نہیں سنا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ دیکھا کہ والد برسرکار ہوگئے، اور وہ بھی بالآخر اپنے خسر کے جانشیں یعنی چیف مولوی بورڈ آف ایگزامنرز بنا دیا گیا (یہ دفتر اب کلکتے سے مستقلاً شملے میں منتقل ہوگیا تھا) کام اس دیانت اور خلوص سے کیا کہ خاں صاحب کا خطاب حاصل کیا۔ عہدہ بڑھا دیا گیا۔ انھیں انڈین ممبر بورڈ آف ایگزامنرز بنا دیا گیا۔ (یہ عہدہ انھیں کے لیے بنایا گیا تھا)۔ اس طرح وہ منصباً انگریز سربراہ کے بہت قریب ہوگئے کہ وہ بورڈ کا ممبر سکریٹری تھا۔ گھر کی زندگی میں اس تبدیلی سے میں خوش نہ تھا۔ خدا مجھے معاف کرے، میں اکثر والد ماجد کے منہ آتا تھا۔ ایسے موقع پر ایک آدھ بار انھوں نے دریا گنج کی کوٹھی والی گفتگو کا حوالہ دیا۔ اس کی تفصیلات دہرائیں۔ جن سے میں نے نتیجہ یہ اخذ کیا کہ آزاد نانا اپنی احتجاجی ترکِ موالات کی تحریک پر سرسید، صادق پور، شمس العلماء مولانا محمد حسن ذبیح اور ان کے بھانجے خان بہادر شمس العلماء مولانا محمد یوسف جعفری رنجور کی انقلابی موالات کو فضیلت دینے لگے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ انگریز کی نوکری کرو، ڈٹ کر کرو لیکن ساتھ ہی انگریز کے باغیوں کی خلوصِ دل سے بھرپور مدد کرو۔ روپے پیسے سے، مفید مشوروں سے اور آزادی کی تحریک کو نقصان پہنچانے والی فرنگیانہ تدبیروں کا دفعیہ کرکے۔ اگر آخر الذکر میں ناکامی ہو تو مستعفی ہوجاؤ اور کوئی اور نوکری تلاش کرو۔ (میں یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ سر ولیم ہنٹر کی کتاب "اَور انڈین مسلمانز" میں اس طریقۂ کار کی بھرپور تفصیل اور مکمل تصویر موجود ہے۔) ہجرت کی تحریک کو انھوں نے اپنا عاجلانہ فیصلہ قرار دیا تھا اور اس پر سخت نادم تھے۔



احتجاجی ترکِ موالات اور انقلابی موالات کا یہ موازنہ آسانی سے ذہن نشین نہیں ہوتا۔ مجھے اس کے سمجھنے میں بڑی دقت ہوئی تھی۔ اس لیے میں نے والد مرحوم کی زندگی کا مختصر سا خاکہ پیش کر دیا کہ سمجھنے میں آسانی ہو۔ خود میں نے اسے اسی طرح سمجھا تھا۔ اس طویل جملہ معترضہ کے بعد آزاد و رنجور کی طرف آئیے۔ ۱۹۲۰ء میں بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تحریک ہجرت کی شکل میں دونوں کی راہیں مل گئی ہیں۔ لیکن در حقیقت دونوں ایک دوسرے سے بہت دور جا چکے تھے۔ آخر، ۷ رجون ۱۹۲۳ء کو حضرت رنجور اپنے اجداد سے جا ملے۔ اس کے ڈیڑھ ماہ کے اندر (بتاریخ ۲۲ رجولائی) ان

کے حقیقی ماموں حضرت مولانا عبدالرحیم نے بحنِ مومن سے رہائی پائی ۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔



زیرِ نظر مجموعے کے مشمولات کی تعداد اڈتریں ہے ۔ انھیں میں نے حتی الامکان تاریخ وار مرتب کر کے مضامین کے لحاظ سے سات حصوں میں منقسم کیا ہے ۔ پہلے حصے میں شعر و سخن سے متعلق منظوم اور نثری تحریریں ہیں ۔ دوسرا حصہ ان کے دینی عقائد سے متعلق خطوط کے لیے مختص ہے ۔ میں اوپر ذکر کر آیا ہوں کہ لڑکپن میں انھیں اپنی وہابیت اور عدمِ تقلید کے لیے کتنی مہنگی قیمت دینی پڑی تھی ۔ اس کی جھلکیاں دوسرے حصے کے خطوط میں دیکھی جا سکتی ہیں ۔ بالخصوص وہ طویل خط جس پر "پرائیویٹ" لکھا ہے، مولانا کے حزن و ابتلا کی دردناک دستاویز ہے ۔ (ص ۱۸-۲۱)

حضرت مولانا کی ذہنی تشکیل کے دو اہم ترین عنصر تھے : عدمِ تقلید اور رواداری ۔ ان عناصر کا ظہور ان کے نہ صرف مذہبی بلکہ سیاسی اور سماجی رجحانات میں بھی نمایاں تھا ۔ رواداری اور بے تعصبی کا سبق انھوں نے کچھ دیر سے سیکھا تھا ۔ روشِ آبائے انحراف کے نئے نئے جوش نے ان میں شروع زمانہ میں عصبیت پیدا کر دی تھی ۔ ۱۹۰۳ء میں "احسن الاخبار" میں ان کے مضمون بہ عنوان "اسلام اور محرم" کی اشاعت اس کی واضح مثال ہے ۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی راوی ہیں کہ خود مولانا کو یہ اعتراف تھا کہ انھوں نے یہ مضمون "چونکہ عین جذبات کی برانگیختگی میں لکھا تھا اس لیے اس میں شک نہیں کہ بحث و نظر کے ایک متحمل اور سادہ اسلوب کی جگہ تلخی اور شدتِ بیان پر مبنی تھا ۔" آگے چل کر محرم کے مروجہ رسوم کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس مضمون میں "لوگوں کو مخاطب کر کے ایک شدید لب و لہجہ میں اس پر زجر و توبیخ کی تھی !" لیکن غلطی کے اس احساس کے لیے انھیں کن مرحلوں سے گزرنا پڑا اس کا کچھ اندازہ دینی عقائد والے حصے کے نصفِ آخر کے خطوط سے لگایا جا سکتا ہے ۔ اس قضیے کو رفع دفع کرنے میں جناب کاظم شیرازی نے اہم خدمات سرانجام دی تھیں ۔ یہ فاضل بزرگ بورڈ آف ایگزامنرز، کلکتہ میں شعبۂ فارسی کے سربراہ اور نانا ابا مرحوم کے رفیقِ کار اور معترف و ممنون تھے ۔

صحافت کے حصے والے خطوط کا پسِ منظر میں نے اپنی بڑی خالہ مرحومہ (نجم النساء) جن کی شفقت کی گود میں میں پلا بڑھا ہوں، کی زبانی سنا ہے ۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ "لسان الصدق"[2] کے اجرا کے زمانے میں گھر میں کارخانہ سا لگ جاتا تھا جس کے دفتری کاموں میں منجھلے ماموں (بنیامین) مرحوم اور وہ خود بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں ۔ منجھلے ماموں کی اس ان تھک محنت کی ایک ادبی یادگار ان کے نام کا ایک رقعہ رہ گیا ہے جو اس مجموعے میں شامل ہے (ص ۶۳)

---

۱ - ملیح آبادی : آزاد کی کہانی، ص ۲۵۹-۲۶۰ ۔ ۲ - ایضاً ۲۷۹ - ۲۸۱

جناب منظور حسن کا ذکر ان خطوط میں اکثر آیا ہے، میرے بڑے خالو (ڈاکٹر سید منظور احمد) تھے۔ وہ کاکو ضلع گیا کے شمسی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ کامیاب معالج تھے۔ شمالی برما (یکو کو) میں خدمتِ خلق کرتے ہوئے اپنی جان دی۔ خدا انھیں غریقِ رحمت کرے۔

حصۂ تعلیم و تصنیف: فنِ شعر میں آزاد دہلوی نے رنجور عظیم آبادی کی شاگردی کا اثر بہت کم قبول کیا تھا۔ اور بجا طور پر انھوں نے اس کا ذکر کہیں نہیں کیا۔ (گرچہ ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری کو جن منظومات کے عکسی چربے میں نے فراہم کیے تھے ان میں سے بعض پر حضرت رنجور کی اصلاح کے آثار بہت واضح ہیں) خود حضرت رنجور کے لیے شاعری تفننِ طبع، اظہارِ قادر الکلامی اور اردو زبان و ادب کے غیر ملکی طالب علموں کے لیے اردو روزمرہ، محاورات اور کہاوتوں کے محلِ استعمال اور بیگماتی اردو کی توضیح اور مثالیں بہم پہنچانے کا ذریعہ تھی۔ حضرت رنجور عظیم آبادی کی انگریزی زبان و ادب پر بھی گرفت بہت مضبوط تھی۔ انگریزی زبان کے وہ ماہر نکتہ شناس تھے۔ اردو اور انگریزی کا تقابلی مطالعہ ان کے فرائضِ منصبی میں داخل تھا۔ بورڈ آف ایگزامنرز کے اردو کے درجۂ اعلیٰ کے نصاب کا انھوں نے انگریزی زبان میں ترجمہ شائع کیا تھا جو انگریز افسروں میں بہت مقبول ہوا۔ مولانا آزاد نے انگریزی انھیں سے سیکھی تھی۔ جس کا ذکر پروفیسر ہمایوں کبیر نے "انڈیا ونس فریڈم" میں کیا ہے[1]۔ اس شاگردی کا سراغ ر جولائی ۱۹۰۲ء کے لکھے ہوئے خط سے بھی ملتا ہے (ص ۵۱) اس کے ایک سال بعد کے خط میں انھوں نے اپنا صبح پانچ بجے سے شام کے ساڑھے سات بجے تک کا پروگرام درج کیا ہے۔ جسے انھوں نے ترتیب وار لکھ کر اپنی میز کے سامنے آویزاں کر رکھا تھا۔ اس میں انگریزی کے اسباق کا ذکر نہیں ہے (ص ۵۲) جس کا مطلب یہ ہے کہ آزاد و رنجور کے درمیان انگریزی کی تعلیم و تعلم کا سلسلہ صرف ایک دو سال تک چلا۔

اس پروگرام میں ایک اور لائقِ توجہ بات یہ ہے کہ مولانا نے روزانہ شام کے چار بجے سے پانچ بجے تک کا ایک گھنٹہ خطوط نویسی کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ خطوط نویسی سے ان کے شغف کا اندازہ اس امر سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ زیرِ نظر مجموعے کے اکثر خطوط اور رقعات کلکتے کے ایک محلے سے دوسرے محلے تک بھیجے گئے ہیں۔ میں اوپر مولانا کی تنہائی کا ذکر کر چکا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے خطوط کا سہارا لیا تھا۔ (شام کے چار بجے سے پانچ بجے تک کے وقت کا انتخاب بھی قابلِ غور ہے)۔ لیکن اسی خطوط نویسی کے لیے ایک گھنٹے کی مشق نے اردو ادب کو "غبارِ خاطر" (اس ترکیب پر بھی غور کیجیے) جیسا قیمتی ادب پارہ دیا۔

۱۔ ہمایوں کبیر: انڈیا ونس فریڈم اورینٹ لانگ مینز بمبئی ۱۹۵۹ء ص ۳

زیر بحث چوتھے حصّے کے آخری خط کی پشت پر مولانا عبدالرزاق مصنّف "البرامکہ" کے نام خط کا پہلا صفحہ ہے (ص ۵۵) اگلا حصہ موجود نہیں۔ شاید یہ ان کے نام کے خط کا مسوّدہ تھا بیتفرہ انھیں بھیج دیا گیا اور مسودہ حضرت رنجور کے علم میں لایا گیا!

مولانا آزاد کو اپنی اولوالعزمی اور آزادہ روی کی بڑی مہنگی قیمت ادا کرنی پڑی جس کا ذکر میں دینی عقائد کے سلسلے میں کر چکا ہوں۔ اس کے سبب مالی لحاظ سے انھیں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان کا اندازہ ان خطوط سے کیا جا سکتا ہے جو پانچویں حصّے ("مالی معاملات") میں شامل ہیں۔

چھٹے حصّے ("قلبی روابط") میں میرے نزدیک اس خزانے کے سب سے بیش بہا جواہر پارے ہیں۔ آزاد نانا بے اندازہ محبت کرنے والے اور انتہائی رقیق القلب انسان تھے۔ ان میں اثر اندازی اور اثر پذیری دونوں کی بے پناہ صلاحیتیں تھیں۔ اثر پذیری اور حساس طبعی کے آثار چھٹے حصّے کے خطوط میں خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہیں۔ ان میں سے دو میں آرہ کے سانحے کا ذکر ہے۔ یہ اشارہ ہے حضرت مولانا ابراہیم آروی کے انتقال کی طرف۔ میری والدہ ماجدہ کے رشتے کے نانا تھے۔ آزاد سوگوار خاندان سے تعزیت کے لیے کلکتے سے سفر کر کے پٹنہ پہنچے تھے۔ غالباً حضرت مولانا عبدالرحیم سے ان کی ملاقات اسی موقع پر ہوئی۔ جناب رنجور نے جب بوقت رخصت ان کے آنے پر اظہار تشکر کیا تو اس کے جواب میں جس والہانہ انداز میں انھوں نے اپنے ردِّعمل کا اظہار اس حصّے کے تیسرے خط (ص ۶۵) میں کیا ہے، وہ ان کی عالی ظرفی کی روشن مثال ہے (مولانا ابراہیم آروی کی تاریخ وفات کے قطعات کلام رنجور کی مذکورہ بالا بیاض میں درج ہیں)۔

ساتویں حصّے ("متفرقات") میں بیشتر خطوط طرفین کی فرمائشات پر مشتمل ہیں۔ مولانا آزاد "کرمہائے تو مارا کرد گستاخ" کی لطافتوں سے بخوبی آشنا تھے۔ خود میں ان کے ساتھ بہت گستاخ تھا اس لیے کہ وہ گستاخی پسند کرتے تھے۔ اس شوخی کی پُرلطف جھلکیاں دیور بھاوج کی آپس کی نوک جھونک کی شکل میں نظر آتی ہیں جو اس حصّے کے چند خطوط میں موجود ہیں۔

اس حصّے کے دو خطوں میں "بانکی پور لائبریری" (خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری) کی فہرست کے لیے اضطراب کا اظہار ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے عنفوانِ شباب ہی سے انھیں اس عظیم و پُرثروت خزینۂ علم سے تعلق خاطر تھا۔ وہ اپنے ۱۵ مئی ۱۹۰۳ء کے خط (ص ۷۹) میں لکھتے ہیں:

"بانکی پور لائبریری کے [کی] فہرست کی تلاش ضروری ہے۔ اسکی مجھے سخت ضرورت ہے۔ اگر نقل ہو سکے تو نقل ہی کرالیجیے۔ اجرت دے دی جائے گی۔"

تقریباً ایک مہینے بعد ۱۸ جون کے پوسٹ کارڈ (ص ۸۰) میں یاد دہانی کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بانکی پور لائبریری کی فہرست کا خیال ہے۔ اصل ہے تو بہتر ہے ورنہ نقل کرا کے (مطموس) بھیجے گا۔ مجھے اسکی بحث فروری ہو۔"
حق بحقدار رسید۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے آثار کے اس خزانے کو شائع کرنے کا حقدار یہی ادارہ تھا۔ بحمد اللہ اسے اس کا موقع ملا۔ اس کے لیے اس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار مستحق تبریک و تحسین ہیں۔ انھوں نے ان خطوط کو پڑھنے میں جس ژرف نگاہی کا ثبوت دیا ہے اس سے ان کی مہارتِ فن کا پتہ چلتا ہے۔ اس مخطوطے کے پڑھنے والے کی راہ میں جو مشکل مقامات آتے ہیں ان کا ذکر خود ان کی زبانی سنیے گا۔ اس کی ایک ادنیٰ مثال سطور مندرجہ بالا میں ہے کہ مولانا ۱۹۰۲ء تک یائے معروف و یائے مجہول میں تمیز نہیں کرتے تھے لیکن دلچسپ اور معنی خیز بات یہ ہے کہ ایک سال بعد ۲۵ جون (۱۹۰۳ء) کے مکتوب میں "منشی صاحب" کے یائے معروف کو مجہول لکھنے پر تنبیہ کرتے دکھائی دیتے ہیں (ص ۴۴)۔ نہ صرف املا بلکہ طرز انشا کے نشیب و فراز (بلکہ نشیب سے فراز) نے اس مخطوطے کو پڑھنے کی مشکلات بڑھا دی ہیں۔ ان سب پر طرّہ یہ کہ امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں کاغذ جا بجا ٹوٹ گیا ہے جس کی ایک مثال پھر مندرجہ بالا سطروں میں ہے کہ ایک جگہ مجھے "مطموس" لکھنا پڑا۔ ان مشکل مقامات سے گزر کر قوم کی امانت انھوں نے جس حسن و خوبی و جان کاہی سے قوم کو پیش کی ہے اس کے لیے ان کا جس قدر شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ وہ اس پر تعلیقات کے اضافے کا بھی ارادہ رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس معاملے میں بھی حق احسان ادا کریں گے۔

خدا بخش پبلک لائبریری کے مہمان خانے کے قیام کے دوران میں انھوں نے، بیگم بیدار نے اور عزیزی شائستہ بیدار نے جس محبت، خلوص اور گرمجوشی سے مجھ غریب الدیار کی (جو اپنے ہی شہر میں اجنبی ہو گیا ہے) مہمان نوازی کی اس کے اظہارِ تشکر کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ صرف اتنا عرض کروں گا کہ :

جزاکم اللہ احسن الجزاء

آخر میں عزیزم محمد سحبان جعفری کے لیے دل کی گہرائی سے تشکر کے جذبات کا اظہار کرنے پر مجبور ہوں۔ یہ کہہ کر اس خوشگوار فریضے کو ٹال نہیں سکتا کہ یہ تو گھر کا معاملہ ہے۔ انھوں نے جس طرح اس خزانے کی حفاظت کی اور جس فراخدلی سے اسے میرے حوالے کر دیا اس کے لیے خدا ان کو جزائے خیر دے۔ سحبان اس وقت اچھے بینکر ہیں۔ امانت کے تقاضوں سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ انشاء اللہ وہ اور ترقی کریں گے اس لیے کہ وہ "القوی الامین" ہیں۔

سید قدرت اللہ فاطمی
۵۰۷، سٹریٹ نمبر ۴۳
سیکٹر جی ۹/۱ اسلام آباد (پاکستان)

آثارِ آزادؔ

حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ

کے

اوائل عمر کی چند تحریریں

مرتبہ

حمید احمد خاں سید رسول واحد

ترتیب



شعرِ و سخن

ر

بهاریه

[illegible] برای مشاهده تاریخ و ادبیات [illegible] ۱۹۱۰ [illegible] در ترجمه شعر [illegible] اخلاق [illegible]
[illegible] و [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] آزاد و [illegible]

بر مصرع طرح

[illegible] بهار بینی

۱

۱۴ [illegible] [illegible] زار بینی — ایک [illegible] اختیار بینی
۳ [illegible] [illegible] برقرار بینی — [illegible] [illegible] [illegible] بار بینی
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] بینی — [illegible] [illegible] هزار بینی
۴ [illegible] [illegible] اقرار یار بینی — [illegible] [illegible] [illegible] بینی
[illegible] [illegible] [illegible] یار بینی — [illegible] [illegible] [illegible] بهار بینی
۵ [illegible] [illegible] [illegible] دیدار یار بینی — [illegible] [illegible] [illegible] بار بینی
۳ [illegible] [illegible] [illegible] زار بینی — [illegible] [illegible] [illegible] زار بینی
۳ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] — [illegible] [illegible] هزار بینی
۴ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] — [illegible] [illegible] [illegible] زار بینی
۳ آتشکده [illegible] [illegible] — [illegible] [illegible] [illegible] بهار بینی
۳ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] — [illegible] [illegible] [illegible] بینی
۴ دو [illegible] [illegible] [illegible] — [illegible] [illegible] [illegible] بینی
۴ یوسف [illegible] [illegible] برادران — [illegible] [illegible] [illegible] بینی
۴ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] — [illegible] [illegible] اختیار بینی

ر

۳ [illegible] نہیں [illegible] ‏ — ‏ [illegible] کسی کے [illegible] تکرار میں

وہ دیکھ [illegible] ‏ — ‏ جلوہ [illegible] گلزار میں

[illegible] ‏ — ‏ بلبل [illegible] بہار میں

۲ ایسے [illegible] ‏ — ‏ نامہ [illegible] غبار میں

۳ [illegible] ‏ — ‏ [illegible] شکسار میں

۳ [illegible] ‏ — ‏ [illegible] انتظار میں

۳ ۳ [illegible] ‏ — ‏ [illegible] میں

۳ اے موت!! [illegible] ‏ — ‏ [illegible] انتظار میں

۲ [illegible] ‏ — ‏ [illegible] انتظار [illegible] میں

۳ [illegible] عاشق [illegible] ‏ — ‏ [illegible] میں

۲ خون جگر [illegible] ‏ — ‏ [illegible] سوار میں

۳ موقوف [illegible] ‏ — ‏ [illegible] میں

۳ ۳ [illegible] ‏ — ‏ [illegible] میں

۳ [illegible] زلف [illegible] ‏ — ‏ [illegible] میں

۰ [illegible] ‏ — ‏ [illegible] یار میں

۲ [illegible] ‏ — ‏ [illegible] میں

۲ وہ [illegible] ‏ — ‏ [illegible] میں

غزل

[illegible]

٤ بیٹھے ہیں آج آپ تو پہلو میں غیر کے — ہم ہیں کہ [illegible] آتش [illegible] رہیں

٢ [illegible] نگاہ و [illegible] — اپنی زلف و رخ [illegible] رہیں

٢ [illegible] — [illegible] چشم [illegible]

٤ [illegible] — جب [illegible] رہیں

٣ [illegible] + — [illegible] لطف [illegible] رہیں

سب [illegible] شب [illegible] — دو چار [illegible] رہیں

٣ [illegible] — [illegible] رہیں

٣ [illegible] — [illegible] قرار رہیں

٢ [illegible] — [illegible] رہیں

[illegible] — [illegible] رہیں

٣ [illegible] کشمکش — [illegible] رہیں

٣ [illegible] — [illegible] رہیں

[illegible] — [illegible] رہیں

٣ [illegible] — [illegible] رہیں

٣ [illegible] — [illegible] فصل بہار رہیں

٣ [illegible] — [illegible] اختیار رہیں

[illegible]

۲ [illegible] عاشق پہ [illegible] | [illegible] شان [illegible] آپ [illegible]

۴ ۲ [illegible] | [illegible] آپ [illegible] اختیار [illegible]

۲ [illegible] | [illegible]

۲ [illegible] | [illegible]

۲ [illegible] دیدہ بیدار کرد [illegible] | [illegible]

۲ [illegible] | [illegible]

۲ [illegible] | [illegible] روز [illegible] ۶

۲ [illegible] رقیب [illegible] | [illegible]

۲ [illegible] | [illegible]

۲ [illegible] | [illegible] گرد و غبار [illegible]

۲ ۴ [illegible] اختیار [illegible] | [illegible] اختیار [illegible]

۲ [illegible] | [illegible]

۲ [illegible] | [illegible]

۲ ۲ [illegible] | [illegible]

[illegible]

۲ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]

[illegible]

[illegible]

باب [illegible]

غزل : بہ [illegible] [illegible] ہیں

[illegible]

[illegible] دیکھتے ہیں

[illegible]

[illegible] دیکھتے ہیں

[illegible]

[illegible] دیکھتے ہیں

[illegible]

[illegible] دیکھتے ہیں

[illegible]

[illegible] دیکھتے ہیں

[illegible]

[illegible] دیکھتے ہیں

[illegible]

محبت

برای کلیه نشین راه و آیت خرد

صبحی سپید ساحلی از گرد راه

به خون اسبهای آزاد و عقاب دیوار

آه آه آه ... از ...



[illegible]

۱ ای صبا [illegible]	[illegible]
۲ ابر [illegible]	[illegible]
۳ [illegible]	این وقت [illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible] از [illegible]
[illegible]	[illegible] {?}
در گلستان [illegible]	برابر [illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible] ساقی!	[illegible]!
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]

[illegible]

پیارے

یہ کیسی [illegible] حضرت [illegible] !!

[illegible] - [illegible] - [illegible]

[illegible] - [illegible] -

[illegible] - حضرت [illegible] جواب [illegible]

[illegible] -

[illegible] - [illegible] -

[illegible] -

[illegible]

[illegible] حضرت [illegible]

[illegible]

[illegible] - [illegible] -

[illegible] -

[illegible] -

[illegible] - [illegible]

[illegible] - [illegible] -

"[illegible]" [illegible]

[illegible] - [illegible] -

[illegible] - کیا قابل [illegible] ؟

[illegible] .

[illegible]

[illegible]

[illegible]

برادر شفیق [illegible] مطلب ہے

کہ اور آزاد کی رنگین طبیعت [illegible] شعر [illegible]

[illegible] اور اعتبار دونوں [illegible]

[illegible] خود جس زمین

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

محمد حسین آزاد

بسمہ

صدیق مکرم [illegible]

[illegible] [illegible]

[[illegible]]

[illegible] !!

[illegible]

[illegible]

[illegible] حسینیت کی شان ہے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ! [illegible] .

[illegible]

[illegible] اللہ [illegible] اللہ [illegible]

[illegible] ..

[illegible]
ابوالکلام آزاد [illegible]

[illegible]

[illegible] ! آپکا [illegible] ۔ آج [illegible] ۔ [illegible]
[illegible] ۔
[illegible] ۔
[illegible] ۔
[illegible] ۔
[illegible] اور [illegible] ۔

آپکا خادم
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

بھائی

[illegible]

سلام اخوند

تو تعریف رباعی

[illegible]

قطعہ

[illegible]

— • —

چہرہ [illegible]

[illegible]

— • —

[illegible]

— • —

[illegible]

بسمہ

مکرمی [illegible] آپ کا [illegible] رنج [illegible] ۔

آپ کی تحریر میں زحمت ہوا اور مکان [illegible] تو دیکھا [illegible]
[illegible] تکلیف میں اور آب و ہوا [illegible]
[illegible] انتظار [illegible]
[illegible] حرارت [illegible]
[illegible] خانہ خدا کی زیارت اور مسجد میں [illegible]
[illegible] خفیف بخار [illegible]
[illegible] صحبت [illegible]
[illegible]
میں آپ کا [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] راز و نیاز ۔ [illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

۴۸

قطعہ فی البدیہہ

پیر شیخ انجور !

گرچہ ہے وعدہ خلافی مری ثابت تم پر
اور وعدہ مرا پورا کبھی ہوتا ہی نہیں !

پر جو وعدہ بھی ہو پورا تو یہ نکتہ ہے عمیق
کہ کبھی وقت معین پہ میں آتا ہی نہیں !!

یعنی فی الجملہ نتیجہ یہ لگا لو تم نے !!
میں گیا وقت ہوں ! جاتا ہوں تو آتا ہی نہیں !

"وقت" کہتے ہو مجھے ! سچ ہے ! اگر یہ تو کہو !
پہلے تو وقت معین کبھی ہوتا ہی نہیں !

اور میسر ہو ! تو پھر قدر کرو قدر کرو !
کہ جو جاتا ہے تو پھر حشر تلک آتا ہی نہیں !

میں تو ہوں "وقت" ملو گر تو غنیمت سمجھو !
میں بھی سمجھا ہوں نہیں وقت کہ ملتا ہی نہیں !

آؤں گا آٹھ بجے ٹھیک میں انشاء اللہ !

پھر نہ کہنا مجھے (انجور !) کہ آتا ہی نہیں

[illegible]

خاک برسرم یاد کر امروز باز مذبذب شو گردی استغفراللہ ۱۹ استغفراللہ !

دینی عقائد

باہر

[اس وقت اودے کی کاغذ توجہ سے پڑھتی ہیں بے تکلف کاغذ پڑھتا ہے اتنا ہونے سے وہ نہ ہیں ہیں دستانچہ ہنستی ہے ۔ ہوں]

[پرائیوٹ]

بے چارہ کو ہر ایک سے جیب خواہ ہو ؟ ؟

اب ہائے نہ بولو ! اگر میں ایک ادھیکاری ہوں تو نالہ بجا ہے ! کہ آپ اپنی بھگتی سے دوبارہ حاجت شکایت کی دور تشریف لے جائیں اور بہ نسبت آزاد ، نا ہوتی آزاد ۔۔۔۔ آزاد ، خوشی ہو ہر گز سوالات نہ کرے ! ہم تو میں خواب غفلت میں پڑا ہوں ہر گز ۔۔۔ خوشی قسمتی کی طرح آپ تشریف لے گئے ہمیشہ ۔۔۔ ۔۔۔ کہ مجھ ادھر میں شبیہ تشفی ہو خواب ہر نکتہ سے ہمیشہ روشن کیا (ورق پلٹ کر دیکھا) اور آپ تشریف لے گئے ۔ آج آپ ہر جگہ پہنچ کر دیکھ رہے ہیں ہر جگہ آباد ہو گئے ہیں ۔ فرزندگی کی آنکھ ہو رہی ۔ اور تو کیسے ہم ہر گز آپ تشریف لے گئے ہیں بہت عجیب بات ! ! الالف ! الالف ! بر تکلیف ہے ۔۔۔ کہ آپ ہمیشہ ایک خود دار نہ ہو ہوتی اور فرمائیں گے ۔ اور روح انور زخمی ہے جیسے آپ ہمیشہ ہر ایک نا لائقوں کو دنیا کر رہے ہیں اور فخر ہے جیسے آپ ہمیشہ ہر ایک نالائقوں کو معاف کیا کرتے ہیں ۔ یقیناً ہر ایک اور معاف فرمائیں گے ۔ فی العلم رحمت کمال الناس ۔۔۔

اگرچہ آپ نے ایک لفظ بھی نہیں سنا ۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ حساب صاف ہو گیا ۔ آپ خود فرمائیں گے کہ ہر ایک سا ۔۔۔ ہمیشہ ہر بات ہے اور نیستی سمجھ کر میں ہر ایک کام کرتا ہوں ۔ بے چارہ کو ہر ایک سے جیب خواہ ۔۔۔ ۔

ح ۔ بابا صاحب کو بڑا شوق ہوتا تھا کہ خاندانی آپنے اور اپنے خاندان کی روایت سے مجھ کو
آگاہ کریں ۔ مگر میں اس شوق سے ان کی بہت کم بات سنتا ہوں ۔ [illegible] اب اور سے محفوظ نہیں ۔
میں یہ بھی اگر [illegible] (آزاد) نسبت بہ [illegible] نامور [illegible] کہ اب [illegible]
بہ مذہب [illegible] ([illegible] قریب [illegible]) [illegible] بزرگ تر از خاندان [illegible]
[illegible] جیسا والد [illegible] ابا قریب [illegible]) [illegible]
[illegible] خاندان [illegible] وغیرہ وغیرہ
[illegible] اس [illegible] بزرگ [illegible] وہ [illegible]
[illegible] میں [illegible] [illegible] میں [illegible] [illegible]
[illegible] میں [illegible] [illegible] اور [illegible] ہے ۔ [illegible]
[illegible] میں [illegible] ([illegible]) ۔
[illegible] [illegible] ۔ [illegible] اور [illegible] اور [illegible] اور [illegible]
اور [illegible] بابا صاحب [illegible] والد صاحب قبلہ [illegible]
اور [illegible] ہے ۔ [illegible]
[illegible] نہ [illegible] میں بابا صاحب [illegible]
[illegible] اور [illegible] [illegible]
[illegible] مگر میں [illegible] ادب [illegible] ۔ [illegible] اور [illegible]

اونکا پڑھ گئی بہت ارادہ ہے میں نے تہیہ کیا ہے لوگوں کی صحبت سے احتراز کیا ہے۔
مطلق ہے کسی سے ملنے کی سے ملاقات ہوتی اور اگر ہو اونکی حالت معلوم ہوئی تو متنفر ہو گیا
ہر حالت اور ہر گروہ سے جو اشرف ہے وہ خوب جانتا ہے کہ جب پر جو انکے کہ
جو کچھ ہے والا ہے پڑھ لیا اب کسی کی صحبت سے ان کی نگہ بینی چرچہ لگتا ہے کہ کسی کتاب کی
لیا ہی ہوا اٹھ والا اوسکو خیالات کا جو اثر ہیں پڑتا ۔ شاید کتاب اور
درب ہیں غور جو اصول ہر انسانی تہذیب پاس ہیں اور اخلاق کی اوس میں بہت
سے لوگوں سے پیدا ہوئی ۔ مگر جب اون اصول کی کل حکمت معلوم ہو گئی ہے تو پھر میں
کیوں ایسا ادیب ہو کر اون کا ارادہ کی وہ جو دولت انکی ملتی ہو ہی ہیں ۔

افسوس کہ کتاب و خیالات تو بڑے عمیق ایسے ہیں اور اب اونہیں پورا ہو رہا ہے
اب آپ بتلائیں کہ میں اب مرقع پر کیا کروں ؟ جن کتابوں اور لوگوں سے میں پیدا ہوا
وہ ہر انسانی کا اوپر ترقی کی جیسے تھے ہیں اب اونہ پیدا کرنے کو ترک کروں ؟
[illegible] میں چار دن سے اسی فکر میں پریشان ہوں کہ اب کچھ کیا کام چاہئے جس
سے روز کی ترقی ہو ترقی نئی بنتی ہو ۔ میں نے اب یہ ارادہ کیا ہے کہ میں زیادہ
باہر آنا جانا جو ان حضرات (یا علماء اور صوفی) کے نزدیک گناہ معلوم ہوتا ہے ترک
کر دوں اور ان لوگوں سے اونکی ترقی کے لئے مجبور کروں کہ ہر ایک مسجد کی اور کسی نئی چیز
اوسکو پیش آوے جاوے ۔ شاید یہ ارادہ ایک خیالات کا ہو ہو جو چھپتے اور پھیلے

[illegible] کے اطمینان کا نتیجہ ہے۔ زیادہ ذکر سے کیوں نہ کہوں اور اگر کیوں کی
[illegible] بعد العصر [illegible] کی نشست یہاں ہر روز ہوا کرتی ہے۔ اب آپ فرمائیے
کہ آپ کی کیا رائے ہے؟ اگر آپ کا ارادہ ہو [illegible] مناسب سمجھا تو میں ایسا پروگرام [illegible]
جس [illegible] اب [illegible] آپ [illegible] ہے۔ اور پھر آپ کی بات پر اعتبار
اور کسی پر نہیں ہے۔ [illegible] اسلیے۔ اب [illegible] کوئی صورت
[illegible] ۔ نہ ایسی صورت پر [illegible] ممکن [illegible] اگرچہ میں اس پر عمل
کروں۔ میں آپ کو کوئی صورت نہیں [illegible] ذاتی مناسبت تو
ایسی کسی کو اختیار نہیں ہے۔ [illegible]
مگر مناسبت پر کوئی وقت نہیں رکھتا۔

خلاصہ [illegible] ۔ کاغذ بہت قریب اختتام ہے۔ کل [illegible] وقت
تشریف [illegible] میں منتظر رہوں گا آپ [illegible] ۔ میں [illegible]
مگر اس تحریر کا جواب تحریر میں دیجئے۔ [illegible]
[illegible] نہیں [illegible] ۔

باقی [illegible]

ابوالکلام آزاد [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] پیدا تھی

اور دیکھو [illegible] پیدا ہے؟

برادر مکرم و دوست! تسلیم

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] محبت [illegible]

[illegible] محبت [illegible]

[illegible] محبت [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] فلسفہ جدید [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ... اور [illegible] ... جیسے منطقی ہیں! [illegible]!
[illegible] ... جواب [illegible]
اور [illegible] ... حیات [illegible] ... !!!
[illegible] ... مجبور [illegible]
[illegible] ... [illegible]
[illegible] ... اعلان [illegible] —
[illegible] ... [illegible]

—— [illegible] حیات [illegible]

۴- اور اب میں آپ کو اپنے افراد سے زیادہ مخلص سمجھتا ہوں —

—•—

[illegible] ... [illegible]
[illegible] ... [illegible] —
[illegible] ... [illegible] ہے —

[illegible] ... [illegible] —
[illegible] ... حالت [illegible] —

جناب [illegible] ... حضرت [illegible] صاحب کو سلام [illegible] — حضرت کو خدا تعالیٰ
خیریت کا منتظر ہوں —

آپ کا خادم
ابو الاعلیٰ مودودی

میں آج شب اپنے آفس میں ہونگا - رات کا ایک بجا ہے

بھائی رنجور ! میں منزلے سے بھی بہت زیادہ تمہیں نسبت رنج ہو گیا

مگر میں یہ بہت زیادہ اس کی وجہ سے خوش ہوں :

" الہلال اور زمیندار نے شہیدوں میں ایک سخت جوش پیدا کر دیا ہے -

الحمد للہ یہ ضروری کام تھا اور اسی کا یہ سب نتیجہ ہے - اگرچہ سارے

مضمون میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس میں شکایت یا ذاتیت

کا مضمون ہو لیکن صاف صاف اور سچے لفظوں نے ایک حالات جوش

پیدا کر دیا ہے - جی کہتا ہے کہ فوجداری میں تک مذہب

کی آزادی لگی رہی کہتا ہے کہ مفتی السلطنت کے ذریعہ سے کوشش کرنی ہوگی

مگر یہ ایران نہیں ہے بلکہ انڈیا ہے جس پر برٹش پہرہ اور راج ہے

جب تک قانونی گرفت نہیں آ سکتی ہو سکتا ہے سلف کی کتابیں اس

مسئلہ میں لفظوں سے بھری پڑی ہیں مگر اس پر کوئی اعتراض نہیں پڑ سکتا

نہیں کرتے کہ مذہبی پیرایہ میں زمیندار نے جو دلیل دی ہے وہ بجا بل

غضب و غصہ بعض حضرات اس امر پر ناراض ہیں کہ ذاتیات پیش

زیر نظر ہیں مجھے اس بات کا یقین ہے کہ غیر نے جو کچھ لکھا ہے حق لکھا ہے

اور بالکل مذہب اسلام کی تائید اور تبلیغ حق تعلیم اسلام کے اعتراض

کر دفعتہً کیفیت — [illegible] اور جب مجھے میرا تماشا نظر آتا ہے کہ میں زار

مر گیا کہ ہم محض احمقانہ حرکت [illegible] اوراق باطل کئے تو مجھے کچھ ڈر ہوتا

چاہئے کہ گو گھر [illegible] جیسے دنیا کے مشہور رنگیلا [illegible] کی [illegible]

پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

مگر افسوس ہے اور [illegible] سخت افسوس ہے اور اب افسوس ہے کہ میں اپنی جبلت

یعنی [illegible] کے ساتھ ایک [illegible] ہوں جو اپنی قسم

کی اصلاح [illegible] مصلحت اور تقیہ کو حق سمجھتے ہیں

[illegible] عورتوں نے [illegible] میں

[illegible] اور ملامت کی [illegible] خودکشی [illegible]

[illegible] شیدا کردیا ہے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] مصلحت [illegible]

[illegible] میں نے مصلحت کو تقیہ سمجھا ہوا ہے اور ادھر [illegible]

میں اپنے خاندان سے پوری نفرت کرنے کے باوجود بہت ضبط کرنے کی کوشش کر رہا ہوں مجبور ہوں تو اور ان
کو آزاد کیوں نہ کروں ؟ بھائی ایسی مصلحت مجھے نہایت تنگ ہو گئی گو دارالعلوم کا ... سمجھوں کیوں تو
ہمارے خاندان کی حالت پیش نظر ہے اور اب مذہب کا بہت ... اور حق کو ...
کا غیر موجود ہیں اور اس لئے بھی مجھے اب نہیں ہو سکتا سوائے ان لفظوں کو ...
نہیں سمجھے گا واللہ میں نہیں ... مذہب اسلام اور توحید کی سچی محبت
پیدا ہو گیا ہے - میں تم سے ... ہمیشہ ... اور اب اختیار ...
بار بار افسوس آتا ہے کہ اگر ... آزاد ہوتا اور ... اور عقائد ...
ہوتا تو مجھے کچھ افسوس نہ ہوتا ۔ اور میں اپنے عقائد کو ... اسلام کی نہایت
... اور ... قبول کرتا اور ...
اور ... اور ... دعا ... اور ...

چنانچہ [illegible] روپیہ وجہ سے اسکی اکثر خیال موافق نہ ہوتی ہوگی حالانکہ میں تو ایسے حالت فرض کئے ہوں

اور [illegible] اور یہ سلام شو ہر دو کا ہو اگر کچھ کہتا ہوں تو [illegible] سمجھ لیتا

اور ہم خدا [illegible] ایسے لوگوں کی بابت عادۃً [illegible]

حال تو جہ کو حسن کی صحبت میں [illegible] ان کا دل ایسا ہو گیا ہوں بجلی مثل تو [illegible] + تو نیز ہر ایک نام آگہ

خوش تماشا ہے !! ایک نقب کی بات ہے کہ اس قسم کی ہزاروں کتابیں ہیں [illegible] شیخ جعفر عثمانی کو

سنکر اس قرآن کو جلد دو اور اسکو آباد و اجداد نے ستر ہا سبق [illegible] ہم لوگ سمجھتے [illegible] پڑی کتابیں

کرو تو جیسے [illegible] ؟ دو خبر اور [illegible] اور انکی ذاتیات

ہم صلح ! تو ہم ہر گز انسان نہیں ہیں۔ اور خدا [illegible] جیسی توجیہ کیجئے [illegible] لوگوں کی عادت کا خیال [illegible]

[illegible] اگر کچھ جواب ہے [illegible] آپ بابی

[illegible] ایسی کوشش کرنے پر مجبور کرتے ہیں جیسی [illegible] کہ اوسکی تردید [illegible]

[illegible] سید الاسلام سے [illegible]

[illegible] اور اوس [illegible] تو فی عبد اللطیف

[illegible] باقی عبد اللطیف

[illegible]

اگر فرصت ہو تو آج شام ۸ بجے تک یہاں آ جائیے

بھائی محمود! ... آپ کا خط تشریف لایا تھا ۔ شکریہ کہ آپ نے جلسہ میں شرکت کی ۔ حالات سے
واقف ہو کر بہت خوشی ہوئی ۔ خدا کی طرف سے اتفاق اور اصلاح کے لئے بیان فرمایا اور یہ بات بھی
کہ اصل کی بات ہے اور ادب میں ہم ہرگز نہیں اگر سستی ہم نے مشغول کیا ہم ۔ کیونکہ اس کا
ذکر یہاں اشعار میں ہے اور یہ تھا میں کہ نتائج ہوں خوش اور اگر آپ یہ بات فرمائیں کہ کبھی والے کوشش
کی جائے تو خوش ہوں ۔ خط کا مضمون مرکز کا ہے تمام لوگوں میں اتفاق ہو گیا ہے اب صرف ایک شخص
ہے جو شاید رہ جاتا ہے اور اس کی بھی دوا موجود ہے جو چند ملاقات کے بعد ملے گا ۔ نام صاحب رات کو یہاں
تھے لیکن ان کی طبیعت اچھی نہیں اور انہوں نے بہت سی باتیں اسلام کی کہیں اور شیخ صاحب اور منشی محمد حسین
دین کا اس قدر کیا ہے کہ ان کی مخالفت کا ہی اور جب کام شروع ہوا تو معلوم ہو کہ موقوف ہے ۔ اگر خود اہل اسلام
تو ضرور ہے کہ ان لوگوں کو گزشتہ شیوہ سے الگ کیوں کر رکھا ؟
زرا ایک بات ہے کہ آپ نے جو کام کیا ہے اس کو لوگ پسند کرتے ہیں اور
اور اس کے بعد بات کی ... اور ان کے علاج کی کوشش کریں ...
کہ وقت کا فرق نہ ہو ... بطور خود شعر ... اور بہت سی باتیں ہیں ۔
اور یہی کچھ ... کی اصل وجہ ... اس کی نسبت میں جو کچھ ہے اور ...
پسند ہے اس لئے ... اور ...
... اور ... ۔ ۹ ... صاحب ...
... انگریزی ... ترجمہ ...
... ترجمہ ...
... محمد اقبال

۶ ۔

برادرم

[illegible] ہفتہ بھر [illegible] اسے [illegible]

دوپہر [illegible]

[illegible] کتاب [illegible]

[illegible] ؟

ترجمہ [illegible] ۔ [illegible]

[illegible] ۶ [illegible]

[illegible] ۔ [illegible] اگر آپ [illegible]

[illegible] ۔ [illegible]

[illegible] ۔ [illegible] ۔ [illegible] آپ تکلیف [illegible] ؟ ۔

[illegible] آپ سے چار بجے [illegible] وقت [illegible] ۔ ۔ [illegible]

[illegible] ۲۰ [illegible] ۔ [illegible] ۔ ملاقات

آپ کا

ابوالکلام

Calcutta

۹-۶-۵۳

برادرم!

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ؟

[illegible]

[illegible] ؟ [illegible] ! [illegible]

[illegible]

السلام علیکم

آپکا
ابوالکلام ۔ ۲ شنبہ

صحافت

مشرقی افریقہ کے وحشی

جناب مولوی محمد یوسف صاحب جعفری (جو خاندان سادات [illegible] کے ایک معزز ممبر
اور علیگڑھ کالج کے اولڈ اسٹوڈنٹ ہیں ایک صاحب ذوق شخص ہیں اور ایک مدت تک
"پٹنہ انسٹیٹیوٹ گزٹ" کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں؛ اور [illegible]
گزٹ" [illegible] ہیں) خدمت میں ایک مختصر مضمون اور دو فوٹو
عنایت فرماتے ہیں۔ انہیں سے ایک فوٹو مشرق افریقہ کا وحشی مرد ہے اور
ایک فوٹو میں دو وحشی عورتیں کھڑی ہیں؛ ان تصویروں سے وہاں کا طرز رسم و رواج
[illegible] اور [illegible] [illegible] ہیں
ہوتا ہے؛ [illegible] ہے یہ دونوں فوٹو اور [illegible]
مولوی صاحب کی [illegible] ہیں ......

ہر ملک و ہر قوم کے نہ کیا تمدن ہے! ایک ملک کا رسم و رواج ہے اگر دوسرے ملک کے رسم و رواج سے ملائیے تو!
تو زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ اب دیکھیے! آج آپ کی خدمت میں مشرقی افریقہ کے وحشیوں کی
تین تصویریں ارسال ہوتی ہیں۔ جنہیں دیکھنے سے سخت تعجب ہوتا ہے! حیرت ہوتی ہے کہ دنیا میں ابھی تک ایسی
مخلوق موجود ہے جس کے باوجود [illegible] تمام دنیا تمدن اور شائستگی کی روشنی سے جگمگا رہی ہے تہذیب کی روشنی
نہیں پہنچی! اور [illegible] تک [illegible] ہی عادت [illegible] زندہ بسر کر رہے ہیں! تہذیب و شائستگی سے دور! [illegible]
شائستگی سے بے خبر! بس! اپنی زندگی جانوروں و وحشیوں میں مست ہیں، [illegible] سمجھنا اقوام
کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں!!!
دیکھیے! ان فوٹوؤں میں سے ایک فوٹو ایک وحشی مرد کا ہے جو اپنی اصلی حالت میں کھڑا اپنی
حالت بتلا رہا ہے! یہ مشرقی قوم کا نوجوان ہے۔ سارا بدن ننگا ہے! صرف چمڑے کا ایک لنگوٹ
گردن ہے! تصویر لیتے وقت اپنے چمڑا آگے کر دیا ہے ورنہ ہمیشہ یہ قوم بالکل مادر زاد ننگی رہتی ہے
سر پر [illegible] پر [illegible] ہوئے ہیں ~~[illegible]~~ ایک حلقے میں [illegible] کا گچھا اور [illegible]
کے علاوہ [illegible] والے ہوتے ہیں! اس قوم کے تمام مرد و زن [illegible] کے تیل اور [illegible] کا تمام [illegible] رہتے ہیں؛ اور [illegible]
[illegible] ہے! سارے بدن پر چربی اور سرخ مٹی ملا کر [illegible] ہیں اور اسے بڑی [illegible] چیز سمجھتے ہیں

فوٹو میں [illegible]

دوسری تصویر میں [illegible] قوم کی وہ عورتیں ہیں جو اپنا زیور وغیرہ پہنے ہوئے ہیں دیکھیے ! یہ [illegible]
[illegible] اور [illegible] میں بطور [illegible] کے پہنے ہوئے ہیں ! بعض عورتیں [illegible]
[illegible] دور سے دیکھنے میں بدنما معلوم ہوتا ہے ! اور ان کی بیشتر بناوٹ کثیف ہوتی ہے ! عجیب ہیئت
اختیار کرتی ہیں ! [illegible] ان کی نشست بھی عجیب ہوتی ہے : پاؤں [illegible] کر کے گھٹنے اونچے
کر کے بیٹھتی ہیں ۔ دیکھیے ! گلے میں [illegible] ڈالا ہے [illegible]
[illegible] کانوں میں [illegible]
[illegible] ہوا ہے ! [illegible] اور دامن [illegible] ہوتا ہے !
یہاں کی عورتیں بھی [illegible] ہوتی ہیں [illegible] ایشیا [illegible] آتا ہے !
مرد و عورت سب سگرٹ پیتے ہیں ۔ اور اس کو اچھا سمجھتے ہیں !! بعض مرد
[illegible] بال بہت [illegible] ! [illegible] قوم کی عورتوں [illegible] سے زیادہ
بال رکھتے ہیں مگر ان کا آدھا [illegible] ۔ یہ عورتیں [illegible] ہوتی ہیں
اور [illegible] تکلف اٹھاتی ہیں ۔ بعض تو [illegible] مرد [illegible]
[illegible] خوش ہوتے ہیں ۔ عورتیں [illegible]
[illegible] ہیں

[illegible] ان میں اگر کوئی آدمی [illegible]
[illegible] اور [illegible] میں [illegible] اور [illegible]
[illegible] اور [illegible] بہت [illegible] ۔ اس سے زیادہ [illegible]
[illegible] عجیب بات [illegible] عورتوں کی [illegible] آتی ہے اور [illegible]
[illegible] ہوتی ہے ۔ [illegible] بچوں کو [illegible] ہیں
اور [illegible] یہاں [illegible] زیادہ [illegible]
شادی [illegible] ! عجیب [illegible]

[illegible]

[illegible]

بہ

برادرم

بات یہ ہے صاحب میں نے بھیجی [illegible] سنگھ [illegible] روپیہ خرچ [illegible] -

اول تو دو روپیہ سے زیادہ نہیں [illegible] ہے اور [illegible] آدمی پر آپ

[illegible] روپیہ [illegible] مقدم [illegible] ایک [illegible] ہے [illegible]

ہے - علاوہ اس کے [illegible] آپ کو [illegible] اور زیادہ بہتر [illegible]

اور یہ اور خدا کی بات ہو - چونکہ [illegible] روپیہ منگوانا [illegible] خیال [illegible]

اس لیے - ذرا سوچ سمجھ کر [illegible] - اگر آپ مناسب سمجھیں [illegible] روپیہ [illegible]

اور اگر نہ بھیجے گا تو ناراض ہوگا - تو بلا تکلف [illegible] روپیہ منگوا لیں

اور [illegible] تو نہیں [illegible] تمام [illegible] اور [illegible] - [illegible]

کر دے [illegible] کر لیں - روپیہ [illegible] تو [illegible]

ہاں - اگر آپ مناسب سمجھیں تو بلا تکلف منگوا لیجیے [illegible]

کا مضمون [illegible] پیش آئے -

[illegible]

برادرم

حضرت سراج صاحب کی انگشتری [illegible] ۔ انہوں نے اجازت دی اور فرمایا "کہ [illegible] روپیہ منگوا لو"

لہٰذا آپ جناب کاظم صاحب [illegible] ۔ کہ وہ خدا بخش کو [illegible] ۔ اور ہمارے [illegible] منگوا لیں ۔

کہ ان [illegible] دو تمام فرد کر دیں ۔ (۱) [illegible] سے [illegible] کا فوٹو

لگا لیجئے ۔ (۲) [illegible] ۔ "کتاب" رسالہ ملک [illegible] ہوگی"

یعنی [illegible] پرزہ کاظم صاحب [illegible] ہوگا

نادری ۔

اور فرمائیے [illegible] رسائل و اخبار [illegible] پر برابر ہو [illegible]

[illegible] اور اخبار [illegible]

[illegible] ۔ [illegible] دار الانصار میں [illegible] ۔

ابوالکلام ۳-۵-۲۰
[illegible]

[illegible]

بھائی! کسی وقت اور [illegible] اور آج [illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] آنکھیں [illegible] اگر خود
نہیں تو [illegible] گذرے گا۔ اور [illegible] ۔ آج [illegible]
چاہیے [illegible] ۔

اور خط کا جواب آج جا رہا ہے [illegible]

تمہارا بے تکلف
ابوالکلام محی الدین احمد

13 - Blasis Road
P. O. Byculla
Bombay

[illegible]

برادر مکرم

اس وقت تک آپ کس حال میں رہے؟ کہاں رہے؟ آپ کس سلسلہ میں بمبئی گئے ہیں؟ اور

[illegible] رہیں گے؟ بہت دنوں سے آپ کے خط کا جواب [illegible] ضرورت نہیں۔ اور آخر سوالوں کا جواب ضرور

[illegible] ہے۔ [illegible] سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔ اور آپ نے [illegible] کچھ [illegible] ہے۔ اور

[illegible] روانہ ہوا تھا۔ اور دو ماہ [illegible] یہاں [illegible]

[illegible] اور [illegible] رہے۔ [illegible] سے اعلام [illegible]

[illegible] تمام [illegible] کی [illegible]

[illegible] اور [illegible] نہیں [illegible] ہوں۔ تمام [illegible]

[illegible] اول [illegible] قیمت [illegible]

[illegible] اور [illegible]

[illegible] جمع کیجئے۔ [illegible]

[illegible] اور [illegible] نہیں [illegible]

سو کچھ نہیں دیا گیا ہے، اب آپ کا عنایت نامہ کرینگے۔ بالفعل اگر مجھے نہیں تو آپ نے منظور کی ہیں،
اور درجہ اول کا فہرست دیدیں – وہ سب اگر محصول ہو جائیں گی – تو کل عجب امر نفقو کا لدیا اول وقت
محول کیجئے۔ باقی جو دیں – ان بجز یہ ہر عجب شرح ہوگا یہ علاوہ ہوتی محصول وغیرہ –
روپیوں کا ورث اور بہت ضرورت ہے، انگریزی پرچہ ہو اور رسالہ کا معاملہ ہو والتی ہو اپ شرح معلوم
ہو جائے کہ روپیہ کا سب سے پہلا ہو تو اپنی اطلاع کیجئے – ہر گز جلد کچھ ہو حالت یہ ہے –
یہ رقم میں بھیجئے گی۔ کچھ قیمتیں وصول ہو جائیں تو محصول اسی تکرار کا دے دیجئے گا
سر دست ذیل کا جار کت ہونے کا بہت ضرورت ہے – الحمین خط [illegible] دیکھئی اور روانہ کر دیجئے

الملل والنحل عبدالکریم شہرستانی مطبوعہ یورپ مجلد – ایک بڑی کتاب ضخیم ہوگی

جیمی یو، جو کہ تصنیف رضا افندی کی ہے، اور غالباً جغرافیہ یا علم طبقات الارض میں ہے۔ مجلد

رسالۃ التوحید عربی مطبوعہ مصر چھوٹی تقطیع غیر مجلد۔

المقدمہ عربی مطبوعہ علیگڑھ مجلد تصنیف مولوی کرامت حسین صاحب

ندوہ نے غیر چھپا ہے

الہ آباد ۔ ... چھپا ہے

نیاز کیش

ابوالکلام آزاد دہلوی

بمبئی - بیلاسس روڈ - پوسٹ بکس ۱۰۱۲ - ۱۳ - ذوالقعدہ -

برادرم [illegible] مجھے [illegible] اور [illegible]

[illegible]

[illegible] اور [illegible]

[illegible]

[illegible] - یہ نقصان [illegible]

[illegible] سوا [illegible] اور [illegible] سال [illegible]

[illegible] - [illegible] کی داد دی [illegible]

گیا - [illegible]

ہوگا - [illegible] - اور اصلاح بھی [illegible]

ایک [illegible] سوا [illegible]

[illegible] ہوگا - [illegible]

[illegible] اور [illegible]

[illegible] - اب [illegible]

آپ [illegible] خط دیکھوں گی - [illegible] الفاظ کے [illegible]

[illegible]

آپ کا خط ملا۔ اسکے بعد آپکو ... ایک خط بھیج چکا ہوں - سید نذیر نیازی ...

[illegible]

[illegible] اور آج بھی ... [illegible]

[illegible] - آپ ... [illegible]

... اور مجھے ... [illegible]

ہو ... ضرورت ... [illegible] ... آپ کی ...

اور ... - ... ! آپ ... - ...

آمین -

یہ خط آپکو اسلئے لکھتا ہوں کہ پرسوں ایک ... - ...

پہنچا - ... طبیعت اچھی ہے - آج آپکو خط لکھ رہا ہوں -

جون میں ایک مضمون ... اور ضرورت ہوگی - اسلئے اگر محمد شفیع ... ان کی

... - آپکو تکلیف نہ ہوگی - ... -

... - ... - ان ... ہے

... - محمد

۳

صد
کرنا ہو تو بامحل مضمون ترجمہ یا منتخب کر لیجئے - تیز ورق بہ ہم نشو - ایک گفتگو شبہ کی تشخیص کیجئے - کیمی انگریزی لمعہ نمونہ

کا ترجمہ ضرور ہو - مجھے امید ہے کہ آپ ضرور یہ کام کریں گے - انگریزی کی تقریر و اردو بنا لیا - جو کہ کامل قیام نہیں ہوا - البتہ

سنہ رحمت نامہ مشتمل بتہ تقریظ ہے - ینگ جوانگ کرہ لیا ہے - ایک نمبر الہلال کے ساتھ ایک گجراتی انگریزی کا ہی الا لکھتا ہے -

بارے یہ بلند ہے - جلد یہ لکھتا ہوں - الہلال - ساتھ ایک گجراتی انگریزی کا

رکھیں ق یہ ایک نمبر ہوں شمس کی مانند صاحب بابا یسجئے - حافظ عبدالرحمن - محمد شفیع صاحب کو بھی بھیجا گیا ۔

بخدمت حافظ صاحب دیکھ کہ شائع ہوں کا پتہ لکھ کر ۲۱ ایک پرچہ - انکا نام بھیجئے - سلسلہ نیشن و سلام عنایت

دہلی
نا
مولوی حسن نظامی دہلوی - مہتمم توشہ خانہ درگاہ حضرت نظام الدین محبوب الہی* دہلی

ذرا بیچ میں لکھا ہی ہو دوسرا حصہ تقریظ کا - یہ آپ کا بھیج دیا ہے جلد روانہ ہوں

ابوالکلام آزاد دہلی

۲۵ جون

موجودہ صحیح پتہ:
بمبئی۔ بیلاسس روڈ۔ نیو بلڈنگ۔ پوسٹ بائیکلہ

برادرم۔ ٹیگور اسکول کا [illegible] کیجئے۔ یہ [illegible] سنگھ و شانتا ٹیگور
یہ تجویز دائرہ المعارف کو بھیجی۔ اور دوسرا ایک تار بھیجا۔ خطوط نہ بھیجنے کی
وجہ میری علالت تھا۔ میں ابھی ہرگز اچھا نہیں۔ [illegible] مصروف ہیں
نظم [illegible] دیکھی ہو۔ آپ بھی ذرا اور [illegible] دیکھا تھا۔ خیر سبق اب بھی
اس نظم انگریزی کا [illegible] کی جائے۔ [illegible] کیجئے رسالہ کی ایک نقل
دو تین دن میں دیکھئے۔ مضامین بھیجتا ہوں بحث قابل خیال کیجئے۔
جو ہم ہمیشہ مضمون میں [illegible] ہے مجہول لکھی ہے۔ آپ نے منشی صاحب کو لکھا
کہ وہ ان کا خیال رکھیں اور مولوی محمود [illegible] سے دیکھیں ہے آپکو
وقت نہیں ہے۔ مگر ذرا میری خاطر تکلیف گوارا کیجئے ایک مختصر سا مضمون
السعادت و [illegible] بھیجتا ہوں اس کا صاف ترجمہ کر کے [illegible] رسالہ کو دیکھئے۔
[illegible] پر کتا ہے۔ ترجمہ شستہ مضمون کا ہو۔
حافظ عبدالغنی کے رسالہ کا [illegible] پر [illegible] کو ۵ روپے کا [illegible] رسول [illegible]

باڑ بیٹھیے - مسٹر کمال بازار دفتر وکیل مسٹر ایس - ایم

سنیے - نواب سالار جنگ - اور نیز ان دوستوں پر

امروہہ - محلہ دربار کلاں - مولوی سید محمد حسین اشیع امروہوی

دہلی - درگاہ حضرت نظام الدین - مولوی حسن نظامی صاحب

یعنی توشہ خانہ حضرت محبوب الٰہی -

۵۰

کاپی - ہر صفحہ دو دو تین مرتبہ دیکھیے - صحت کا خیال و درد

بوجہ مبادلہ - ان لوگوں کو پرچہ بھیجیے

ایڈیٹر رسالہ محبوب الکلام و دبدبۂ آصفی - افضل گنج حیدرآباد

لکھنؤ گولہ گنج - ایڈیٹر "الحکم" - ایضاً - دار العلوم ندوۃ العلماء

باڑ دیکھیے - منیجر ... الیوٹو و مبادلہ کیجیے - باقی پر اوکھل

بمبئی - بلاسس روڈ - پوسٹ بائیکلہ - پنو بلڈنگ - ۷ اگست

برادرم

تمہارا خط ملا اور اب رات مجھے تمہارے سلسلے

دیکھو مورچے میں : ماہِ نومبر کی دھول جھاڑو - اور سربراہ مخبط

خدا جانے کیوں - بزرگ آپ خلطی لوٹ آئیں گے اور خط

کا رشتہ ہے پہنچے گا - سا حلمین اس رنگیں - اور اک بہت مخطوطہ

بمبئی آئی ریوالور - جنہوں کل سے ایک نقشہ

خط کا ارسال کیجئے - ناشتے ایک ہزار جب ل

برابر رہتے گلہ نہیں گا - سالگرہ سے پوچھ چکے

ہو معمول ہوا - یہ بڑی آوارگی - کہ اب روپیہ کل کھنو پہنچے گا

دہلی کو نئے سبکدوش ہے - ابو سعید



INDIA POST CARD

THE ADDRESS ONLY TO BE WRITTEN ON THIS SIDE.



مولوی محمد یوسف صاحب جعفری

۱۴ تاراچند دت اسٹریٹ

کلکتہ

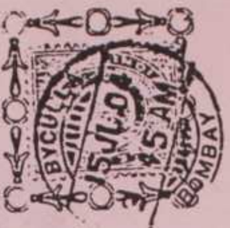
Calcutta

بمبئی [illegible]

برادرم - عنایت نامہ ملنے سے اطمینان ہوا - شکایت بجا ہے لیکن خدارا
دیکھو اسکا الہلال بھی نہیں ہے کہ میں ایک ہفتہ سے بیماری میں مبتلا ہوں
(اب تمہاری کا شکایت بھی نہیں ہے - رنگ بگاڑ رہے ہیں) میں اسے جناب
سمجھتا ہوں کہ جون جولائی کے ملا کر ایک ساتھ نمبر نکال دیا جائے
تاکہ یہ کمی پوری ہو جائے - اور کوئی صورت نہیں ہے - ۳۲ صفحہ کا ہوگا
ہوں گے - صاحب کے ہاں آج بھیج [illegible] ریولور اور ایک اور مضمون
بھیجتا ہوں - انہیں بھی دیکھ لیجئے - آج ایک تار دو نوٹ اور ایک
نوٹ لکھا ہے - کہ [illegible] ٹائیٹل پیج کو روپیہ میں نے اپنے نام بیلا دیا
وہ کا شفیق المنان رکھ - اگر سمجھتا ہوں خود روپیہ بھیج دونگا -
ٹائیٹل پیج کے حروف (یعنی بابت جون و جولائی) لکھنا باقی ہے
سمجھ کا خیال رکھئے - اور کام ان [illegible] شروع کیجئے - ابوالکلام



POST CARD.



جناب مولوی محمد یوسف صاحب جعفری

۱۲ تاراچند دت اسٹریٹ

کلکتہ

Calcutta

Bhajanlal Govindka Kalbadevi Bombay. All kinds goods can be supld. moderate price.

تعلیم و تصنیف

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

پیارے بابا

وہ تمھیں بہت یاد آتا ہے ۔ تم نے دیکھا کہ کتنی محبت [illegible] ! کیا یہ سچ ہے ؟
کہ [illegible] !! یہ میں [illegible] ۔ !!!! [illegible] ! مگر [illegible]
[illegible] ۔ [illegible] !

(۱) [illegible] عجیب [illegible] ہے ۔ [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] جواب [illegible] ۔ [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] اور اس [illegible] جواب
[illegible] ۔ [illegible] [illegible] اور [illegible] ۔ [illegible]
[illegible] [illegible] ۔ [illegible]
[illegible] ۔ [illegible] [illegible]

(۲) [illegible] [illegible] اور [illegible]
[illegible] اور [illegible]
اوقت [illegible] ہے ۔

۵	۶	نماز دینی
۶	۸	سبق
۹	۹.	ناشتہ
۸.	۶.	سبق دیگر
۹.	۱۱	[illegible]
۱۱	۱۲	[illegible]
۱۲	۲	[illegible]
۲	۴	[illegible]
۴	۵	خط و [illegible]
۵	۷.	[illegible]

[illegible] زیادہ
[illegible]
اور [illegible]
اب [illegible]
[illegible] ! [illegible]
[illegible] توقف [illegible]
[illegible]

قطعۂ تاریخ تالیف حیات حکیم خاقانی شروانی
از تصنیفات صدیقی و حبیبی مولانا حاجی الحرمین
احمد صاحب آزاد دہلوی از آثار خامۂ محمد متخلص
جعفری رنجور عظیم آبادی خلف مولوی ابو رداف الگ از کلکتہ

خاقانی باکمال کا حال — اُس پر تکلف بیان آزاد
جو لفظ ہے مصری کی ڈلی ہے — کیا شیریں ہے زبان آزاد
صفحے نہیں - تختہائے گُل ہیں — کہیے اسے گلستان آزاد
گو ہند میں ہیں بہت سخنور — ہے سب سے نرالی شان آزاد
بہرہ ہی نہیں انھیں سخن سے — ہیں جو کہ نہ قدر دان آزاد
آزاد کو حق رکھے سلامت — برباد ہوں دشمنان آزاد
ہو نشو و نما یہ یا الٰہی — دائم فکر جوان آزاد
ہر دم رہے باڑھ پر خدایا — آب طبع روان آزاد
تاریخ کی فکر اگر ہے رنجور — لکھ دو "ہے ارمغان آزاد"

۱۳۲۰ھ

[illegible]

مینو بسیم نامہ و مشتاق دیدار توام

بجانب [illegible] جناب مولانا [illegible] صاحب

[illegible] ۔ آپ کا [illegible] [illegible] ۔ [illegible] [illegible]

[illegible] ۔

[illegible] ۔ [illegible] آپ [illegible] [illegible]

[illegible] ۔ آپ [illegible] اور [illegible] [illegible]

[illegible] ۔ اور [illegible] [illegible] ۔

آپ [illegible] صاحب اور [illegible] صاحب [illegible] ۔ جواب [illegible] اور [illegible] [illegible] ۔

[illegible] ۔ [illegible] [illegible] ۔ ع

آپنے یاد دلایا ترجمہ یاد آیا

[illegible] اور جواب [illegible] صاحب [illegible]

[illegible] ۔ [illegible] اور [illegible] [illegible]

[illegible] ۔ [illegible] اور [illegible] [illegible] ۔ [illegible]

[illegible] ۔ [illegible] ۔ [illegible] ۔ [illegible] اور [illegible]

جناب [illegible] صاحب [illegible] ۔

جناب مولوی [illegible] صاحب [illegible] ۔

[illegible] جناب [illegible] عبدالرحیم صاحب [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible] [illegible]

مکرمی و محترم جناب [illegible] صاحب

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] وقت [illegible]

خط لکھنے میں [illegible]

[illegible] الہیات [illegible]

[illegible]

[illegible] کتاب [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] جواب [illegible]

[illegible] کتاب

العلوم الجدیدۃ والاسلام

[illegible] ایک [illegible]

برادرم

آج ایک عمل کیا ہے یعنی بے روزہ امروز آپ کا انتظار رہا لطف حاصل کر سکا [illegible]

کیوں کیا ارادہ ہے ؟

شیخ محمد طاہر والے کی قفلی مار کے گئے اب یہ لوگ کتب حسب [illegible]

کہ آپ ایک اور آئیے در دوزخ کیا ہے ... لاہور جانا درجہ [illegible]

کرنا کیا ہے ؟ ابھی جواب [illegible]

دیتے جائیے   والسلام

آپ کا

[illegible]

[illegible] دوبارہ [illegible] ہونا وجہ [illegible] سعادت [illegible]

[illegible] برکات [illegible] [illegible]

[illegible]

۴/۶/۵۳

[illegible]

مالی معاملات

[illegible]

برادرم [illegible] صاحب :

تسلیم -

[illegible]

کیا ممکن ہے ؟

[illegible]

"تکلیف دوستوں ہی کو دی جاتی ہے" ([illegible])

[illegible] ؟ ؟

آزاد کی رائے

"تکلیف جب دوستوں کو دی جاتی ہے تو وہ راحت سے بدل جاتی ہے"

"اگر تکلیف دہی دوستان دا ادان تکلیف نہ باشد" (سعدی)

[illegible]

ابوالکلام
محی الدین احمد آزاد دہلوی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

پانچ روپیہ کا [illegible] اس وقت ضرورت ہے۔ [illegible] ضرورت [illegible] ؟

[illegible] روپیہ دے [illegible] خدا۔

[illegible]

[illegible]

ابوالکلام آزاد

[illegible]

باقیاتِ صالحات

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

جناب مدیر [illegible] صاحب المعظم

خادم [illegible]

ابوالکلام آزاد دہلوی

باسمہ

برخوردار! خوش رہو!! [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

گذشت ۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

خوب [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ابوالکلام آزاد دہلی ۔

بسمہٖ

میاں بھیا یہ سمجھ لو

آج اس وقت ایک ویلیو پے ایبل خط تمہیں بھیجا ہے روپیہ کا تمہارے نام آئے گا تم ڈاکیے کو روپیہ دے کر

آج یہ ویلیو پے ایبل لے لینا ۔ کیونکہ ابھی مولوی صاحب باہر گئے ہوئے ہیں ۔

اور وہ گھر آ گئے ہیں کہ کل منگوا لے گا ۔ ایسے اس کا ویلیو لے لینا ۔

سمجھے ؟

ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی

قلبی روابط

برادر!

اگرچہ آپ کو خط نہیں لکھتا۔ کہ آپ بھی نہیں لکھتے ؟!!

کلکتہ میں رہنا ہوگا ؟ کس وقت ؟

یا آتی شنبہ میں پٹنہ آنے اور رہنے کا ارادہ ہے ؟

مطلع فرمائیے ؟

میں بخیریت ہوں — والسلام

کلکتہ
۱۰ امرالہی
ابوالکلام

۲۰ جون ۱۹۰۳ء



[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

الصبر ! الصبر ! لان الصبر مفتاح الفرج !

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

وقت صبح - ۷ بجے | پیارے | قلعۂ احمد نگر !

این دلی که دارم در برم تحفہ برائے یار تست
واندرم آن جان که در کشم برف بہار سبا او بیادوست

پیارے دوست! اور بہتیری سہانی - حضرت رنجور!

پہلا آپکا خط ہمارا چلا گیا ہو گا - دو ایک روز سے وہاں بجلی تک نہ تھی - اب میں آپکا اور خدا کا منتظر ہوں - جیسے کوئی کہ "میں اور ہیں یہ الہٰ ہو گیا - اور یہاں یہ مجھ پر برکات سے پہنچ رہا - اب میں اکیلا ہی ہوں"
مجھے امید ہے کہ اب خوشی اپنے خدا کی مدد سے پہنچتی کریں جائیگا -

آپنے ابھی چند روز قبل کتاب نہ اسکول کے طلبہ کو آپ اپنے بچوں کے متعلق یہ ہدایت الله بخیر ہیں - مگر اب وقت میں یاد رکھتے رہو لیکن آپکا محسن وہ تو دو دن رہے - ابھی حالت میں کہ پیار ہے اتنا خوف ستاتی ہوں - کہ اپنے اس جگہ کی آپ نے شکایت کی تو خط - میں نے ہرگز کسی احسان نہیں کیا - اور نہ میں کسی پر احسان کر سکتا ہوں - ہاں آپنے جو بہت مہربانی کی - اسکے لئے میں آپکا احسان لیتا ہوں - میں سر تا پا آپکا احسان مند ہوں -

——— اور اس وقت ایک ماہ کے بعد یہاں جاؤں گا اور کسی طرح ان کے لئے کچھ سب بندوبست ہو گا - انکی کتنی نصیحت اور آپ کا انتظار ہے اور وہ وہاں ہیں جسمانی طور پر - مگر وہ آپکی صحت جلدی ہے - اور یہ بہت تشویش ہے - دعا ہے کہ آپکو کوئی فکر نہ ہو - اور نہ چاہیئے - صحت کی نسبت ان کو چاہیے کہ اطمینان تر ہو کر - وہ دن زیادہ دیر کے لئے ان کو بہتر ہو گا - اگر زیادہ ہو تو خیر علاوہ اسکے آپ کی کسی مزید نا مناسب ہو - بس یہ ہم دعا کی حالت پر یہ بہت ہی خوش ہے -

اچھا! اب رخصت! کل پھر ان شاء الله خط میں صورت لکھیں گے

آپکا خادم
ابوالعلاء اولیوں

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] (دارالمصنفین) [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] !

خدا آپ کو صحت کامل عطا فرمائے۔

آمین

[illegible]

[illegible]

خادم احباب
ابوالکلام الدہلوی

4-5-06

لکھنؤ ندوہ

برادر مکرم - مرادآباد میں ایک انجمن اسلامیہ ہے جس کا سالانہ جلسہ تھا، خواجہ
غلام الثقلین بلا اصرار کے پہنچے، پرسوں واپس آیا خوش جلسہ جو بڑے
معرکہ کے ہوئے ہیں۔ شرح تکمیل اجلاس کے

آپ لکھنؤ تشریف لاتے ہیں دیدہ و دل فرش راہ!
میرا ارادہ تھا مطلقاً ارادہ کہ پرسوں ہی چلا جاؤں اور وہاں ایک ماہ رہ کر
الندوہ کا کام کروں لیکن اگر آپ تشریف لاتے ہیں تو قیام ضروری ہے،
~~ضرور~~ کچھ دنوں کیلئے ٹھہر جاتا ہوں اب سے اور ضرور اب سے، ممکن کی
بات ہو سکتی ہے کہ تین سال کی غیبت کی لکھنؤ کی بدولت مسرت دیدار کی
میں ختم ہو جائے،
ضروری کا جواب ابھی نہیں لکھا گیا کہ آپ کے علاوہ لکھنؤ میں موجود تھا۔
پہنچ گئے انشاءاللہ طبع کر دیا جائے گا
شرم ہے کیوں خط کیوں نہیں لکھتے، تعجب ہے جواب کیوں نہیں رہا؟
مگر وہ خط لکھنے کا تو ہر روز بدلتے ہیں

ابوالکلام آزاد دہلوی

متفرقات

بخ

[illegible]

۲۸ مئی ۱۹۰۶ء

[illegible]

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

[illegible]

[illegible]

خادم احباب

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

والسلام علیکم بالمودۃ والوداد

آپ کا مخلص دوست
ابوالکلام آزاد

۹/۱/۵۳

باب ۹

[illegible] پیشتر جانے سے پہلے

[illegible] دوسری [illegible]

تو ہم چونکہ ایک [illegible] ہے پیرس میں جانا چاہتا ہے۔ یہاں سے [illegible] میں [illegible] ہوا

[illegible] میں اور [illegible] دوسرے [illegible] میں [illegible] ۔ [illegible]

تو عجیب [illegible] ! [illegible] دو [illegible] ہوا ۔ [illegible] میں [illegible]

میں [illegible] ہوا [illegible] بڑے [illegible] شوق [illegible]

[illegible] میں [illegible] ڈورا ۔ [illegible]

[illegible] ! [illegible] ! [illegible]

[illegible] میں [illegible]

[illegible] اور [illegible] ۔ [illegible]

[illegible] ۔ [illegible]

[illegible] ۔ [illegible]

اور [illegible] ۔ [illegible] دوسری [illegible]

[illegible] ۔ اور [illegible]

[illegible]

مجھ کو بھی اردو نامہ دیکھ کر ایسی خوشی ہوئی کہ گویا پیاسے کو پانی ملا! الحمد [redacted]
تکلیف ہوا ہے۔ ان باتوں میں زیادہ درد سب کے جانب ہوں۔ مگر امید ہے [redacted]
دل کا حوصلہ بڑھتا ہے! یا اللہ کی مدد۔ خدا کی پیار بخش دیتی۔ شکریہ [redacted]
میرا احساس ہے۔ وہی بہت شفا بخش بات روحانیت و تقدس ہے =
بچے ہمیشہ سے اونچی ہی اونچی اڑتے رہے ہیں۔ جو بچے بہت کی بات ہی [redacted]
گھر و خاندان سکون نہیں ہے! اب دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ اور وقت فرا [redacted]
ہوا کی جگہ شان جو بنا کر تھے اور ہر وہ دور رہا کہ پا اور رونا تھا۔ اور ہم بتا [redacted]
جو لگے رہنے کے جیتے رہے۔ نہ رنگ منظر کا رہا۔ "ہر کوئی خود را چارہ نیست"!
روح تھکا کر رہ جاتا۔ تدبیر کی تدبیر نہیں ملتی ہے میں ہوتی =
عمل بچپن دونوں سے متواتر جسمانی اور روحانی صورت میں زخم لگے ہیں متبدل ہوتا ہوں
ضرورت ہے ایسا ہو؟ کچھ دن تک کی تکلیف کا اب تعلق ہو جاتا ہے۔
میں بیمار ہوں کہ بچے اور قوت جسمانی کے اب خوشگوار رہا۔ سمجھا جاتا ہو جیسے ہو بد جسمانی
حمایت پیچیدہ بیماری تکالیف جسم سے رشتہ ہے۔ مگر روح کے کس جسمانی تکالیف
اور سہارا ہے۔ جو آدمی گناہ کر رہا ہیں رنج و غم برابر جان ہی سے متعلق کر دیا ہو
ہمدردی ہو رہا ہے۔ زندگی خدا کا شکر ہے ادا۔ بیمار ہے

۱۰ [illegible]

[illegible] ۱۹۰۶

برادرم!!

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

ابھی تک دو ورق ایک اور منیجٹ بھی ملا۔ اس پر بھی دو [illegible]

ہمراہ ہو گا —

ابھی ادارے سے ناول تک آ پہنچا ہے کہ آپ کے خطوط نہیں پہنچے ہیں — [illegible]

دونوں کے خطوط ملاتے ہیں —

آپ نے کہا ہے کہ میں نے خط کا لطف لیا ہے — والد صاحب [illegible] جاتا ہے —

اگر آپ کی غزل پر دستخط نہ ہو تب بھی آپ کا خط ملا ہے — آپ پریشان نہ ہوں

کیا یہ فرمائی کہ اور پندرہ دن میں آپ کا خط نہیں آئے گا؟ پرسوں بڑی امید (?)

ہر جمعہ ہوتی ہے

باقی لوگ بڑی محبت سے سلام کہتے ہیں — اور بچے بھی [illegible] —

اگر یہاں تک تو ٹھیک ہے — اور [illegible] —

پیارے دار جلد ہے جواب جلد آئے —

والسلام

ابوالعسم (?)

مکرم

مخدومی! آپکو بہت روز ہوئے - کہ آپکا کوئی خط نہیں آیا -

اس عرصہ میں [illegible] کوئی قابل ذکر بات آپ نہیں ہوئی -

مولوی عبدالرحیم صاحب [illegible] منتظر خط ہیں - خدا کا شکر [illegible]

[illegible] گذشت شد -

باقی [illegible] کی صحت کا خیال رہے - اصل یہ تو بہتر [illegible]

[illegible] یہی اوس کی کتب [illegible]

[illegible] ہے -

[illegible]

١٨/٦/١٩٠٣ء



INDIA POST CARD



THE ADDRESS ONLY TO BE WRITTEN ON THIS SIDE

[illegible] - ڈاکخانہ گلزار باغ - محلہ [illegible] - [illegible]

بخدمت جناب مولوی عبدالرحیم صاحب

[illegible]

PATNA CITY 9 JU 03

[illegible]

بیٹے! یہ تو آپ نے خط [illegible] اور [illegible] آئی۔ پہلے آپ [illegible]

[illegible] چونکہ خطوط [illegible] ابھی آپ [illegible]

[illegible] اور یعنی امید ہے کہ [illegible] اور [illegible]

[illegible] آج [illegible] خط [illegible] آج [illegible]

[illegible] اتفاق [illegible] ١٠ بجے [illegible] جب [illegible]

[illegible] تشریف [illegible] ٢٠ [illegible] آئے تھیں؟

اچھا! اب ٢٠ بجے [illegible] فقط [illegible]

[illegible]

٥/١/٢٣

[illegible]

[illegible]

شریف پیارے دوست! اور شریف بے حد حضرت بزرگ!!

(۱) [illegible]

[illegible]

(۲) آپ نے [illegible] مثنوی کا [illegible] ترتیب دی ہے؟ یا مثنوی کی ترتیب [illegible] جاتی ہے! [illegible]

[illegible] حضرت! [illegible]

[illegible] !

آپ مطمئن رہیں =

آپ کی [illegible]

[illegible]

[illegible]

مخدوم مکرم جناب [illegible]

[illegible]

اے خدا یہ! [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اور شریف [illegible]

[illegible] !! اے حضرت [illegible] ....

دوستوں کا (شریف پیارے دوستوں کا) خادم

ابوالکلام آزاد [illegible] ۱۹۰۵

[illegible]

[illegible]

بچه‌های [illegible] ! سلام

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ([illegible] آزاد)

۳ - [illegible] [illegible]

« [illegible] » « [illegible] » [illegible] « [illegible] »

[illegible]

[illegible] - جناب [illegible]

[illegible]

[illegible] تبریزی

پاریس

[illegible]

[illegible]

حضرت زنیه !

[illegible]

[illegible]

[illegible] غایت [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

———— ————

ساتھی رنجور

میں آج سات بجے سے آدھی رات تک [illegible] اپنا جو میرا انتظار

کر رہا ہے بھی الوقت ۱/۱۱ گورا " کی سخت ضرورت ہے

حاصل رقعہ کو دو بیگ [illegible] دو گے جو خدا [illegible]

اگر [illegible] حوالہ [illegible] حاصل [illegible] ہیں



ڈاکٹر نذیر احمد
علی گڑھ

حیدرآباد کا پرانا نام: بھاگ نگر

——— افسانہ یا حقیقت

قطب شاہی خاندان کا پانچواں بادشاہ سلطان محمد قلی قطب شاہ نہ صرف سیاسی اعتبار سے خاندان کے سارے سلاطین میں ممتاز ہے بلکہ علمی و ادبی لحاظ سے اس کا پایہ سب سے بلند ہے، اور اگر یہ بات کہی جائے کہ تمام دکنی سلاطین میں سے ابراہیم عادل شاہ ثانی کے بعد وہ سب سے زیادہ نمایاں حیثیت کا مالک ہے، تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے، علم و ادب کا بھی بڑا قدرداں تھا۔ اس نے حیدرآباد جیسے ممتاز شہر کی بنیاد ڈالی، کہتے ہیں کہ یہ شہر ابتدا میں بھاگ نگر کہلاتا تھا، مگر اس کے بارے میں اختلاف رائے ہے، زیر نظر مضمون میں اس مسئلے پر تحقیقی روشنی ڈالنے کی کوشش کی جارہی ہے، سب سے پہلے وہ اقوال نقل کئے جائیں گے جن میں بھاگ نگر اور بھاگ متی کا ذکر ہوا ہے۔

(۱) بھاگ نگر کی بنیاد ڈالنے کی تاریخ ۱۰۰۰ ہجری بتائی جاتی ہے، اس سلسلے میں سب سے قدیم بیان دربار اکبری کے ملک الشعرا فیضی[1] کا ہے، جلوس اکبری کے ۳۶ ویں سال وہ خاندیس اور احمد نگر کی سفارت پر بھیجا گیا تھا، وہیں سے اس نے ایک نہایت مفصل عرضداشت روانہ کی تھی، اس میں

---

[1] انشائے فیضی مطبوعہ لاہور، ص ۹۷-۱۴۵

احمد نگر، بیجا پور، گول کنڈہ کے سلاطین کے حالات ان کے مشاغل، وہاں کے علما و فضلا، اور بعض دوسرے اہم امور کے ساتھ ساتھ ایران کے سیاسی و اقتصادی حالات ایرانی نو واردوں سے براہ راست حاصل کر کے اکبر کے پاس لکھ بھیجے ہیں۔ اس عرضداشت سے معلوم ہوتا ہے کہ فیضی نے سفارت کا کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا تھا، یہ عرضداشت اتنی اہم ہے کہ موجودہ دور کے سفیروں کے لیے نمونے کا کام دے سکتی ہے۔ ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ فیضی کی نظر اس امر پر مرکوز بھی کہ کون کون سے ایسے فضلا ہیں جو دربار اکبری کی زینت ہو سکتے ہیں، ان کی سفارش بھی کرتا ہے۔ یہ عرضداشت انشائے فیضی میں شامل ہے، اس میں دکن کے بارے میں بعض ضروری باتیں درج ہیں، انہیں یہ بھی ہے کہ محمد قلی قطب شاہ نے بھاگ نگر کو بھاگ متی کے نام پر آباد کیا تھا۔ فیضی لکھتا ہے :

"برہان نظام الملک اپنے کو حضرت عالی کے دولت خانہ کی نعمت کا پروردہ جانتا ہے، چار ماہ ہوئے عادل خاں کی جاگیر پر حملہ کی غرض سے احمد نگر سے ۵۰ کوس کے فاصلے پر بیٹھا ہے،... عادل خاں ہنوز بیجا پور کے قلعہ میں ہے اور ہزار سوار پر مشتمل ایک لشکر شاہزادہ کی سرکردگی میں مقابلہ کے لیے روانہ کیا ہے، ... دیگر ابراہیم عادل خاں حاکم بیجا پور ۲۴ سال کا ہے، وہ علی عادل خاں کا بھتیجا ہے اور صلاحیت سے خالی نہیں، حضرت کے دربار سے غائبانہ ارادت رکھتا ہے، دلاور خاں جو اس کا تربیت یافتہ ہے مذہب تسنن رکھتا ہے، لوگوں نے اس کے ساتھ بدسلوکی کی اس وقت نظام الملک کے پاس ہے، محمد قلی قطب الملک شیعہ مذہب کا پابند ہے، اس نے بھاگ نگر نام کا ایک شہر بسایا اور اس میں عمارتیں بنوائیں۔ یہ شہر ایک پرانی قحبہ اور اس کی قدیم معشوقہ بھاگ متی کے نام سے ہے، ولایت دکن کے حالات خواہ وہ حصے جو ان تینوں [نظام شاہی، عادل شاہی اور قطب شاہی سلاطین] کے قبضے میں ہیں یا وہ جو دوسرے راجاؤں کے پاس ہیں اور ان کے آپس کے تعلقات، باوجود موانع اور رکاوٹوں کے مبصرانہ طور پر ملاحظہ ہوئے اور اگر کچھ اور مہلت ملی تو حضور کی خدمت میں تفصیلی عرضداشت پیش ہوگی، بندہ یہ ولایت ممالک محروسہ میں شامل سمجھتا ہے، امید ہے یک بارگی قدوم مبارک مع موکب عالی کے ان اطراف میں آ پہنچے گا، یہ غزل حسب حال لکھی ہے، چونکہ نہایت مخلصانہ انداز میں نظم ہوئی ہے امید کہ نتیجہ وقوع پذیر ہوگا ؎

نسیم صبح مشک افشاں زگرد راہ می آید نگر از کوکب اقبال اکبر شاہ می آید الخ"

فی الحال اس عرضداشت کے اس حصے سے تعلق ہے کہ بھاگ نگر شہر محمد قلی قطب شاہ کا آباد کردہ تھا

اور اس شہر کا نام بھاگ متی نامی طوائف کے نام پر پڑا،[1] اور چونکہ یہ عرضداشت ۱۰۰۱ ہجری سے کچھ قبل لکھی گئی، اس لئے اس شہر کی بنیاد ۱۰۰۱ ہجری سے قبل ہی پڑی ہوگی۔

عرضداشت کی تاریخ کے سلسلے میں چند امور قابل ذکر ہیں:

(۱) — اکبرنامے سے معلوم ہوتا ہے کہ فیضی ۱۰۰۱ ہجری میں واپس ہوا تھا۔

(۲) — ابراہیم عادل شاہ ۲۲ سال کا بتایا گیا ہے، اس کی پیدائش ۹۷۹ھ کی ہے۔ ۱۰۰۱ ہجری سے کچھ قبل وہ ۲۲ سال کا ہو گیا ہوگا۔

(۳) — برہان نظام شاہ اور ابراہیم عادل شاہ کی آویزش کا تذکرہ ہے۔ تاریخ فرشتہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دلاور خاں کی تحریک سے برہان نظام شاہ پہلی جمادی الثانی ۱۰۰۱ ہجری کو عادل شاہی قلمرو میں داخل ہوا تھا، عرضداشت میں لکھا ہے کہ اس واقعہ کو ۳ ماہ ہوئے، اس لحاظ سے عرضداشت کی تاریخ رمضان ۱۰۰۱ ہجری کے قریب ہوگی۔

(۴) — شاہ عباس کی عمر ۲۰ سال کی بتائی گئی، وہ ۱۵ سال کی عمر میں ۹۹۶ ہجری میں تخت نشین ہوا تھا، اس اعتبار سے ۱۰۰۱ ہجری عرضداشت کی تاریخ قرار پاتی ہے۔

(۵) — اسی طرح خراسان پر فوج کشی، شاہ عباس کا اپنے دو بھائیوں ابوطالب مرزا اور طہماسپ مرزا کی آنکھوں میں سلائی پھروانا اور بکتاش خاں کی سرکشی وغیرہ کے واقعات سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ فیضی نے یہ عرضداشت ۱۰۰۱ ہجری کے وسط میں لکھی ہوگی

• دوسرا بیان نظام الدین بخشی کا ہے، وہ طبقات اکبری میں لکھتا ہے:

"ذکر محمد قلی قطب الملک بن ابراہیم ——— محمد قلی اپنے باپ کا قائم مقام ہوا، ایک بھاگ متی نام کی ایک عورت پر عاشق ہوا، اس کے نام پر ایک شہر بھاگ نگر نامی تعمیر کرایا اور اس طوائف کے لئے ایک ہزار سوار نوکر رکھے جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہتے۔ اس وقت ۱۰۰۲ ہجری اور ۳۸ واں سال جلوس (اکبری) ہے۔ اس وقت تک اس کو (یعنی محمد قلی قطب شاہ) حکومت کرتے ۹ سال ہو گئے۔"

اس میں اتنی بات درست نہیں کہ محمد قلی کو ۱۰۰۲ تک محض ۹ سال حکومت کرتے ہوئے تھے، برہان

۱- فرشتہ نے ابراہیم عادل شاہ ثانی کی محمد قلی قطب شاہ کی بہن چاند سلطان معروف بہ ملکۂ جہاں سے شادی کے موقع پر اس شہر کا نام بھاگ نگر لکھا ہے، یہ شادی ۹۹۶ ہجری میں ہوئی۔ اس سنہ میں بھاگ نگر کا نام موجود تھا۔ (تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۵۷)

ماثر میں اس کی تخت نشینی ۹۸۹ھ بتائی گئی ہے، اس اعتبار سے ۱۰۰۲ ہجری تک اس کو ۱۳-۱۴ سال حکومت کرتے ہو گیا تھا۔

● تیسرا بیان مشہور مورخ محمد قاسم فرشتہ کا ہے۔ وہ ۱۰۱۷ ہجری کے قریب اپنے قیام بیجاپور کے دوران لکھتا ہے:

"آسمان جلال کا وہ قطب اپنے اوائل حکومت کے ایام میں بھاگ متی نام کی ایک فاحشہ پر عاشق ہو گیا اور ہزار سوار اس کے ملازم رکاب کر دئے، چنانچہ وہ بڑے امرا کی طرح دربار میں آتی جاتی اور جن دنوں گول کنڈہ کے باشندے وہاں کی آب و ہوا سے پریشان اور متنفر تھے قطب شاہ نے شہر مذکور سے چار کوس کے فاصلے پر ایک شہر کی بنیاد ڈالی کہ پورے ہندوستان میں صفائی اور پاکیزگی کے اعتبار سے کوئی شہر اس کی طرح نہ تھا۔ اس کو اس نے اپنا دارالخلافہ بنایا اور اس کا نام بھاگ نگر رکھا، آخر کار اس نام سے پشیمان ہوا اور حیدرآباد نام سے موسوم کیا لیکن عام لوگوں میں یہ شہر بھاگ نگر نام ہی سے مشہور رہے۔ حیدرآباد نام سے نہیں۔ اس شہر کا دور پانچ کروہ ہے، اس کے بازار نہایت وسیع اور صاف ستھرے ہیں اور آب و ہوا صحت افزا ہے۔ بازار کے دونوں طرف نہریں جاری ہیں، ان کے کنارے سایہ دار درخت ہیں۔ نہایت عمدہ دکانیں اینٹ اور پتھر سے تعمیر ہوئی ہیں اور شاہی عمارتیں ایسی ہیں جنکی مثال دوسرے ملک میں نہیں ملتی"۔ ___________ (تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۱۷۳)

ابراہیم عادل شاہ ثانی[1] کی محمد قلی قطب شاہ کی بہن چاند سلطان معروف بہ ملکۂ جہاں سے شادی کے ضمن میں فرشتہ نے کئی بار بھاگ نگر کا ذکر کیا ہے، یہ واقعہ ۹۹۶ ہجری کا ہے:

"بیجاپور کے مشاہیر کی ایک جماعت محمد قلی قطب شاہ کے دارالملک، جو حیدرآباد کے نام سے موسوم اور بھاگ نگر کے نام سے مشہور ہے، بھیجی گئی تاکہ بلقیس مہر سلطنت چاند سلطان جو ملکۂ جہاں کہلاتی ہے بادشاہ کے عقد ازدواج میں لائی جائے"۔ ___________ (تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۵۷)

"رسل و رسائل اور محمد قلی قطب شاہ سے گفت و شنید کے بعد خواجہ علی ملک التجار کی سرکردگی میں

۱۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کی بیوی کا بھی نام چاند سلطان تھا جو احمد نگر کی تاریخ میں اپنی شہرت رکھتی ہے، سلطان نے اپنی کتاب نورس میں اپنی بیوی کا ذکر گیتوں میں کیا ہے۔ (گیت نمبر ۲۱، ۲۲)

ابراہم سب سندری دیکھیا ڈھونڈھ ہے کہاں | جات چاند سلطان نانو بی بی ملکیجہان

دھنی بی بی چاند سلطان ملکیجہاں | اتم سندر نار کیسی کہاں

اعیانِ بیجاپور شادی کے لوازم کے لیے نقود اور اجناس فراواں کے ساتھ بھاگ نگر روانہ ہوئے"۔ (ایضاً)

"بھاگ نگر کے نزدیک پہنچنے پر جب خیمہ و خرگاہ نصب ہوئے تو اس ملک کے سارے اشراف واعیان استقبال کے لیے آئے"۔ (ایضاً)

یہی مورخ ۱۰۰۰ھ کے ذیل میں بھاگ نگر کا ذکر پھر کرتا ہے:

"اوائل ۱۰۰۰ھ میں عدالت پناہ (ابراہیم عادل شاہ ثانی) کے یہاں ملکۂ جہاں کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا، چونکہ پہلی اولاد تھی، لہٰذا شادمانی کے لوازم میں بے حد و حساب اہتمام ہوا اور شاہانہ جشن تزک و احتشام سے منایا گیا، شہزادے کا نام علی رکھا گیا، اور اس کے ماموں یعنی محمد قلی قطب شاہ نے بھاگ نگر سے تہنیت اور مبارکباد کے لیے درگاہ کے چند خواص سونے کے جڑاؤ گھوڑے مع دوسرے بیش بہا تحائف کے بیجاپور بھیجے۔" (ج ۲ ص ۷۶)

اس سلسلے میں چند امور قابلِ لحاظ ہیں۔

۱۔ فرشتہ کے پہلے بیان میں واضحاً یہ بات کہی گئی ہے کہ محمد قلی قطب شاہ نے اوائلِ حکومت کے دوران شہر آباد کیا اور اس کا نام بھاگ نگر رکھا، یہ نام بھاگ متی کے نام پر رکھا گیا" بعد میں اس کو بدل کر حیدرآباد کر دیا گیا۔

۲۔ دوسرے بیان میں کہا گیا ہے کہ یہ شہر حیدرآباد کے نام سے موسوم ہے، گو عوام میں بھاگ نگر ہی کے نام سے مشہور ہے، اس واقعہ کا تعلق ۹۹۶ ہجری سے ہے جس تاریخ میں ابراہیم عادل شاہ کی شادی ملکۂ جہاں سے ہوئی تھی، لیکن یہ بات ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ محمد قاسم فرشتہ یہ واقعہ ۱۰۱۰ھ میں قلم بند کر رہا تھا، اس وقت شہر کا نام حیدرآباد سے موسوم ہو چکا تھا گو عوام کی زبان پر بھاگ نگر ہی چڑھا ہوا تھا۔ اس سے یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ ۹۹۶ ہجری میں نیا شہر حیدرآباد کے نام سے موسوم تھا، اس لئے کہ خود فرشتہ کے پہلے بیان میں واضحاً شہر کی تعمیر کے بعد اس کا نام بھاگ نگر لکھا ہے جو بعد میں حیدرآباد کہلایا، مگر عوام بھاگ نگر ہی کہتے رہے۔ ثانیاً یہ کہ اگرچہ احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ جب کسی جگہ کا ذکر کیا جائے تو اس تاریخ میں اس جگہ کا جو نام ہو وہی لکھا جائے مثلاً ۹۹۶ھ اور ۱۰۰۰ھ میں حیدرآباد بھاگ نگر کہلاتا تھا، حیدرآباد کا وجود نہ تھا، اس لئے اس کا وہی پرانا نام لکھنا چاہیے، لیکن اس کے بجائے اگر اسے حیدرآباد لکھا جاتا تو اس سے یہ استدلال غلط ہوتا کہ اس تاریخ میں اس شہر کا نام حیدرآباد تھا، مثلاً اگر کوئی یہ جملہ لکھے:

"قدیم زمانے میں رام چندر کے بھائی لچھمن اجودھیا میں رہا کرتے تھے۔"

تو اس سے یہ استدلال کہ رام چندر کے بھائی کا قدیمی نام لچھمن اور ان کے شہر کا اجودھیا تھا، صحیح نہ ہوگا، کون نہیں جانتا کہ لچھمن لکشمن کا اور اجودھیا 'ایودھیا' کی صوتیاتی تبدیلی کی شکلیں ہیں۔

اس تمہید کی ضرورت اس بنا پر ہوئی کہ پروفیسر ہارون خاں شروانی نے اگلی زمانے میں ایک مختصر کتابچہ بھاگ متی کے افسانے پر لکھا تھا، اس کے سلسلے میں اسی طرح کا تسامح ملتا ہے، مثلاً وہ لکھتے ہیں:

"اس کتابچے کی طباعت کے بعد یہ اہم انکشاف ہوا کہ خود فرشتہ جس کے چند فقروں پر بھاگ متی اور بھاگ نگر کے ایوان کی بنیاد رکھی گئی ہے نئے پایہ تخت کے قیام کے صرف پانچ سال بعد اسے حیدرآباد ہی کہتا ہے، جب وہ اس لڑائی کا ذکر کرتا ہے جو ۱۸-۱۹ جمادی الثانی ۱۰۰۵ھ/۲۶-۲۷ جنوری ۱۵۹۷ء کو دریائے گوداوری کے کنارے مغلوں کی فوج اور چاند بی بی کی متحدہ دکھنی فوج کے درمیان ہوئی تھی تو لکھتا ہے:

امرائے نظام شاہی و قطب شاہی کہ در روز سابق گریختہ بودند بحال ابتر بہ احمد نگر و حیدرآباد رفتہ حیات را غنیمت دانستند۔" (تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۱۶۳)

شروانی صاحب دوبارہ پھر فرماتے ہیں:

"خود فرشتہ (ج ۲ ص ۱۶۳) سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۰۵/۱۵۹۶ میں شہر کا نام حیدرآباد تھا۔"

جب یہ معلوم ہو کہ فرشتہ نے ۱۰۱۵ کے قبل تاریخ فرشتہ لکھنے کے لئے قلم نہیں اٹھایا تھا تو اس سے یہ استدلال تو صحیح ہوگا کہ ۱۰۱۵ھ میں حیدرآباد وجود میں آچکا تھا لیکن یہ استدلال کہ ۱۰۰۵ھ میں نئے شہر کا نام حیدرآباد تھا ایسا ہے کہ جیسا آجکل کی کسی تحریر سے قدیم ناموں کا تعین۔ ہاں اگر تاریخ فرشتہ روزنامچہ ہوتی تو یہ ماننا پڑتا کہ ۱۰۰۵ھ میں اس نے یہ واقعہ لکھا، اور چونکہ مستقبل کے بارے میں کوئی حکم نہیں لگا سکتا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ ۱۰۰۵ھ میں شہر کا نام حیدرآباد ہی تھا، لیکن جب صریحاً معلوم ہو کہ یہ واقعہ دس سال سے زیادہ کے بعد لکھا گیا تو اس سے استدلال ہوگا کہ لکھتے وقت اس شہر کا نام یہی تھا نہ کہ ماضی میں۔ عالم آرائے عباسی میں شاہ طہماسپ کے دوران حکومت میں ۹۷۶ ہجری کے ذیل میں حیدرآباد کا نام ملتا ہے، تو کیا اس سے یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ اس سنہ میں اس شہر کا وجود تھا، دراصل عالم آرای عباسی ۱۰۲۶ھ کے بعد لکھی گئی اور اس وقت شہر کا نام حیدرآباد مشہور ہو چکا تھا اس لیے مولف نے گول کنڈہ کے بجائے حیدرآباد نام لکھ دیا۔ خلاصۂ کلام یہ کہ محمد قاسم

فرشتہ کے بیان سے حیدرآباد کے نام پر استدلال غلط ہے۔

● **چوتھا بیان عبدالباقی نہاوندی کا ہے،** ۱۰۲۶ھ میں وہ اپنی مشہور تالیف مآثر رحیمی میں لکھتا ہے:

"محمد قلی قطب الملک بھاگ متی نام کی ایک عورت پر عاشق ہوا اس کے نام پر ایک شہر بنایا اور اس کا نام بھاگ نگر رکھا سلطان نے ایک ہزار سوار اس عورت کی خدمت میں نامزد کر دیے۔ اس کی سلطنت کے اواخر میں حیدرآباد نام کا ایک شہر امیر محمد امین کی سعی سے جس کا تعلق شہرستان اصفہان سے تھا اور جو بادشاہ مذکور کے یہاں میر جملگی کے عہدہ پر مامور تھا آباد ہوا بھاگ نگر سے وہاں آیا اور اس کو دارالسلطنت قرار دیا، کہتے ہیں کہ سارے عالم میں اس طرح کا شہر نہیں"

اگرچہ یہ بیان طبقات اکبری کے بیان کے مطابق ہے لیکن اس میں مزید یہ بات ہے کہ بھاگ نگر حیدرآباد سے الگ کوئی شہر ہے (گو ایسا نہیں ہے) اور حیدرآباد کی تعمیر میں میر جملہ اصفہانی کی کوشش کا دخل ہے میر جملہ کے ورود دکن کی تاریخ ۱۰۱۰ھ کے قریب ثابت ہوتی، خود میر جملہ لکھتا ہے:

چو عمرم بہ بست افزون شد بسال بیامد آیت دولت بعالم
روانم کرد سوی ہند اختر بآب خضر شد کام روان تر
پس از سالیم دولت یار گردید ز خوابم چشم دل بیدار گردید

میر جملہ کی پیدائش ۹۸۱ ہجری میں ہوئی، ۱۰۱۰ھ میں ۲۹ سال کا ہوتا ہے، اور یہی اس کے ورود ہند کی تاریخ ہوتی ہے ۱۰۱۱ ہجری میں وہ محمد قلی کا میر جملہ مقرر ہوتا ہے، مآثر الامرا کی یہ روایت کہ وہ ۱۰۱۳ھ میں قطب شاہی دربار پہنچا ہے، درست نہیں معلوم ہوتی، بہر حال حیدرآباد کی تعمیر کی تاریخ ۱۰۱۱ ہجری کے بعد ہوگی۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ فیضی کی عرضداشت اور طبقات اکبری میں صرف بھاگ نگر کا ذکر ہے، اور تاریخ فرشتہ اور مآثر رحیمی میں بھاگ نگر اور حیدرآباد دونوں کا اس سے یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ ۱۰۰۲ھ تک حیدرآباد کے وجود کا کوئی سوال ہی نہیں۔

● **پانچویں شہادت خافی خاں کی ہے** وہ منتخب اللباب میں لکھتا ہے:

"محمد قلی قطب الملک کے عہد میں (گولکنڈہ) کی کثرت آبادی اور ازدحام مردم کی وجہ سے خود سلطان کی خواہش ہوئی کہ تین چار کوس کے فاصلے پر موسی ندی کے کنارے اپنے نام پر ایک شہر آباد کرے، اسی درمیان بھاگ متی نام کی ایک طوائف جو قطب الملک کی معشوقہ تھی اور محمد قلی اس سے ایسا گرویدہ

ہوگیا تھا کہ ہزار سوار اس کے رکاب میں رہتے جن کے ساتھ وہ دربار میں آتی، اس کی خواہش پر نئے شہر کو اس کے نام سے موسوم کردیا گیا، چند دنوں بعد بھاگ متی فوت ہوگئی، اب سلطان محمد قلی کے دل میں بھاگ نگر نام کا قبح راسخ ہوگیا تو اس کو بدل کر حیدرآباد کردیا گیا۔"

● منعم خاں ہمدانی نے سوانح دکن تالیف ۱۱۹۷ ہجری میں منتخب اللباب والی روایت جو فرشتہ کے عین مطابق ہے اور دوسرے بیانات سے عموماً مشابہ ہے، دہرائی ہے۔

● حدیقۃ العالم (تالیف ۱۲۱۴ھ) میں تاریخ فرشتہ اور تاریخ محمد قطب شاہ کے متن یکے بعد دیگرے نقل کردیئے گئے ہیں، اگرچہ تاریخ محمد قطب شاہ میں فرشتہ کی روایت کی قولاً تردید نہیں، صرف بھاگ متی کے قصے کا ذکر نہیں، اس لیے ہم مولف حدیقہ کو بھی فرشتہ کا ہمنوا قرار دینے میں حق بجانب ہوں گے۔

● تاریخ فرخندہ (۱۲۴۵ھ) میں منشی قادر خاں بیدری نے بھاگ متی کے متعلق یہ اطلاع دی ہے:

"محمد قلی قطب شاہ شہر حیدرآباد... در سنہ ۹۹۸ بنا کردہ آباد کرد، تا اینجا در تواریخ قطب شاہی نوشتہ شدہ اما در تواریخ فرشتہ نوشتہ کہ محمد قلی قطب شاہ در اوائل بر بھاگ متی نام طوائف کہ تعشق داشت بنام او نام این بلدہ بھاگ نگر نہادہ، بعد چندہ سال از نام آن پشیمان شدہ بنام نامی و اسم گرامی حضرت مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ موسوم بحیدرآباد گردانید چنانکہ این مولف در رباعی گفتہ:

بہ نہصد و نود دگر ہشت سال محمد قلی شاہ فرخندہ فال
بنا بلدۂ حیدرآباد کرد جہانی چو گل در وی آباد کرد"

اس بیان سے واضح ہے کہ شہر کا نام پہلے بھاگ نگر تھا، ۱۷ سال کے بعد اس کا دوسرا نام حیدرآباد رکھا گیا۔ لیکن اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حیدرآباد کی بنیاد کی تاریخ ۹۹۸ ہے، اس حساب سے بھاگ نگر کی بنیاد ۹۹۸ - ۱۷ یعنی ۹۸۲ ہوگی۔ یہ سارے بیانات کے خلاف ہے، بھاگ نگر کی بنیاد کی تاریخ بعد کی ہے۔

● گلزار آصفی (تالیف ۱۲۵۸ھ) میں ہے:

"در عہد (ابراہیم قطب شاہ) پل دریای موسی بسبب تعشق شہزادہ مرزا محمد قلی کہ بر حسن جانفزای بھاگ متی طوائف میل کلی داشت تیار گردید، حقیقت آن این کہ شہزادۂ مذکور بر طبق معہود... ہموارہ بوقت شب از قلعہ محمد نگر بخانۂ طوائف مذکورہ در موضع چچلم کہ آبادہ بلدہ حیدرآباد بر زمین ہمان موضع واقعست، آمد و شدمی داشت، روزی موسم باران موافق معمول خود بوقت شب قصد نمودہ چون بر سر

دریای موسیٰ رسید' دید کہ طغیانی آب از حد زیادہ است کہ فیل قوی ہیکل ہم نتواند قدم اندرونش گذارد' فوراً در جذبۂ عشق و محبت اسپ سواری خود را بی اندیشہ در تلاطم تموج آب انداخت و بزور حفظ حقیقی بسلامت برآمد" (بحوالۂ محی الدین قادری زور' قطب شاہ ص ۸۱ - ۸۲)

شاہ عبدالقادر بیدری نے اپنے رسالے "بعض احوالات از تواریخ قطب شاہیہ" (تالیف ۱۲۶۵ھ) میں اور سید اصغر علی بلگرامی نے "مآثرِ دکن" میں اسی قصے کی تفصیل لکھی ہے۔ مولوی عبدالجبار ملکاپوری اپنے تذکرہ "محبوب الزمن" تالیف ۱۳۲۹ھ میں بھاگ متی کے قصے کی تفصیل اپنے ماخذ کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فرشتہ و مولف قطب شاہ (مراد منشی عبدالقادر بیدری) نے لکھا کہ ابتدائے سلطنت میں بمقتضائی عالم شباب بھاگ متی طوائف پر فریفتہ و شیفتہ ہوا تھا' ہزار سوار اس کی میشی میں ملازم کئے تھے۔ وہ روزانہ دربار میں تجمل و طمطراق کے ساتھ آمد و رفت کرتی تھی ... حسن و جمال میں رشک زہرہ و مشتری تھی ... فقیر مولف نے اس کی تصویر سلطان محمد قلی کے دیوان میں دیکھی' واقعی تصویر کے دیکھنے سے مورخین کی تحریر کی تصدیق ہوتی ہے ... تاریخ نظامی قطب شاہی کے مولفین نے لکھا ہے کہ سلطان نے اپنی محبوبہ بھاگ متی کی فرمائش سے گول کنڈہ سے چار کوس کے فاصلے پر موسیٰ ندی کے کنارے ایک شہر آباد کیا اور اس کو اپنا دارالسلطنت بنایا اور اس کا نام بھاگ نگر رکھا' محبوبہ جب تک زندہ رہی بھاگ نگر بھی زندہ رہا' جب وہ فوت ہوگئی علماء و فضلا کی نصیحت سے اس نام کے رکھنے سے پشیمان و شرمندہ ہوا' منسوخ کرکے حیدرآباد نام رکھا ... مگر خلائق میں بھاگ نگر ہی رہا نہ حیدرآباد' فی زماننا ہنود تلنگے و کنڑی اپنی پوتھیوں و بیاضوں میں حیدرآباد کو بھاگ نگر لکھتے ہیں۔"

ڈاکٹر زور نے بھاگ متی کے سلسلے کے اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے بطور نتیجہ لکھا ہے:

"بہرحال موجودہ معلومات کی بنا پر اتنا یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ محمد قلی عنفوان شباب ہی میں بھاگ متی پر عاشق ہوا اور اسی کی خاطر طغیانی رود موسیٰ میں اپنا گھوڑا ڈال دیا' جب اس خطرناک جرأت کی خبر اس کے باپ ابراہیم قطب شاہ کو ہوئی تو اس نے ندی پر پل بنوا دیا' اس کے کچھ دن بعد ہی ابراہیم کا انتقال ہوگیا' محمد قلی نے تخت نشین ہوتے ہی اپنی محبوبہ کے اعزاز و اکرام میں اضافے کی خاطر ہزار سوار اس کے یہاں متعین کر دیے جو ہر وقت اس کے جلو میں رہتے اور وہ اسی شان و شوکت کے ساتھ موضع چیلم سے گول کنڈہ آیا کرتی تھی ... اسی اثنا میں اس نے اپنی محبوبہ کے گاؤں کی ایک

عظیم الشان شہر میں تبدیل کرنے کی ٹھانی اور جب یہ شہر بن گیا تو اسی کے نام پر اس کا نام بھاگ نگر رکھا"
(محمد قلی قطب شاہ ص ۸۳)

ڈاکٹر زور صاحب پھر لکھتے ہیں:

"بھاگ نگر یا حیدرآباد کی بنا کے متعلق کبھی محمد قلی کے موجودہ کلام سے بہت کم علم حاصل ہوتا ہے خاص کر بھاگ نگر کا تو محمد قلی قطب شاہ نے کہیں نام بھی نہیں لیا... اس موقع پر یہ امر واضح کر دینا ضروری ہے کہ ماہ نامہ کے مصنف نے بھاگ متی کے قصے کو غلط بتا کر یہ لکھا ہے کہ اصل میں محمد قلی قطب شاہ کی والدہ کا نام بھاگ رتی تھا اور اس نے اسی کے نام پر شہر بھاگ نگر آباد کیا، اس اختلاف رائے کا تصفیہ اسی وقت ہو سکے گا جب چند اور قطب شاہی تاریخیں دستیاب ہوں گی اور محمد قلی کا مکمل کلام مل جائے گا۔ بحالت موجودہ اتنا تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ماں ہو یا محبوب، بھاگ رتی ہو یا بھاگ متی محمد قلی نے اپنی محبت کی یادگار کے طور پر بھاگ نگر کو بسایا تھا" (ایضاً ص ۱۰۷)

"ماہ نامہ" حاجی غلام حسین خاں کی مرتبہ کتاب ہے جو ماہ لقا بائی چندا کی ہدایت پر مکمل ہوئی۔ اس میں سوانح دکن کے مولف خواجہ منعم خاں ہمدانی کی یہ روایت کہ بھاگ متی ایک طوائف تھی اور محمد قلی قطب شاہ نے بھاگ نگر اس کے نام سے آباد کرایا، غلط ٹھیرائی ہے، اس کا خیال ہے کہ بھاگ نگر محمد قلی کی ماں بھاگیرتی کے نام پر آباد ہوا تھا۔

شروانی صاحب کی تردید میں

پروفیسر ہارون خاں شروانی صاحب نے "بھاگ متی کا افسانہ" کے عنوان سے ۱۸ صفحے کا ایک رسالہ مع ۶ صفحے کے دو ضمیموں کے شائع کیا ہے۔ اس میں ایک طرف تو بھاگ متی کے "قصے" کو جعلی بتایا گیا ہے اور دوسری طرف حیدرآباد کے قدیم نام بھاگ نگر کی صحت سے انکار کیا گیا ہے۔ شروانی صاحب کا خیال ہے کہ محمد قاسم فرشتہ نے محض زیب داستان کے لیے یہ قصہ گڑھ لیا ہے اور بعد کے مورخوں نے اس پر خاطر خواہ اضافہ کر کے ایک دلچسپ رومانی داستان تیار کر لی ہے۔ ان کے استدلال حسب ذیل ہیں:

(۱) فرشتہ نے حیدرآباد کی آبادکاری کے ۱۸ سال بعد تک (یعنی تا ۱۰۱۸ھ کے واقعات درج کئے ہیں)، اسکے علاوہ کسی ہم عصر تاریخ میں بھاگ متی یا بھاگ نگر کی طرف اشارہ نہیں۔ برہان مآثر ۱۰۰۳ء میں تکمیل کو پہنچی، اسکے مصنف علی بن عزیز طباطبائی گولکنڈہ اور حیدرآباد

کے حالات نہایت شرح و بسط کے ساتھ درج کئے ہیں، لیکن اس میں بھاگ متی یا بھاگ نگر کا ذکر نہیں۔ اسی طرح گول کنڈہ کی شاید سب سے مستند تاریخ "تاریخ محمد قطب شاہ" (۱۰۲۵) میں حیدرآباد کی بنیاد اور وہاں کی عمارتوں کا مفصّل ذکر ہے۔ اس میں بھاگ متی یا بھاگ نگر کی طرف کوئی اشارہ نہیں۔ اسی طرح تاریخ "حدیقۃ السلاطین" (۱۰۵۴) بھی بھاگ نگر کے تذکرے سے خالی ہے اور "حدائق السلاطین" (۱۰۹۲) میں حیدرآباد کے متعلق یہ لکھا ہے:

"شہر حیدرآباد کہ مسکن ارباب علم و ملاذ و مامن اصحاب رشد و ارشاد است از مستحدثات آں والا نژاد است کہ در سنہ ہزار و چہار طرح انداختہ کلمہ سعید رآباد بہشت بنیاد بتاریخ موافق افتادہ"

رفیع الدین شیرازی نے بھی لکھا ہے کہ گول کنڈہ سے دو فرسنگ کے فاصلے پر نیا شہر آباد ہوا تھا، شہر کیا تھا "گویا تمام شہر یک باغ است"

اس سلسلے میں میری معروضات یہ ہیں:

(الف) بعض تاریخوں کی خاموشی سے ایسے واقعے کا انکار جو تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ متعدد تاریخوں اور تذکروں میں پایا جاتا ہو، عموماً قابل قبول نہیں۔

(ب) شروانی صاحب کے بعض بیان تصحیح طلب ہیں، انھوں نے برہان مآثر کی تاریخ تالیف ۱۰۳۸ھ لکھی ہے، حالانکہ وہ ۱۰۰۰ ہجری میں لکھی جانی شروع ہوئی اور ۱۰۰۳ھ میں مکمل ہوئی۔ مطبوعہ نسخے کے اردو دیباچے میں ہے:

"تاریخ برہان مآثر برہان نظام شاہ کی فرمایش سے (مولف نے) لکھی، سن تالیف ۱۰۰۰ھ برہان کے اعداد سے برآمد ہوتا ہے" (ص ۱)

خود مولف نے مقدمہ میں لکھا ہے:

"چون این نسخۂ ہمایوں بنام ہمایوں حضرت خاقان زمان ... مرقوم می شود، او را به برہان مآثر موسوم ساخت و از نوادر اتفاقات اسم مذکور بلسان عدد از تاریخ سال مبدا این مسطور ایضاح می کند" (ص ۱۰)

خاتمے کی عبارت ملاحظہ ہو:

"و این واقعہ در ۱۳۔ رجب ۹۹۹ھ روی نمود، چون احوال فرخندہ مآل صاحب قران دریا نوال و وقایعی کہ از مبدا طلوع آفتاب بی زوالش از برج ولادت تا حال بو قوع انجامیدہ زیادہ از

آنست کہ این مجلد را مجال گنجائی آن باشدؔ ناچار خامہ بدائع نگار در تحریر آن دفتر علیحدہ خواہد پرداخت۔" (ص ۵۹۲)۔

لیکن بعد میں ۱۰۰۵ھ میں مولف نے احمد نگر کی فتوحات (بوسیلہ خان خانان) پر ایک باب کا اضافہ کر دیا جو ۵۹۳ تا ۶۳۲ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

دراصل ہارون شروانی صاحب کو ۱۰۳۸ سال تصنیف قرار دینے میں قلمی نسخے کی تاریخ کتابت سے غلط فہمی پیدا ہوئی، ترقیمہ ملاحظہ ہو:

"تمت ہذا الکتاب بعون الملک الوہاب علی ید الفقیر الحقیر المحتاج الی رحمت الملک الغنی ابوطالب ابن سید علی طبا طبا الحسنی بتاریخ ۵ شنبہ بیست و دوم شہر محرم الحرام ۱۰۳۸"

۱۰۳۸ نسخے کی تاریخ کتابت ہے۔ اس نسخے کے پہلے ۵۹۲ صفحات خود مولف کتاب یعنی علی ابن عزیز اللہ کے قلم کے ہیں۔ ان کی کتابت کی تاریخ ۱۰۰۳ھ ہے۔ یہ عبارت ملاحظہ ہو:

" وقع الفراغ من تالیفہ وتسویدہ فی لیلۃ الاحدی رابع عشر من شہر المبارک المسمی بہ ربیع الاول من شہور سنہ ثلث والف من الہجرۃ النبویہ ... علی ید العبد المذنب المفتقر الی رحمۃ اللہ الولی علی بن عزیز اللہ الطباطبائی الحسنی ..."

شروانی صاحب کا یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ برہان ماثر میں گولکنڈہ اور حیدرآباد کے حالات شرح و بسط کے ساتھ درج ہیں، دراصل یہ بہمنوں اور نظام شاہیوں کی تاریخ ہے اور اس کے مندرجات یہ ہیں:

طبقۂ اول سلاطین گل برگہ از علاءالدین حسن تا فیروز شاہ بہمنی، طبقہ دوم سلاطین بیدر از احمد شاہ بہمنی تا محمود شاہ بہمنی، طبقہ سوم سلاطین احمد نگر از سلاطین احمد شاہ بحری تا ۹۹۹ھ، ضمیمہ (بغیر عنوان) از حملہ مغلیہ تا ۱۰۰۵ھ

اس تاریخ میں عادل شاہی اور قطب شاہی حکمرانوں کا ذکر ضمناً آگیا ہے، محمد قلی قطب شاہ کا حال اس عنوان کے تحت آیا ہے:

"ذکر فوت بادشاہ معدلت دستگاہ ابراہیم قطب شاہ و جلوس مہر سپہر سلطنت و بختیاری قطب فلک حشمت و کامگاری محمد قلی قطب شاہ بر سریر سلطنت و جہانداری"

اس کے ضمن میں جلوس سلطنت اور محاصرۂ نلدرگ کا (جو ۹۹۰ھ میں واقع ہوا اور اسی وقت

مولف برہان مآثر بھی عراق سے گولکنڈہ پہنچا تھا) کسی قدر تفصیلی ذکر ملتا ہے، اس کے علاوہ اور کسی جگہ نہیں۔ اس بنا پر بھاگ نگر یا حیدرآباد کی تلاش اس کتاب میں بے سود ہے۔ مجھے مطبوعہ کتاب میں نہ حیدرآباد کا ذکر ملا اور نہ بھاگ نگر کا۔ بہرحال اس کی خاموشی کی داستان ذرا طویل ہو گئی، لیکن قارئین اندازہ کریں گے کہ اس کے مولف کے یہاں اس شہر کا ذکر ممکن ہی نہ تھا۔

تاریخ محمد قطب شاہ کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں، لیکن حیدرآباد کی تعمیر کی تاریخ یعنی ...اھ مجھے اس کتاب کے روٹوگراف میں کہیں نظر نہیں آئی، ثانیاً چونکہ یہ تاریخ ۱۰۲۵ھ میں لکھی گئی اور اس میں بھاگ نگر کے بجائے شہر کا نام حیدرآباد ہی ہو گا اس لیے کہ اس وقت بھاگ نگر نام کی تاریخی حیثیت ہو چکی ہو گی، پس اس آخرالذکر نام کی غیر حاضری سے اس کے عدم وجود کا استدلال زیادہ قوی نہیں۔ یہی بات حدیقۃ السلاطین اور حدائق السلاطین کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ آخرالذکر میں حیدرآباد کی آبادکاری کی تاریخ ۱۰۰۴ھ لکھی اور یہی تاریخ "حیدرآباد بہشت بنیاد" کے اعداد سے بھی نکلتی ہے۔

(۳) شروانی صاحب کا دوسرا استدلال یہ ہے کہ خود محمد قلی قطب شاہ نے ۱۲ پیاروں کا ذکر کیا ہے، ان میں بھاگ متی نام موجود نہیں، اسی طرح بھاگ نگر کا ذکر اس کے یہاں نہیں جبکہ حیدرآباد کا نام تین بار آیا ہے۔ یہ استدلال قوی ہے لیکن کسی اور مضبوط قرینہ کی عدم موجودگی کی بنا پر یہ قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

(۳) شروانی صاحب کا تیسرا استدلال یہ ہے کہ شمالی ہندوستان کے مورخین کا بیان اعتماد کے قابل نہیں:

(۱) "خافی خاں جس کا ماخذ صرف فرشتہ ہے جو سلطان کی محبوبہ کا نام کبھی بھاگ رتی اور کبھی بھاگ متی اور محمد قطب شاہ کو محمد قلی کا بیٹا بتاتا ہو اس کا قول کیوں کر قابل استناد ہو گا" (ملخصاً)

— بھاگ رتی اور بھاگ متی اختلاف نسخ ہیں، ان کو کتابت کی غلطی پر محمول کیا جا سکتا ہے مصنف کی غلطی پر نہیں، محمد قطب شاہ محمد قلی کا بھتیجا تھا، بیٹا نہیں، خافی خاں کا بیان یقیناً غلط ہے، لیکن اس غلط بیان سے بھاگ متی والے واقعے کی تردید کیوں کر ہو گئی، کسی ایک مؤلف کے کسی سلسلۂ واقعات کے ایک بیان کے غلط ہونے سے اس کے سارے بیان غلط نہیں قرار دیے جا سکتے، ہر بیان کی صحت و تکذیب کے لیے الگ الگ پیمانے ہوں گے، ایک پیمانے سے سب کو نہیں ناپا جا سکتا۔

(ب) شروانی صاحب مزید فرماتے ہیں:

"طبقات اکبری کے متعلق یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اس کا مؤلف محمد قلی کے طویل اور شاندار عہد کو صرف ایک فقرے میں ختم کر دیتا ہے: محمد علی (کذا) قطب الملک بن ابراہیم قائم مقام پدر شد و بریاتری بھاگ متی نام عاشق شدہ... قطب شاہی خاندان خصوصاً محمد قلی قطب شاہ کی توہین و تذلیل میں وہ فرشتہ سے کہیں بڑھ جاتا ہے... نظام الدین کو تو بادشاہ کا ٹھیک نام بھی معلوم نہیں (قلی کے بجائے علی) شاہی تو درکنار اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ سلطان ۹۸۸ھ میں تخت پر بیٹھا تھا نہ کہ ۹۹۳ھ میں۔ تعصب سے بھرے ہوئے ایسے بیان کو تاریخی واقعات کی بنیاد کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔"

شروانی صاحب کا بیان منطقی ربط سے خالی نظر آتا ہے، فرماتے ہیں نظام الدین (صاحبِ طبقات اکبری) بادشاہ کی تذلیل کرتا ہے، وجہ تذلیل یہ کہ اس نے بھاگ متی کے قصے کا ذکر کر دیا، اسی وجہ سے شروانی صاحب اس کے تعصب سے بھرے ہوئے قول کی تائید نہیں کر سکتے، اگر اس واقعہ کی تصدیق ہو جائے کہ بھاگ متی کا قصہ صحیح ہے تو نہ وجہ تذلیل باقی رہے اور نہ بیان تعصب سے بھرا ہوا ہو۔ یہ طرزِ استدلال واقعہ کی توثیق یا تکذیب کے سلسلے میں منفی ہے اور اسی بنا پر قابل ترک، اس پر ثبوت کی ضرورت تھی کہ واقعہ غلط ہے اور اس کا پیش کرنے والا متعصب۔

رہا بادشاہ کے نام کے ٹھیک نہ جاننے اور ۱۰۰۲ھ میں اس کی مدت حکومت کے غلط لکھنے کا سوال، تو اس میں پہلی بات تو منطقی قابل توجہ نہیں، وہ فرماتے ہیں کہ نظام الدین اس کا نام "محمد قلی" کے بجائے "محمد علی" لکھتا ہے، دراصل بات ایسی نہیں، طبقات اکبری ایشیاٹک سوسائٹی کے مطبوعہ نسخے میں ہر جگہ اس کا نام محمد قلی ملتا ہے، یہی نام اس کے انگریزی ترجمے میں بھی پایا جاتا ہے، اگر کسی نسخے میں ایک جگہ محمد علی مل گیا تو اس کو مصنف کے سر منڈھنے کا کوئی ادنیٰ جواز نہیں، یہ چھاپے یا کتابت کی غلطی ہے، مصنف کی غلطی اور کاتب کی غلطی میں فرق کرنا ضروری ہے، ورنہ ایسی تحقیق جس میں کاتب کی غلطیاں مصنف کی بتائی جائیں، قابل توجہ نہیں ہو گی۔ دور کیوں جائیے، برہان مآثر میں بھی ایک جگہ محمد قلی کے بجائے محمد علی ملتا ہے، کیا اس کی بنا پر مؤلف برہان پر یہ ایراد ہو سکتا ہے کہ وہ سلطان کے نام سے واقف نہیں؟ برہان مآثر کی عبارت یہ ہے:

(کامگاری محب رسول اللہ المؤید من عند اللہ ابو المظفر محمد علی قطب شاہ الخ (ص ۷)

البتہ یہ حقیقت ہے کہ ۱۰۰۲ھ میں محمد قلی کی حکومت کو ۱۴ سال ہو چکے تھے، مگر مطبوعہ نسخے میں ۹ سال درج ہے، بظاہر یہ مصنف کی غلطی ہے، لیکن اس غلطی سے یہ استدلال نہ ہوگا کہ نظام الدین مؤلف طبقات اکبری سلطان محمد قلی کے ذلیل کرنے میں فرشتہ سے آگے بڑھ گیا ہے۔

(ج) انشائے فیضی کے بارے میں شروانی صاحب کا خیال درست نہیں:

"انشائے فیضی کے آصفیہ کے قدیم نسخے میں محمد قلی کا ذکر نہیں تھا، البتہ سالار جنگ کے جدید اور معمولی نسخے میں یہ اطلاع ملتی ہے: احمد قلی قطب الملک تشیع دارد و معمورہ (کذا) ساختہ و عمارات را پرداختہ بھاگ نگر بنام بھاگ متی فاحشہ کہنہ و معشوق قدیم دوست ... محمد قلی قطب شاہ کے متعلق جو دو فقرے ہیں وہ طنز سے بھرے ہوئے ہیں، تشیع دارد۔ فاحشہ کہنہ۔ معشوق قدیم وغیرہ۔ خط کا لب لباب یہ ہے کہ اکبر کے دکن میں آنے کی دیر ہے۔ یہ خط آصفیہ کے قدیم نسخہ میں نہیں تھا اور تاوقتیکہ اس کی اصل پتا نہ لگے اس پر حجت کیسے مبنی ہو سکتی ہے۔"

دراصل جیسا کہ شروع میں عرض ہو چکا ہے فیضی شوال ۹۹۹ ہجری میں خاندیش اور احمد نگر کی سفارت پر گیا اور وہاں سے ۱۰۰۱ ہجری کے وسط میں ایک عرضداشت لکھی اس میں محمد قلی قطب شاہ کا ذکر ہے، یہ عرضداشت اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ ہندستان اور بیرون ہندوستان کے اکثر سیاسی و علمی و ثقافتی واقعات پر مشتمل دستاویز ہے اور ہندوستان کے دور وسطیٰ کے طالب علم کے لئے اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے، انشائے فیضی کے متعدد نسخوں میں یہ عرضداشت منقول ہے، ادھر ڈاکٹر ارشد نے اس کو مرتب کر کے مجلس ترقی ادب لاہور سے ۱۹۷۳ء میں شائع کر دیا ہے، اس میں پانچ لطیفے ہیں: لطیفۂ اول: چھ عرضداشت پر مبنی ہے جو اکبر بادشاہ کو لکھی گئی ہیں، انھیں میں دوسری عرضداشت میں محمد قلی قطب شاہ کا ذکر موجود ہے، اس کا اردو ترجمہ شروع میں دیا جا چکا ہے، اصل فارسی یہ ہے:

۱۔ اس کتاب میں حیدر آباد کا نام موجود نہیں اور موجود ہوتا کیوں کر اس لیے کہ فیضی کی وفات ۱۰۰۴ھ میں ہو گئی اور اس وقت تک حیدر آباد وجود میں نہیں آیا تھا، مطبوعہ انشائے فیضی کی فہرست میں حیدر آباد تھا ہے لیکن وہ مقدمہ یا حاشیہ میں مرتب کی طرف سے اضافہ ہے، اصل متن میں نہیں۔

"محمد قلی قطب الملک تشیع دارد و معمورہ ساختہ و عمارات پرداختہ بھاگ نگر نام، و بنام بھاگ متی کہ فاحشہ کہنہ و معشوقۂ قدیم اوست، بنا کردہ" (ص ۱۰۷)۔

ان چھ عرضداشتوں میں سب سے طویل عرضداشت یہی ہے جو ص ۹۷ تا ۱۴۵ پھیلی ہوئی ہے، یہ عرضداشت دربار اکبری میں چھپ چکی ہے اور ص ۳۹ تا ۱۴۷ تک حاوی ہے، مولانا شبلی شعر العجم ج ۳ میں اس کے ضروری اقتباسات مع اس کی اہمیت کے ص ۳۹ تا ۴۲ درج کر چکے ہیں، ان کے علاوہ علامہ آزاد بلگرامی نے سرو آزاد میں فیضی کی سفارت اور عرضداشت کا ذکر اس طرح کیا ہے:

شیخ فیضی وقتیکہ از درگاہ اکبری بہ سفارت برہان شاہ والی احمد نگر مامور شد، در عریضۂ خود از احمد نگر بہ اکبر پادشاہ می نویسد کہ در احمد نگر دو شاعر خاکی نہاد و صوفی مشرب اند و در شعر رتبۂ عالی دارند الخ (ص ۳۲)

دوبارہ پھر لکھتا ہے:

شیخ فیضی در عریضۂ خود از احمد نگر بہ اکبر پادشاہ بر می نگارد کہ مولانا ظہوری نقل کرد کہ روزے در باغ یکی از شرفاے کہ معتلہ مجمعی بود اقسام مردم برکنار حوض نشستہ صحبتے داشتند الخ (ص ۳۶)

یہ دونوں اقتباس انشای فیضی مطبوعہ لاہور کے ص ۱۳۵ اور ۱۳۷ پر موجود ہیں۔

ان تفصیلات سے یہ بات مسلم ہو گئی کہ فیضی نے احمد نگر سے جو عرضداشت اکبر کی خدمت میں بھیجی تھی اس میں یہ اطلاع تھی کہ محمد قلی قطب شاہ کی محبوبہ بھاگ متی اور ان کے نام پر بھاگ نگر آباد کیا گیا تھا، یہ اطلاع جو ایک سفیر اپنے بادشاہ کے پاس بھیجتا ہے دوسرے ذرائع سے حاصل کی ہوئی اطلاع سے زیادہ اہم ہوتی ہے، شروانی صاحب تاریخ کے تقاضے سے پوری طرح واقف تھے، اس لیے اس واقعے کی اہمیت کا جتنا ان کو احساس ہوگا ہم سب کو نہیں ہو سکتا، اسی بنا پر ان کا اصرار یہ تھا کہ دراصل عرضداشت میں محمد قلی قطب شاہ کا ذکر ہی نہیں تھا، اب جبکہ وثوق سے معلوم ہے کہ اس میں وہ واقعہ شامل ہے، اگر ان تک یہ اطلاع پہنچ جاتی تو یقیناً وہ اپنے بیان پر اصرار نہ کرتے۔

یہ بات تو احمد نگر کی عرضداشت کی نسبت سے تھی، شمالی ہندوستان کے مورخوں پر جو اعتراض ہوئے ہیں وہ بھی بڑی حد تک بے بنیاد ہیں، اس وجہ سے شروانی صاحب کا فیصلہ قابل قبول نہیں۔ فیضی اور

نظام الدین بخشی کے بیان کا بنیاد پر بھاگ متی اور بھاگ نگر کے واقعے ناقابل رد ہیں۔

(۴) شروانی صاحب فرماتے ہیں کہ فرشتہ اور دوسرے دکنی مورخین کے بیانات بے بنیاد ہیں:

"واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام کہانی فرشتہ (محمد قاسم فرشتہ، مؤلف تاریخ فرشتہ) کے ذہن رسا کا ایک کرشمہ ہے، اسے اصلی یا فرضی جنسی کیفیات کے بیان کرنے میں بڑا لطف آتا ہے، دکن کی تاریخ میں اس نے اس فن میں کمال ہی پیدا کر دیا ہے۔ اس نے فیروز شاہ بہمنی کی جنسی کارگزاریاں دکھانے میں جو انتہا کی ہے اس کا ثانی ملنا ناممکن ہے، اسے باغ نگر کا لفظ ملا، اس سے اس نے بھاگ نگر نکالا، جب اس کو احساس ہوا کہ بھاگ نگر بغیر بھاگ متی کے لطف سے خالی ہوگا تو اس نے نہ صرف بھاگ متی کی تخلیق کی بلکہ اس کی اہمیت بڑھانے کے لیے ایک ہزار سوار بھی اس کے جلو میں رکھ دیے، فرشتہ کے زمانے سے لیکر مغل تاریخوں کی قلم بندی تک کوئی جانتا بھی نہ تھا کہ بھاگ متی تھا کون تھی یا کہاں تھی؟ جب مغل آئے تو انھوں نے یہ دیکھ کر کہ کہیں ایک بازاری عورت کا ذکر ہے اور اس کے نام پر ایک شہر بھی آباد کیا گیا ہے تو انھوں نے قطب الملک کے نام کو نیچا دکھانے کے لیے اس کے ماتھے پر ایک اور کلنک کا ٹیکا لگانے کی کوشش کی، اس کوشش کو غلام حسین کے ہاتھوں رنگ پہنچی مگر یہ رنگ نہایت کمزور ثابت ہوئی اور فاحشہ بھاگ متی کے رومان میں جو لطف تھا اسے انیسویں صدی اور اسکے بعد کے مورخین نے ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔" (ص ۱۶۰)

اس بیان کی بنیاد ان چار چیزوں پر ہے:۔

۱۔ فرشتہ کو جنسی کیفیت کے بیان میں بڑا لطف آتا ہے، اس لیے اس نے بھاگ متی کے قصے کی تخلیق کی۔ اس نے باغ نگر سے بھاگ نگر کر لیا۔

۲۔ مغل مورخین نے اس قصے پر بڑی عمارت تیار کی۔

۳۔ بعد کے دکنی مورخین نے اس پر اور بھی اضافہ کیا۔

۴۔ ماہ نامے کے مؤلف نے اس کی تردید کی مگر وہ زیادہ اثر انداز نہ ہوئی۔

اس سلسلے میں میرے معروضات یہ ہیں:

بھاگ متی کے گڑھنے کا الزام محمد قاسم فرشتہ پر لگایا گیا ہے، اس کی تاریخ ۱۰۱۰ہجری میں لکھی

گئی۔ اور اس سے ۱۶ سال قبل فیضی بھاگ متی اور بھاگ نگر کا ذکر کر چکا ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ فیضی کا بیان ایک سفیر کا بیان ہے، وہ ہر طرح کے شک و شبہ سے پاک ہے، تو بیچارے فرشتہ پر جس نے ۱۶ سال بعد یہ بات لکھی ہے، یہ الزام کیوں کر عائد ہوتا ہے، فرشتہ پر مزید جنسی کیفیات کے خواہ مخواہ بیان سے لذت اندوزی کا بہتان غلط ہے، یہ تو فیضی کے بیان کا مضمون رہا، نظام الدین بخشی کی طبقات اکبری جس میں بھاگ متی اور بھاگ نگر کا واقعہ مذکور ہے، فرشتہ سے ۱۵ سال قبل کی تالیف ہے، یہ مزید اس بات کا مظہر ہے کہ فرشتہ پر بھاگ متی کے قصے تراشی کا الزام بیجا ہے۔

باغ نگر سے بھاگ نگر کی تبدیلی کا الزام بھی بے بنیاد ہے، اس لیے کہ اول باغ نگر رفیع الدین شیرازی کے تذکرۃ الملوک میں درج ہے، جو فرشتہ سے مقدم نہیں، دوم یہ کہ رفیع الدین نے شہر کا نام باغ نگر نہیں لکھا بلکہ یہ کہ گویا تمام شہر یک باغ است، سوم جب فیضی ۱۶ سال قبل اور نظام الدین ۱۵ سال قبل بھاگ نگر نام لکھتے ہیں اور اس کو بھاگ متی کی طرف منسوب کرتے ہیں تو باغ نگر محض افسانہ تراشی ہے، اور کچھ نہیں۔

فرشتہ پر ایک الزام یہ ہے کہ اس نے بھاگ متی کے جلو میں ایک ہزار سوار کھڑے کر دیے، یہی بیان نظام الدین بخشی ۱۵ سال قبل دے چکا ہے، بیچارہ فرشتہ بے گناہ ہے۔

شیروانی صاحب کے دوسرے اور تیسرے اعتراض بھی بے حقیقت ہیں، بھاگ متی اور بھاگ نگر کے وجود کے بارے میں جب شبہ نہیں ہے تو مغل مورخین قابل الزام اور نہ دکھنی مورخین، ممکن ہے جزئیات میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہو، لیکن اصل بات تو اپنی جگہ باقی ہی ہے۔

ماہ نامہ میں بھاگ متی کے عشق کی داستان فرضی بتائی گئی ہے، مگر چونکہ نہ اس واقعہ کے سوا دو سال بعد کی تاریخ ہے اس لیے تواتر کے ساتھ مرقوم واقعہ کی تردید اس کے بیان سے نہیں ہو سکتی، لطف کی بات یہ ہے ماہ نامے میں بھاگ نگر کے وجود سے انکار نہیں بلکہ اس کی نسبت بھاگ متی کے بجائے بھاگ رتی کے نام پر جو محمد قلی کی ماں تھی، بتائی ہے۔

شیروانی صاحب نے حیدرآباد کے وجود کے سلسلے میں ۱۰۱۲ ہجری کا ایک سکہ پیش کیا ہے جس پر اس شہر کا نام درج ہے، یہ سکہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ یہ شہر ۱۰۱۲ ہجری میں وجود میں آچکا تھا لیکن اس سے اس نظریہ کی تردید نہیں ہوتی کہ اس تاریخ سے قبل بھاگ نگر شہر بھاگ متی کے نام پر آباد ہو چکا تھا۔

۵۔ یورپی سیاحوں نے باغ نگر لکھا ہے جو رفیع الدین کے بیان پر مبنی ہے۔

شروانی صاحب نے یورپی سیاحوں کے جو اقتباسات دیے ہیں ان میں برنیر اور تھیونو کے یہاں BAGNAGAR ہے، لیکن ٹیورنیر کے یہاں BAGNAGAR کی تشریح GARDEN OF NAGAR ہے، جو یقیناً غلط ترجمہ ہے، دراصل اس کا منشا CITY OF GARDEN ہوگا، ان سیاحوں کے یہاں کا فقرہ باغ نگر اضافت مستوی نہیں مقلوب ہے، شروانی صاحب کا قیاس ہے کہ ان کے بیانات کی بنیاد رفیع الدین شیرازی کا وہ جملہ ہے جس میں لکھا ہے کہ تمام شہر باغ ہے، وہاں نہ باغ نگر کا فقرہ ہے اور نہ یہ کہ شہر کا نام باغ نگر ہے، بہر حال فیضی کے بیان کی روشنی میں بھاگ نگر یا بھاگ متی کے وجود پر شک نہیں کیا جا سکتا۔

۶- شروانی صاحب کے نزدیک محمد قلی قطب شاہ کی کم عمری کا عشق مشتبہ ہے، ان کا خیال ہے کہ اگر فرشتہ کی داستان پر اعتماد کیا جاتا ہے تو ایک عجیب صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ محمد قاسم فرشتہ کے بقول تخت نشینی کے وقت محمد قلی قطب شاہ کی عمر ۱۴ سال کے بجائے ۱۲ سال کی تھی، پرانا پل ابراہیم قطب شاہ کی وفات سے ۲ سال قبل ۹۸۶ھ میں مکمل ہوا، اور اگر اس کی تعمیر میں دو تین سال لگے ہوں تو معاشقے کی ابتدا میں محمد قلی قطب شاہ کی عمر سات آٹھ سال سے زیادہ نہ ہوگی۔

__________ کسی اور معاملے میں فرشتہ کا قول جب قابل تسلیم نہیں تو محمد قلی کی عمر ہی کے معاملے میں اس کے بیان کو اتنی اہمیت کیوں دی جائے جب کہ ہمیں معلوم ہے کہ تاریخ محمد قطب شاہ ۱۰۲۰ ہجری میں وفات کے وقت سلطان محمد قلی کی عمر ۴۹ سال کی تھی! اس اعتبار سے پیدائش کی تاریخ ۹۷۱ھ ہوئی، پس ۹۸۶ ہجری میں پل بننے کے وقت شاہزادہ ۱۵ سال کے لگ بھگ رہا ہوگا۔ ۱۴ سال کے لڑکے کا عشق بعید از قیاس نہیں، اگر اتنی کم عمر کا عشق قابل قبول نہیں تو ۱۶ - ۱۷ سال کی عمر کی شادی کیوں کر تسلیم کی جا سکتی ہے۔ محمد قلی کے بہنوئی ابراہیم قلی کی شادی شاہ میر کی لڑکی سے ۹۹۱ھ میں ہوئی، اس وقت محمد قلی کی عمر ۲۰ سال سے کم رہی ہوگی، لڑکی کی عمر یقیناً کافی کم رہی ہوگی، اور یہ بھی قابل ذکر بات ہے کہ یہ لڑکی کی دوسری شادی تھی، اس کی پہلی شادی اس کے بڑے بھائی شاہ قلی سے ہو چکی تھی۔ خلاصۂ گفتگو یہ کہ ۷ - ۸ سال کی عمر میں معشوق کی روایت زیادہ وزن نہیں رکھتی۔

میری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ فیضی کے واضح بیان کے بعد بھاگ متی اور بھاگ نگر کے واقعہ کی

صداقت ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک ہو جاتی ہے۔ یہ سرکاری بیان نہایت معتبر ہے جو ایک سفیر کے قلم سے اس کے آقا کی خدمت میں پیش ہوا تھا' اور اس بیان کو جب طبقات اکبری کے بیان سے ملاتے ہیں تو یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ ۱۰۰۲ ہجری تک نئے شہر کا نام بھاگ نگر ہی تھا۔ فرشتہ، عبدالباقی نہاوندی مؤلف ماثر رحیمی اور خافی خاں مؤلف منتخب اللباب وغیرہ مورخین کے بیان سے صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ بعد میں بھاگ نگر حیدرآباد کہلایا۔ یہ تاریخی حقائق ہیں جن سے انکار ممکن نہیں۔ البتہ یہ چیز جانچنے کی ہے کہ نام کی یہ تبدیلی یعنی بھاگ نگر سے حیدرآباد کب عمل میں آئی۔ شروانی نے ۱۰۱۲ ہجری کا سکہ پیش کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس تاریخ میں شہر حیدرآباد کہلاتا تھا۔ بخوبی امکان ہے کہ اس تاریخ سے قبل ہی یہ تبدیلی وجود میں آچکی ہو، اگر ماثر رحیمی کی یہ روایت تسلیم کر لی جائے کہ حیدرآباد نام تجویز ہونے میں مرزا محمد امین میر جملہ شہرستانی کو دخل تھا تو ۱۰۱۰ھ کے قبل یہ نام وجود میں نہ آیا ہوگا اس لیے کہ میر جملہ اسی سال دربار قطب شاہی میں باریاب ہوا تھا' اور ایک سال بعد میر جملہ مقرر ہوا۔ قرین قیاس یہی ہے کہ میر جملگی کے بعد یعنی ۱۰۱۱ اور ۱۰۱۲ کے درمیان بھاگ نگر کا نام حیدرآباد تجویز ہوا ہوگا۔ بھاگ متی اور بھاگ نگر کے سلسلے میں شروانی صاحب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ درخور توجہ نہیں۔

••

(یہ مقالہ خدابخش لائبریری میں پڑھا گیا)

ضمیمہ — ۱

ڈاکٹر ظہیر نجم الدین علی خاں
حیدرآباد

قصہ بھاگ متی

حیدرآباد میں جناب احمد خان صاحب درویش بیان فرماتے ہیں کہ انھوں نے بھاگ متی کے خاندان والوں سے ملاقات کی ہے۔ وہ مسلم ہیں ان لوگوں کے بیان کے مطابق بھاگ متی بھی مسلمان ہو گئی تھی۔ مختلف وجوہات تھیں جن کی وجہ سے یہ لوگ اپنے آپ کو چھپاتے رہے۔ یہ لوگ نسلاً راجپوت تھے، نقل مقام کر کے گولکنڈہ آ گئے تھے اور موضع چچلم میں رہا کرتے تھے۔

درویش صاحب کے بیان کے مطابق انھوں نے ان لوگوں کے پاس ایک تانبے کی تختی دیکھی ہے جس پر بھاگ متی کے باپ، ماں اور بہن کے نام درج ہیں۔ ان لوگوں کا پتہ بتانے سے درویش صاحب تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہیں۔

بھاگ متی رقاصہ تھی یا محبوبہ تھی اس کے متعلق صحت کے ساتھ کہنا مشکل ہے لیکن یاقوت پورہ بڑا بازار کے قریب اٹی بن کے مشرق میں ایک مقام کیوڑہ بن کہلاتا تھا، جہاں نالا بہتا تھا اور کیوڑے کے درخت بکثرت تھے۔ اس کے بیچ میں ایک مقبرہ تھا، یہاں سانپ بہت زیادہ پائے جاتے تھے اس لیے اُدھر کا سارا علاقہ ویران گیا تھا۔

جناب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب شکیب کے بیان کے مطابق یہی مقبرہ بھاگ متی کا ہے۔ دلیل میں موضع کا نام، اس کی دیواروں اور کمانوں کی قطب شاہی بناوٹ کو وہ بیان فرمایا کرتے تھے انھوں نے "گولکنڈہ اور ایران کے سیاسی تعلقات" پر کام کیا ہے۔ موصوف کے مقالے کی تیاری کے وقت راقم الحروف نے ان کے پاس ایک زیراکس کاغذ دیکھا تھا جس پر ایک مہر کا نشان تھا اور تحریر تھا

قاضی عساکر و بھاگ نگر

قاضی ظہیر الدین

یہ وہی قاضی صاحب ہیں جن کو عبداللہ قطب شاہ نے محل کی بیگمات کے ہمراہ ایران روانہ کیا تھا۔

ڈاکٹر حمیرہ جلیلی نے قطب شاہی دور کی مثنوی کے چند اقتباسات حاصل کیے ہیں جس میں بھاگ متی کا ذکر موجود ہے لیکن پھر بھی یہ کہنا مشکل ہے کہ بھاگ متی کی حیثیت کیا تھی۔

بھاگ نگر کے متعلق قاضی صاحب کی مہر جہاں بھاگ نگر ہونے کا یقین دلاتی ہے وہیں مقام و محل بھی بیان کرتی ہے۔ فوج کو جب باہر بھیجنا ہوتا اس وقت اس کو ایک جگہ جمع کیا جاتا تھا، یہ مقام چچلم سے لگا ہوا چار مینار سے شرق کی جانب چار کیلو میٹر کے فاصلے پر ہے جہاں اب درگاہ بر بنہ شاہ دیگر قبرستان ہیں اور بستیاں قائم ہیں۔ بہت ممکن ہے بھاگ نگر بھی اسی چھاونی سے ملحق کوئی موضع رہا ہو۔

••

Prof. H. K. SHERWANI

(HISTORY OF MEDIEVAL DECCAN)

VOLUME I pp.457 59

ضمیمہ ۲

Appendix

THE BHĀGMATĪ LEGEND

The problem connected with a *demi-mondaine*, Bhāgmati, supposed to have been a favourite of Muḥammad-Qulī Quṭb Shāh, has been under discussion almost ever since the Sulṭān's reign, and while some of our chronicles are wholly silent about her, others set her on the pinnacle of the Sulṭān's amours, liken her to the most prominent personages of the reign, and aver that the new capital was originally named Bhāgnagar after her. Before examining the problem it would be well to state the story as it appears in some of our chronicles :—

(1) The name of the woman as well as of the city supposed to be named after her appears for the first time in a petition sent by Faizī, the Imperial Resident at Burhānpūr and Ahmadnagar, some time between 1590 and 1594, the period when he was in the Deccan. He says sneeringly that "Quṭbu'l-Mulk" was "steeped in Shī'ism." He calls Bhāgmati "an old prostitute" and mistress of "Aḥmad-Qulī" (*sic.*), and says that he built a city Bhāgnagar after the old whore (*fahishā-i kuhnā*).[1]

(2) About the same time Niẓāmu'd-dīn wrote his *Tabaqāt-i Akbar Shāhī*, in which he has just a few lines for Muhammad-Qulī (whom he incidentally calls Muḥammad 'Alī). In these lines he recounts the love of the Sulṭān to a "prostitute" Bhagmasi (*sic.*) and the founding of a city, Bhāgnagar after her.

(3) Writing in 1018/1609-10, Ferishta also calls the woman "*fahisha*" or whore, and says that she was attended by one thousand horsemen whenever she went to Golkonda. "The Sulṭān called his new capital Bhāgnagar at first but later changed it to Hydarabad."

(4) 'Abdu'l-Bāqī's *Ma'athir-i Rahīmī*, completed in 1025/1616, and Khāfī Khān's *Muntakhabu'l-Lubāb*, say in so many words that they have relied on Ferishta for the history of the Deccan.

Let us now subject these narratives to a close examination. The originator of the story, Faizī, never set his foot beyond Ahmadnagar, and all that he mentions in his despatch is based on just hearsay. He has an inherent dislike for the rulers of the Deccan whom he never mentions with royal titles. The solitary sentence in which Muḥammad-Qulī is named is full of sneers and abuses. The Sulṭān's qualities of head and heart are ignored, and just one aspect of his character brought out, *i.e.*, his liaison with a *fahishā-i Kuhnā* ("old whore"), who incidentally does not appear among his seventeen amours who have been honoured in his odes.[2]

1. See *Waqi'at-i Shaikh Faizī.*, *E & D*, VI, p. 147; *Tab*, 444; *Fer*, II, 173.
2. It is interesting to note that according to *E & D*, VII, 147 "Faizī cannot be considered a historian, so a memoir of his life would be out of place in this work.....All these letters (of Faizī to the Emperor) were translated by Lieut. Pritchard, and it is to be regretted that they were not more worthy of the task."

The author of the *Tabaqāt-i Akbar Shāhī* was the first to gloss over the story by adding the episode of a thousand horsemen. Coming to Ferishta, it is surprising that the only portion of his monumental work, the *Gulshan-i Ibrāhīmī* about which he is diffident, is that describing the history of Tilang, and he makes clear his own shortcomings so far as that history is concerned. It is no wonder that he has made serious mistakes in the few pages he has devoted to it. Thus he does not give the correct date of the Sulṭān's accession. He makes the envoy of the Shāh of Persia wait for the acceptance of the proposal of the marriage of the Shāh's son with Ḥayāt Bakhshī Bēgam, although she was married to the Sulṭān's nephew in the envoy's presence, and finally he is so keen on the Bhāgmatī story that he calls the capital Bhāgnagar in 1018/1609-10 although we have a number of coins struck at the *Hydarabad* mint as early as 1012/1603-4, and he himself makes the Quṭb Shāhī army fly to *Hydarabad* after the battle of Sōnpat in 1005/1596-7.

Historical appraisal

We now come to the objective evidence regarding the story. The semi-official chronicle, the only near contemporary chronicle written in Hydarabad, *Tārīkh Muhammad Quṭb Shāh*, completed in 1026/1616, does not have even a passing reference to Bhāgmatī or Bhāgnagar.[1] Some years later, in 1054/1644, Niẓāmu'd-dīn Aḥmad Sa'īdī wrote *Ḥadīqutu's-Salāṭīn* which also gives a fairly full description of the new capital and calls it "Ḥaidarābād" all along. About half a century later 'Alī b. Ṭaifūr Busṭāmī wrote *Ḥadā'iqu's-Salāṭīn* in which a short history of the founding of the city is related, but there is no mention of Bhāgmatī or Bhāgnagar.[2]

Then we have the direct evidence against the story in the Sulṭān's *Kulliyāt*. It contains odes to his seventeen mistresses ranging from one to five, but there is not one in honour of Bhāgmatī who is supposed to be the most favoured of all. There is not an iota of evidence to support the proposition that Bhāgmatī became Ḥaidar Maḥal "after her marriage with the Sulṭān," or that any grave of the woman exists in the royal necropolis at Golkonda.[3] In the same way the new capital is mentioned three times in the *Kulliyāt* and not once is it called Bhāgnagar.[4] An orthodox Shī'ah that the Sulṭān was, and with a Shī'ah divine like Mīr Mu'min, the architect of Ḥaidar-ābād, by his elbow, it was only fitting that the new capital be named after Ḥaidar, the second name of 'Alī.

1. *QS*, 249-53.
2. *Ḥadā'iq*, MSS. Sālār Jung, Tārīkh Fārsī, 216, fol. 116 b.
3. Not merely that; Bhāgmatī is also said to be the same person as Mushtarī, the Princess of Bengal, in Wajhī's romance! See Zor: *Muhammad-Qulī Quṭb Shāh*, Introduction, pp. 85-7. The assertion that Bhāgmatī's grave is in the mausoleum of *Kulthūm Bēgam* is not correct; see *EIM*, 1915-16, p. 34.
4. The epithets used are "My City" "City of Ḥaidar" and "Ḥaidarnagar."

Numismatic evidence also points to the same direction. As has been mentioned above, we have coins struck in 992/1584 at Golkonda and others struck in 1012/1603-4 at "Dāru's-Salṭanat Ḥaidarābād;" but there is no coin which was minted at "Bhāgnagar."

Revival of the Legend

The legend was as good as dead about the end of the Quṭb Shāhī dynasty, but, perhaps in order to spite the Quṭb Shāhīs it was revived during the early Āṣaf Jāhī period. No sooner did it occupy the stage than it was refuted in Ghulām Ḥusain Khān's *Māhnāma*, compiled in 1225/1810. As time passed people began to take interest in the erotic rather than the quasi-historical part of the story, and a sneering sentence of Faiẓī grew into a paragraph, the paragraph into a section and the section into chapters! The mythical Bhāgmatī was created afresh at the end of the eighteenth century and became a tradition with little historical evidence to support her.[1]

The Solution

We have, however, to remember that European travellers who came to Hydarabad about this time speak both of Bhāgnagar and Hydarabad, but, except for Tavernier, they do not give the derivation of the name. Bernier, who was twice in the capital, mentions "Bhāgnagar" twice; Thevenot, who was here in 1666, gives the capital both the names Hydarabad and Bhāgnagar, the former being the "official name" and the latter the name used by "the common people." It is Tavernier who gives the clue to the derivation of the name and says that:

> "Bagnagar was founded by the grandfather of the present King ('Abdu'l-lāh). Here the King had very fine gardens...Bagnagar or the Garden of Nagar."[2]

Tavernier thus asserts that the name Bāgnagar stands for the City of Gardens or Bāghnagar, because the new capital was replete with gardens and groves. In a way he repeats what Rafī'u'd-dīn Shīrāzī had said sixty years previously, that

> "The whole city was just one large garden,"[3]

Bāghnagar became Bhāgnagar at the hands of the sarcastic who chafed at the name, or the romantic who were reminded of the mythical demi-mundane Bhāgmatī.

1. We must remember that there is no mention of Bhāgmatī or Bhāgnagar in any of the contemporary Telugu works.
2. Bernier, *op. cit.*, 65, 67; Thevenot, *op. cit.*, 131, 137, Tavernier, *op. cit.*, 132.
3. *Tadhkira*, fol. 61 b.

ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ
شعبہ لسانیات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

شمالی ہند میں اردو زبان کا آغاز اور ابتدائی ارتقا

ابتک دستیاب متون کے حوالوں سے

(۱)

اردو کے آغاز وارتقا پر گفتگو کرنے سے قبل میں دو باتیں نہایت واضح الفاظ میں عرض کر دینا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ اردو کی پیدائش کے ذمہ دار نہ تو مسلمان فاتحین ہیں اور نہ یہ کوئی کھچڑی زبان ہے۔ ان دونوں باتوں کی وضاحت میں اس لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ اکثر یہ کہا جاتا کہ اردو مسلم حکمرانوں کی بنائی ہوئی زبان ہے، نیز یہ مختلف زبانوں کا مرکب ہے۔ یہ دونوں باتیں اردو کی لسانی تاریخ کو مسخ کر دیتی ہیں، اس لئے ان کی تردید ابتدائے گفتگو ہی میں ضروری سمجھی گئی۔

اردو کی پیدائش ذمہ دار اگر مسلمان فاتحین ہوتے تو انھوں نے اپنے عروج واقبال کے زمانے میں جن جن ملکوں کو فتح کیا تھا، وہاں کی زبان آج اردو ہوتی۔ مسلمانوں نے ترکی، ایران اور اسپین فتح کیا، چین اور روس گئے، انڈونیشیا، ملیشیا اور بنگلہ دیش میں وہ آج اکثریت میں ہیں اور وہاں ان کی اپنی حکومتیں قائم ہیں، لیکن ان تمام ملکوں میں اردو نام کی کوئی شے وجود میں نہیں آئی۔ لہٰذا ہندوستان ہی اردو کی پیدائش کا ذمہ دار مسلمانوں کو کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے۔ اردو کی پیدائش کے حقیقی ذمہ دراصل اُس دور کے شمالی ہند کے وہ مقامی باشندے ہیں جن میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ ان مقامی باشندوں میں کچھ نومسلم بھی تھے۔ مسلمان جب فاتح کی حیثیت سے یہاں آئے تو انھوں نے دھیرے دھیرے یہاں کی مقامی بولیوں کی اہمیت کو سمجھا۔ ان کا نام ہندی، اور ہندوی، تجویز کیا، اور پھر ایک مدت کے بعد انھیں سیکھنے بھی لگے۔ دھیرے دھیرے اس میں ادب پیدا ہونے لگا اور اسے ایک شستہ وشائستہ اور مہذب زبان کا مرتبہ حاصل ہو گیا۔

دوسری بات جس سے مجھے اتفاق نہیں وہ بعض عالموں کا یہ بیان ہے کہ اردو ایک کھچڑی زبان ہے۔ اردو کو جو لوگ ایک کھچڑی زبان تصور کرتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ گویا چڑیا لائی دال کا دانہ،

پنڈت لایا چاول کا دانہ اور دونوں نے مل کر کھچڑی پکائی۔ اگر اردو کو چند فیصد عربی، فارسی الفاظ کی شمولیت کی وجہ سے کھچڑی زبان کہا جا سکتا ہے تو دنیا کی کون سی ایسی زبان ہے جو کھچڑی نہیں۔ تامل، تلگو اور کنڑ میں سنسکرت کے بے شمار الفاظ شامل ہیں۔ انگریزی میں یونانی، لاطینی، فرانسیسی اور جرمنی زبانوں کے الفاظ کافی تعداد میں ملے ہوئے ہیں۔ فارسی اور ترکی نے عربی زبان سے بے شمار الفاظ مستعار لیے ہیں تو کیا یہ زبانیں کھچڑی کہی جائیں گی۔ ظاہر ہے اس کا جواب نفی میں ہوگا، یعنی یہ کھچڑی زبانیں نہیں کہی جائیں گی۔ یہ دونوں باتیں جن کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے آگے کی گفتگو میں اور واضح ہوتی جائیں گی۔

اب اصل موضوع پر غور کرنے کیلئے میں تین سوالات زیر بحث لاؤں گا:

(۱) اردو کب پیدا ہوئی۔ (۲) اردو کہاں پیدا ہوئی، اور (۳) اردو کیسے پیدا ہوئی۔

لیکن ان سوالات پر غور کرنے سے پہلے آیئے ذرا ہند آریائی کی تاریخ پر غور کرلیں۔ جس سے اردو زبان کا براہ راست تعلق ہے۔

(۲)

ماہرین لسانیات کا خیال ہے کہ دنیا میں تقریباً سات ہزار زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض زبانیں آپس میں مماثلت رکھتی ہیں اور بعض زبانیں دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ جن زبانوں میں مماثلت پائی جاتی ہے انھیں زبان کے عالموں نے ایک لسانی گروہ میں رکھا ہے، جسے لسانی خاندان (LANGUAGE FAMILY) کہتے ہیں۔ اس طرح دنیا میں بولی جانے والی زبانوں کو کئی لسانی خاندانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان میں سب سے بڑا لسانی خاندان ہند یورپی یا (INDO-EUROPEAN) کہلاتا ہے۔ اس خاندان السنہ میں ہندوستان، پاکستان، ایران، افغانستان اور یورپی ممالک کی بیشتر زبانیں شامل ہیں۔ یہ زبانیں تاریخی اور لسانیاتی اعتبار سے آپس میں ہم رشتہ ہیں۔ ہند یورپی لسانی خاندان کی گیارہ شاخیں یا ذیلی خاندان ہیں جن میں ہند آریائی جس کا تعلق ہندوستان میں بولی جانے والی زبانوں سے ہے، ایک نہایت اہم اور ممتاز شاخ ہے۔

ہندوستان میں ہند آریائی زبانوں کے ارتقا کی تاریخ ۱۵۰۰ قبل مسیح تسلیم کی گئی ہے۔ یہ آریوں کی ہندوستان میں آمد کی تاریخ ہے۔ ہند آریائی زبانوں کے آغاز و ارتقا کا سہرا انھیں آریوں کے سر ہے جو وسطی ایشیا میں اپنا وطن ترک کرکے ایران و افغانستان کا سفر طے کرتے ہوئے ۱۵۰۰ قبل مسیح میں ہندوستان کے شمال مغربی خطے میں نمودار ہوتے ہیں۔ وقت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ان کی زبان میں بھی تبدیلی واقع ہوتی گئی

اور ان کے قیامِ ہندوستان کے دوران دھیرے دھیرے ایک ایسی زبان پروان چڑھنے لگی جسے سنسکرت کا نام دیا گیا۔ سنسکرت کا ارتقا پورے شمالی ہندوستان میں ایک ہزار سال یعنی ۱۵۰۰ قبل مسیح سے لیکر ۵۰۰ قبل مسیح تک جاری رہا۔ یہ دور ہند آریائی زبان کے ارتقا کا قدیم دور کہلاتا ہے۔ اس دور میں جیسے جیسے آریوں کا اقتدار شمال مغربی خطے سے وسطی خطے اور پھر مشرقی خطے کی طرف بڑھتا گیا، ان کی زبان میں بھی مغائرت پیدا ہوتی گئی چنانچہ علاقائی خصوصیات کی بنیاد پر آریوں کی زبان کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اُدیچیہ جو شمال مغربی خطے کی بولی تھی آریوں کی معیاری بولی کہی جاتی تھی۔ پراچیہ مشرقی خطے میں رائج تھی لیکن معیاری بولی سے کافی مختلف تھی اور غیر معیاری خیال کی جاتی تھی۔ اُدیچیہ اور پراچیہ کے بیچ کی بولی مدھیہ دیش کہی جاتی تھی جو نہ معیاری تھی اور نہ غیر معیاری۔ مدھیہ دیش کا علاقہ دہلی نواحِ دہلی اور مغربی یوپی کا علاقہ تھا۔

۵۰۰ قبل مسیح تک پہنچتے پہنچتے سنسکرت زبان نے جمود کا شکار ہو کر دم توڑ دیا کیوں کہ اس کا استعمال اعلیٰ ادبی اور مذہبی مقاصد کے لیے ہونے لگا تھا، اور یہ ایک مخصوص طبقے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ علاوہ ازیں پانِنی جیسے قواعد نویسوں نے اسے قواعد کی زنجیروں میں جکڑ کر ایک [illegible] زبان بنا دیا تھا۔ چنانچہ عوام سے اس کا رشتہ منقطع ہوتا گیا۔ عوام کی بول چال کی زبان اگرچہ سنسکرت کی ہی بدلی ہوئی شکل تھی، لیکن یہ تلفظ کے لحاظ سے آسان اور صرف و نحو اور قواعد کے اعتبار سے ایک سادہ و سہل زبان تھی۔ آگے چل کر اس زبان کو مصنوعی زبان سنسکرت کے مقابلے میں فطری زبان یعنی "پراکرت" کہا گیا۔ پراکرت کے اولین نمونے پالی اور اشوک کے کتبوں کی زبانیں ہیں۔ یہ کتبے مشرق میں بنگال اور بہار سے لیکر مغرب میں سندھ تک پائے گئے ہیں۔ انھیں کتبوں سے ہندوستان میں تحریر کا ارتقا ہوتا ہے، ورنہ اس سے پہلے یہاں لکھنے کا رواج نہیں تھا۔ دھیرے دھیرے پراکرتوں نے بھی ادبی شکل اختیار کرنا شروع کر دی اور عوام سے ان کا رشتہ ٹوٹتا گیا۔ چنانچہ قدیم ہند آریائی دور میں شمالی ہندوستان میں مغرب تا مشرق جہاں جہاں اُدیچیہ، پراچیہ اور مدھیہ دیش بولیاں رائج تھیں وہاں اس دور میں آکر پانچ ادبی پراکرتیں رائج ہو گئیں جن کے نام ہیں: "شمالی مغربی پراکرت، مہاراشٹری پراکرت، شورسینی پراکرت، ماگدھی پراکرت اور اردھ ماگدھی پراکرت۔

ان میں شورسینی پراکرت کا علاقہ وہی ہے جو قدیم ہند آریائی دور میں مدھیہ دیش کا تھا یعنی دہلی اور نواحِ دہلی کا علاقہ۔ پراکرتوں نے جب ادبی اور معیاری روپ اختیار کر لیا تو عوام کی زبان اس کا ساتھ نہ دے سکی۔ لسانی تبدیلیوں کے زیرِ اثر عوام کی زبان ادبی پراکرتوں سے اس حد تک مختلف ہو گئی یا یوں کہنا چاہیے کہ بگڑ گئی کہ اسے "بھرشٹ"

یعنی مسخ شدہ زبان کہا جانے لگا۔ بعد میں اس کا نام اپ بھرنش پڑ گیا۔ پراکرتوں کا ارتقا ۵۰۰ قبلِ مسیح تا ۶۰۰ سنہ عیسوی یعنی تقریباً گیارہ سو سال تک جاری رہا۔ ہند آریائی زبانوں کے ارتقا کا یہ دور وسطی ہند آریائی دور کہلاتا ہے۔

مغرب تا مشرق پورے شمالی ہندوستان میں جہاں جہاں پراکرتیں رائج تھیں وہاں اپ بھرنشیں بولی جانے لگیں، مثلاً ماگدھی پراکرت کی جگہ ماگدھی اپ بھرنش نے لے لی۔ اردھ ماگدھی اور شورسینی پراکرتوں کی جگہ اردھ ماگدھی اور شورسینی اپ بھرنشوں نے لے لی۔ اور اسی طرح دوسری پراکرتوں نے بھی اپ بھرنش کیلئے جگہ خالی کر دی یہ اپ بھرنشیں شمالی ہندوستان میں پورے چار سو سال یعنی ۶۰۰ سنہ عیسوی سے لیکر ۱۰۰۰ سنہ عیسوی تک رائج رہیں۔ ۱۰۰۰ سنہ عیسوی تک پہنچتے پہنچتے شمالی ہند کی زبانوں میں ایک بار پھر تبدیلی رونما ہوئی اور یہ تبدیلی جدید ہند آریائی زبانوں کے آغاز و ابتدا کا سبب بنی۔ اس موقع پر مسلمان فاتحین شمالی ہند میں داخل ہوتے ہیں۔ ہند آریائی زبانوں کے عالم اور مشہور ماہرِ لسانیات سُنیتی کمار چیٹرجی کا خیال ہے کہ اس موقع پر اگر مسلمان شمالی ہند میں داخل نہ ہوئے ہوتے تب بھی جدید ہند آریائی زبانوں کا ارتقا عمل میں آتا۔ ۱۰۰۰ سنہ عیسوی میں اپ بھرنشوں کے خاتمے کے بعد شمالی ہند میں چھوٹی چھوٹی بولیوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ شورسینی اپ بھرنش کے بطن سے دہلی اور نواحِ دہلی کے علاقوں میں کئی چھوٹی چھوٹی بولیاں پیدا ہوئیں۔ شروع میں ان میں آپس میں زیادہ فرق نہیں تھا لیکن دھیرے دھیرے یہ فرق بڑھتا گیا۔ اس وقت تک ان بولیوں کا کوئی نام بھی نہیں پڑا تھا۔ مسلمانوں نے جب شمالی ہندوستان کو فتح کیا تو ان تمام بولیوں کو جو شورسینی اپ بھرنش سے ماخوذ تھیں، ہندی اور ہندوی کا نام دیا۔ جارج گریرسن نے جب ہندوستانی زبانوں کا لسانیاتی جائزہ پیش کیا تو مسلم حکمرانوں کی تقلید میں ان بولیوں کو ہندی کہا۔ لیکن لسانیاتی خصوصیات کی بنیاد پر اس کی دو شکلیں متعیّن کیں۔ ایک کا نام مغربی ہندی رکھا اور دوسری کا مشرقی ہندی۔ مغربی ہندی میں اس نے دہلی اور نواحِ دہلی کی پانچ بولیوں کو شامل کیا، یعنی کھڑی بولی، ہریانی، برج بھاشا، بندیلی اور قنوجی۔ مشرقی ہندی میں اس نے جن بولیوں کو شامل کیا ان کے نام ہیں: "اودھی، بگھیلی اور چھتیس گڑھی"۔ جس طرح ۱۰۰۰ سنہ عیسوی کے آس پاس شورسینی اپ بھرنش کی کوکھ سے یہ بولیاں جنم لے رہی تھیں اُسی طرح بہار اور مشرقی یوپی کے علاقوں میں اردھ ماگدھی اپ بھرنش سے بھوجپوری، میتھلی اور مگھی بولیاں پیدا ہو رہی تھیں۔

(۳)

مغربی ہندی کی پانچ بولیاں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، اپنی لسانیاتی خصوصیات کی بنیاد پر دو حصّوں میں تقسیم کی گئی ہیں: "پہلی (ا، آ (ہ) کی آواز پر ختم ہونے والی بولیاں اور دوسری (ے) او (ہ) کی آواز پر ختم ہونے والی بولیاں۔

کھڑی بولی اور ہریانی کا تعلق آ (ا) پر ختم ہونے والی بولیوں سے ہے، مثلاً اسما جیسے گھوڑا، لڑکا صفات جیسے اچھا، برا۔ ضمائر جیسے میرا، تیرا، اور افعال جیسے آیا، گیا وغیرہ آ (ا) کی آواز پر ختم ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس برج بھاشا اور مرکزی ہندی کی باقی ماندہ بولیوں میں اسما، صفات، ضمائر اور افعال او (و) کی آواز پر ختم ہوتے ہیں، مثلاً گھوڑا کے بجائے گھوڑو، لڑکا کے بجائے لڑکو۔ اسی طرح اچھو، برو، میرو، تیرو، آیو، گیو وغیرہ۔ کھڑی بولی کا یہ جملہ: "میرا گھوڑا مارا گیا" برج بھاشا میں یوں ادا کیا جائے گا: "میرو گھوڑو مارو گیو"۔ یا ساون آیا کو ساون آیو کہیں گے۔

اردو نے اپنے ارتقا کے کسی بھی مرحلے میں او (و) کی آواز پر ختم ہونے والے اسما، صفات اور افعال اختیار نہیں کیے اور اس معاملے میں ہمیشہ کھڑی بولی کا تتبع کیا۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ جدید ہند آریائی زبانوں کا ارتقا ۱۰۰۰ سنہ عیسوی کے بعد سے ہوتا ہے۔ اردو بھی چونکہ ایک جدید آریائی زبان ہے اس لیے اس کے ابھار کا زمانہ بھی یہی ہے۔ ۱۰۰۰ سنہ عیسوی سے لیکر ۱۲۰۰ سنہ عیسوی تک شمالی ہند میں ہمیں جو مواد دستیاب ہوتا ہے اس میں اردو کے قدیم ترین روپ کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ اردو کی واضح شکل ہمیں ۱۲۰۰ عیسوی کے بعد سے دکھائی دیتی ہے اور یہیں سے اردو کے اصل نمونے بھی ہمیں دستیاب ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ زبان کے ماہرین اردو کے باقاعدہ آغاز کی تاریخ ۱۲۰۰ سنہ عیسوی تسلیم کرتے ہیں، مثلاً پروفیسر مسعود حسین خاں نے اُردو کے آغاز کی تاریخ ۱۱۹۳ء تسلیم کی ہے۔ جو مسلمانوں کے فتح دہلی کی تاریخ ہے۔ ۱۲۰۰ء سے لیکر ۱۷۰۰ء تک کا زمانہ قدیم اردو دور کہا جا سکتا ہے۔ ۱۷۰۰ تا ۱۸۰۰ عیسوی کے زمانے کو ہم اردو زبان کے ارتقا کا عبوری یا وسطی دور کہہ سکتے ہیں۔ کیوں کہ اس دور میں اردو اپنی قدامت کا چولا اتار کر لسانی ارتقا کے ایک نئے دور میں قدم رکھنے کی تیاری کرتی ہے۔ ۱۸۰۰ء سے اُردو کے ارتقا کا جدید دور شروع ہوتا ہے اور فورٹ ولیم کالج کی تصانیف جدید اردو کا اولین نقش قرار پاتی ہیں۔

(۴)

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ ۱۰۰۰ سنہ عیسوی کے آس پاس شمالی ہند کی زبانوں میں تیزی کے ساتھ تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ اپ بھرنشیں دم توڑ رہی تھیں اور ان کی جگہ چھوٹی چھوٹی بولیاں لیتی چلی جا رہی تھیں۔ اردو کا بالکل ابتدائی روپ اسی زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ ۱۰۰۰ تا ۱۲۰۰ عیسوی کے زمانے کو ہم پیش اُردو یعنی

(PRE-URDU PERIOD) کہہ سکتے ہیں۔ اس دور کے نمونے حسب ذیل ہیں۔

سب سے پہلے ہمیں ہیم چندر شبدانوشاسن میں زبان کے ادبی نمونے ملتے ہیں۔ اس دور کے ایک مشہور عالم ہیم چندر نے اپنی قواعد کی کتاب ہیم چندر شبدانوشاسن میں مغربی اپ بھرنش کے آخری دور کے کچھ ادبی نمونے محفوظ کر دیے ہیں۔ جن کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ اس دور کی زبان کس طرح اردو کے سانچے میں ڈھل رہی تھی۔ اس کی ایک مثال یہاں پیش ہے:

بُھلّا ہُوا ج مارِیا بَہنی مہارا کنتُ
لجّے جا مَ ت وَسیاہُ جَئی بھگّا گھر انتُ

اس نمونے میں بُھلّا، مہارا اور بھگّا علی الترتیب بھلا، میرا، اور بھاگا کی قدیم شکلیں ہیں اور ہُوا کی شکل تو بالکل ہی جدید ہے۔ اس نمونے کی دوسری اہم لسانی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں استعمال ہونے والا فعل، ضمیر اور صفت تینوں آ (ā) کی آواز پر ختم ہوتے ہیں۔ اردو کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے۔

ہیم چندر کے ان نمونوں کے بعد اس دور کا دوسرا اہم مواد ہمیں بدھ سدّھوں، ناتھوں اور گورکھ پنتھی جوگیوں سے منسوب مذہبی تخلیقات میں ملتا ہے۔ یہ لوگ شمالی ہندوستان کے ایک بڑے حصّے میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور اپنی زبان میں مختلف بولیوں کی چاشنی رکھتے تھے۔ ان کی اس مخلوط زبان کو "سدھکڑی" زبان کہا جا سکتا ہے۔ اور اس میں اردو کے ابتدائی روپ کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔

اس دور کا تیسرا نمونہ ہمیں ڈنگل اور پنگل کی شاعری میں ملتا ہے۔ راجپوتوں کی شاعری میں اس کا استعمال کثرت سے ملتا ہے۔ "راسو" جیسی طویل رزمیہ نظمیں بھی اسی زبان میں لکھی گئیں۔ چند بردائی کی طویل رزمیہ نظم پرتھوی راج راسو کے ابتدائی حصوں میں پیش اردو کے کچھ نمونے دیکھے جا سکتے ہیں۔

ان نمونوں کے علاوہ مسعود سعد سلمان کی ہندوی شاعری بھی پیش اردو کا ایک اچھا اور قابل قدر نمونہ فراہم کر سکتی تھی لیکن ان کا ہندوی دیوان دستیاب نہیں۔ سلمان کے ہندوی دیوان کا پتا ہمیں فارسی تذکرے "لباب الالباب" کے مصنف محمد عوفی کے اس بیان سے چلتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"او را سہ دیوانست: یکے بہ تازی و یکے بہ پارسی و یکے بہ ہندوی"

سلمان کے ہندوی دیوان کا ذکر خسرو نے بھی کیا ہے۔

بہ حیثیت مجموعی ۱۰۰۰ تا ۱۲۰۰ عیسوی کے نمونوں میں ہمیں اردو زبان کی بہت سی لسانی خصوصیات

کا سراغ مل جاتا ہے۔

- مثلاً اردو کی دو آوازوں اے (ऐ) اور او (औ) کا ارتقا اسی دور میں ہوتا ہے۔ یہ آوازیں سنسکرت میں پائی جاتی تھیں لیکن پراکرت اور اپ بھرنش میں متروک ہوگئی تھیں۔
- سنسکرت، پراکرت، اور اپ بھرنش میں "ڑ" اور "ڑھ" کی آواز نہیں پائی جاتی تھی۔ ان دونوں آوازوں کا ارتقا اسی دور میں ہوا۔ مثلاً لفظ "گھوڑا" سنسکرت میں گھوٹک تھا۔ پراکرت میں گھوڈا بنا اور اردو میں گھوڑا ہوگیا۔ اسی طرح سنسکرت میں ایک لفظ "کیٹ" تھا، اس سے پراکرت میں کیڈ بنا اور اردو میں کیڑا بن گیا۔
- سنسکرت اور پراکرت غیر تحلیلی (SYNTHETIC) زبانیں تھیں۔ اپ بھرنش بھی کافی حد تک غیر تحلیلی زبان تھی لیکن پیش اردو میں غیر تحلیلی شکلیں ختم ہوگئیں اور تحلیلی (ANALYTICAL) شکلیں عام ہوگئیں۔
- ماضی مطلق بنانے کیلئے فعلی مادّے کے ساتھ "یا" کا استعمال بھی اسی دور سے ملنے لگتا ہے۔ مثلاً اس دور کی زبان میں "رہیا"، "ملیا" جیسی فعلی شکلیں پائی جاتی ہیں جن کا پورا ارتقا دکنی اردو میں ہوتا ہے۔
- اردو ضمائر مثلاً میں، ہم، تم، مجھ، تجھ، وہ، میرا، جو، ان، اپنے وغیرہ کا ارتقا بھی اسی دور میں ہوچکا تھا
- کا، کی، کے حروف کی مثالیں بھی پرتھوی راج راسو اور پرمل راسو میں مل جاتی ہیں۔
- راسو میں زمانۂ حال بنانے کے لیے فعلی مادّے کے بعد "ت" کا استعمال ہوتا ہے مثلاً سُنَت۔ قدیم اردو تصنیف "بکٹ کہانی" میں جو ۱۶۲۵ عیسوی سے قبل کی تصنیف ہے اس قسم کی مثالیں جابجا بکھری ہوئی ہیں، مثلاً کرت، بھرت، جلت، چلت وغیرہ۔ "بکٹ کہانی" کا ایک شعر ہے جس میں یہ شکل استعمال ہوئی ہے۔

سبھی سکھیاں پیا سنگ سکھ کرت ہیں ہمن سی پاپیاں نت دکھ بھرت ہیں

"بکٹ کہانی" کے ایک اور شعر میں "جلت" اور "چلت" استعمال کیا گیا ہے۔

ہمن اک آگ غم کی میں جلت ہیں علاوہ دوسرے تو واں چلت ہیں

(۵)

...۱۰۰۰ تا ۱۲۰۰ عیسوی کے نمونوں اور ان کی لسانی خصوصیات کے جائزے کے بعد اب ہم قدیم اردو کی طرف بڑھتے ہیں۔ قدیم اردو دور ۱۲۰۰ عیسوی سے لے کر ۱۷۰۰ عیسوی تک قائم رہتا ہے۔ اس امر کا ذکر بیجا نہ ہوگا کہ کچھ لوگ اردو کی تاریخ وہاں سے شروع کرتے ہیں جب سے نواحِ دہلی کی بولیوں میں عربی فارسی الفاظ کی آمیزش ہونا شروع ہوتی ہے اور چونکہ ان کے خیال میں عربی، فارسی الفاظ مسلمان فاتحین کے ساتھ یہاں آئے ہیں اسلئے

اردو کا آغاز بھی ان کے نزدیک مسلمان فاتحین کے دہلی میں آمد کے وقت سے ہوتا ہے۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ کیوں کہ عربی فارسی الفاظ یہاں کی بولیوں میں مسلمانوں کی فتح دہلی سے پہلے سے پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح اردو کا ڈول یا کینڈا بھی مسلمانوں کے دہلی میں آنے سے تقریباً دو سال قبل بنیش اردو کی صورت میں تیار ہو چکا تھا۔ کسی زبان کی تشکیل میں قواعدی ڈھانچے یا بنت کو جو اہمیت حاصل ہوتی ہے وہ مفرد الفاظ کو حاصل نہیں ہوتی۔ لہٰذا زبان کی تشکیل کیلئے پہلے اس کے قواعدی ڈھانچے یا کینڈے کی تشکیل ضروری ہے۔ کسی زبان کی شناخت اس کے قواعدی ڈھانچے سے قائم ہوتی ہے۔ اگر کسی زبان کا قواعدی ڈھانچا ابھی تیار نہیں ہوا ہے۔ تو محض الفاظ اس زبان کی تشکیل نہیں کر سکتے۔ جب مسلم فاتحین دہلی آئے تو اردو کا قواعدی ڈھانچا کھڑی بولی کی بنیادوں پر تیار ہو چکا تھا۔ دھیرے دھیرے اس میں نکھار پیدا ہوتا گیا اور اس کی ترقی یافتہ شکل سامنے آتی گئی۔ پھر جیسے جیسے ضرورت پڑتی گئی عربی فارسی کے الفاظ بھی اس میں شامل ہوگئے۔ سید وحید الدین سلیم کی تحقیق کے مطابق اردو میں عربی، فارسی الفاظ کا تناسب صرف ۲۲ فی صد ہے۔ باقی الفاظ یہیں کی بولیوں کے ہیں۔ یہ بھی امر واقعہ ہے کہ قدیم اردو میں سنسکرت اور پراکرت کے تتسم اور تدبھو الفاظ کا تناسب اردو میں بہت زیادہ تھا۔ مثلاً سنسار، بالک، سیوک، بھید، دیا، جل، کرودھ، جیون، گیان، اُپکار، پوجا، چتر، اُتم، نیر، مکھ، جگت، الگن، ادھر، نین، پریت، پاپ اور اس طرح کے ہزاروں مقامی الفاظ اردو زبان کی زینت بنے ہوئے تھے۔ لہٰذا جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ اردو کے کھچڑی زبان ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیوں کہ اردو کے اپنے یعنی مقامی عناصر تناسب میں کہیں زیادہ ہیں۔

قدیم اردو یعنی ۱۱۰۰ء سے لیکر ۱۷۰۰ عیسوی تک کی زبان پر بحث کرتے وقت حسب ذیل نمونوں کو سامنے رکھا جا سکتا ہے۔

(۱) صوفیائے کرام کے ملفوظات (۲) تاریخ کی کتابوں اور دیگر فارسی تصانیف میں اردو کے نمونے (۳) امیر خسرو کی شاعری (۴) نام دیو، کبیر اور گرونانک کے کلام میں اردو کے نمونے (۵) مستقل تصانیف۔

جہاں تک صوفیائے ملفوظات کا تعلق ہے ہمیں ان کے مستند اقوال تذکروں میں مل جاتے ہیں جن سے اردو زبان کی ابتدائی ساخت کا کسی حد تک اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان صوفیا میں حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر، شیخ حمیدالدین ناگوری، شیخ عبدالقدوس گنگوہی، شیخ شرف الدین بو علی قلندر، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری وغیرہ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح تاریخ کی کتابوں اور دیگر فارسی تصانیف میں اردو الفاظ و محاورات اور فقرے جا بہ جا بکھرے ہوئے، اردو کے ابتدائی نقوش کی حیثیت رکھتے ہیں۔

قدیم اردو کے ابتدائی عہد کے سب سے اہم شاعر خسرو تسلیم کیے جاتے ہیں لیکن ان کے کلام میں الحاقی کلام کا فی حد تک

شامل ہوگیا جس سے ان کے اصلی کلام کا پتہ لگانا مشکل ہوگیا ہے بہرحال ان کے اردو شاعر ہونے سے کسی کو انکار نہیں۔ خسرو سے منسوب تو ایک غزل رہی ہے جس کا مصرعہ ہے:

زحالِ مسکیں مکن تغافل وُرائے نیناں بنائے بتیاں

خسرو کا انتقال ۱۳۲۵ء میں ہوا۔ خسرو کے بعد ہمیں تین مختلف جگہوں کے تین ایسے شاعر ملتے ہیں جن کے یہاں کھڑی بولی کے نمونے دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ یہ ہیں مہاراشٹر کے نام دیو، مشرقی یوپی کے کبیر داس اور پنجاب کے گرونانک۔ نام دیو ۱۳۵۰ء میں، کبیر ۱۵۱۸ء میں اور گرونانک ۱۵۳۹ء میں اس دنیا سے کوچ کرتے ہیں۔ اس کے بعد سے اردو میں مستقل تصانیف کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

شمالی ہندوستان کی شاعری کا سب سے پہلا مستند نمونہ "بکٹ کہانی" کے نام سے دستیاب ہوتا ہے۔ یہ ۱۶۲۵ء سے قبل کی تصنیف ہے، کیونکہ اس کا مصنف افضل ۱۶۲۵ء میں وفات پاتا ہے۔ یہ بارہ ماشہ کی شکل میں ایک طویل مثنوی ہے جس کا بنیادی لسانی ڈھانچا کھڑی بولی کا ہے۔ کہیں کہیں برج بھاشا کے اثرات بھی دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ اس میں فارسی کے فقروں اور مصرعوں کی بھی جا بجا آمیزش پائی جاتی ہے۔ "بکٹ کہانی" کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے:

سنو سکھیو بکٹ میری کہانی — بھئی ہوں عشق کے غم سوں دوانی

نہ مجھ کو بھوک دن نا نیند راتا — برہ کے درد سوں سینہ پراتا

تمامی لوک مجھ بوُری کہے ری — خرد گم کردہ مجنوں ہو رہی ری

"بکٹ کہانی" کے بعد شمالی ہند کی دوسری اہم شعری تصنیف "عاشور نامہ" ہے، جس کا سنہ تصنیف ۱۶۸۸ء ہے۔ یہ شمالی ہند کا قدیم ترین شہادت نامہ ہے۔ اس کا مصنف روشن علی سہارن پور کا رہنے والا تھا۔ اس کی زبان بھی اگرچہ کھڑی بولی ہے لیکن قصباتی عنصر اس میں زیادہ ہے اور ریختہ کی خصوصیات بھی اس میں نہیں پائی جاتیں۔

اسی زمانے میں دہلی کے چند شاعروں مثلاً "صلاح"، "قربان علی" اور "قاسم" وغیرہ نے کچھ مرثیے لکھے تھے جن کا مجموعہ اب چھپ چکا ہے۔ سترہویں صدی کی آخری اہم تصنیف ایک مثنوی "وفات نامۂ بی بی فاطمہ" ہے جو اسمٰعیل امروہوی نے ۱۶۹۳ء میں قلمبند کی تھی۔ اسمٰعیل کی ایک دوسری مثنوی "معجزۂ انار" ہے جس کا سنہ تصنیف ۱۷۰۸ء ہے۔ سترہویں صدی کی ایک اور اہم کتاب "خالق باری" ہے جو ضیاالدین خسرو کی تصنیف ہے۔

یہ امر قابلِ غور ہے کہ سترہویں صدی تک شمالی ہند میں اردو کی کوئی نثری تصنیف دستیاب نہیں

ہوئی۔ شمالی ہند کی نثر کی پہلی کتاب "کربل کتھا" ہے جو ۱۷۳۲/۱۷۳۲ء میں لکھی گئی۔ یہ کتاب ملّا واعظ حسین کاشفی کی فارسی تصنیف "روضۃ الشہدا" کا ترجمہ ہے جسے فضلی نے اردو میں منتقل کیا ہے۔ کتاب کو اولین نثری تصنیف کا درجہ حاصل ہے لیکن یہ بہرحال فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ شمالی ہند کی نثر کا پہلا طبع زاد نمونہ ہمیں "قصۂ مہرافروز و دلبر" میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کتاب کا مصنف عیسوی خاں بہادر ہے اور یہ کتاب ۱۷۳۲ء اور ۱۷۵۹ء کے درمیان لکھی گئی۔ اس کی زبان کافی حد تک صاف، آسان اور کئی لحاظ سے جدید ہے۔ "قصۂ مہرافروز و دلبر" کی زبان کو خسرو کے عہد کی زبانِ دہلوی کی ترقی یافتہ شکل کہا گیا ہے۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں میر محمد حسین عطا خاں تحسین کی "نوطرزِ مرصع" منظرِ عام پر آئی۔ جو فارسی قصے "چہار درویش" کا ترجمہ ہے۔ اسکی عبارت بے حد رنگین اور مرصّع ہے۔ اٹھارویں صدی کے اواخر میں ہی قرآن پاک کے اردو میں دو ترجمے ملتے ہیں۔ شاہ مولوی رفیع الدین صاحب نے ۱۷۸۸ء میں اور مولانا شاہ عبدالقادر دہلوی نے ۱۷۹۰ء میں قرآن کریم کے ترجمے کیے جن کی زبان آسان اور عام فہم ہے۔

نثری تصانیف کے علاوہ اٹھارویں صدی کے دوران بے مثال شعری کارنامے بھی سامنے آتے ہیں۔ جس کی ابتدا صحیح معنوں میں ولی کی دلّی میں آمد کے بعد سے ہوتی ہے۔ بیدل، آرزو، فغاں وغیرہ کے بعد آبرو، حاتم، یکرنگ، مضمون، تاجی، اور مرزا مظہر جانِ جاناں وغیرہ شاعری میں شہرت حاصل کرتے ہیں۔ پھر میر و سودا کا دور آتا ہے۔ ۱۸۰۰ عیسوی تک یہ دور بھی ختم ہو جاتا ہے اور ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد سے اردو زبان اپنے ارتقا کے جدید دور میں داخل ہو جاتی ہے۔

اردو کے ارتقا کے سلسلے میں یہ بات نہایت اہم ہے کہ اس کا ارتقا دلّی اور نواحِ دہلی کی بولیوں کے بیچ میں ہوا ہے۔ یہ بولیاں ہیں: کھڑی بولی، ہریانی، برج بھاشا اور میواتی۔ اُردو نے شروع ہی سے کھڑی بولی کا ڈھانچا اختیار کیا۔ لیکن ابتدائی دور میں اس پر ہریانی بولی کے اثرات بہت واضح ہیں۔ جب آگرہ دارالسلطنت بنا تو برج کے بھی کچھ اثرات اردو میں آئے۔ پھر رفتہ رفتہ ہریانی کے اثرات زائل ہوتے گئے اور کھڑی بولی ادبی اظہار کے ساتھ ساتھ عہد بہ عہد نکھرتی گئی۔ اردو کا موجودہ روپ کھڑی بولی کا نکھرا ہوا اور ترقی یافتہ روپ ہے جس کے تجزیے کے بعد اردو کے ارتقا کے دوسرے تمام نظریے پھیکے پڑ جاتے ہیں۔

●●

ڈاکٹر (مسز) لئیق النساء
سینیئر ریسرچ فیلو
خدا بخش لائبریری، پٹنہ

گلدستہ

چہار شنبہ سیوم ماہ ربیع الثانی ۱۱۵۵ھ بمطابق ۱۷۴۲ میلادی کو عبدالوہاب عالمگیر[1] ولد سید منصور خان و نبیرہ سید دلاور خان و نواسہ غیاث الدین خان بن جملۃ الملک اسلام خان رضوی مشہدی نے "گلدستہ" کو مرتب کیا۔ کتاب کے شروع میں تحریر ہے کہ یہ "کعبہ عرفان" کا انتخاب ہے۔ "کعبہ عرفان" مشہور و معروف جامع ترین تذکرہ "عرفات العاشقین" کا انتخاب ہے۔ یہ دونوں کتابیں استاد الزماں، منفرد الدوراں، فخر الشعرا، عمدۃ البلغا، جامع کمالات انسانی تقی الدین محمد اوحدی اصفہانی کی تصانیف ہیں جو عہد جہانگیری (۱۰۱۴ھ - ۱۰۳۷ھ) میں آگرہ اور احمد آباد میں لکھی گئیں۔ ان میں قدیم ترین فارسی شعرا سے لیکر عہد جہانگیر تک کے شعرا کے تراجم و کلام درج ہیں۔ انتخاب کنندہ عبدالوہاب عالمگیر نے "گلدستہ" کا آغاز اس عبارت سے کیا ہے:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم و بہ نستعین من کعبہ عرفان انتخاب عرفات العارفین (عرفات العاشقین) تصنیف میر تقی الدین حسینی دقاقی بلیانی کہ بموجب حکم نور الدین محمد جہانگیر بادشاہ تذکرۃ الشعرا بقلم آوردہ ...... از آن بہارستان قدری گلہای رنگین چیدہ "بگلدستہ" موسوم ساخت[2]"

"عرفات العاشقین" و "کعبہ عرفان" دونوں کتابوں کے تخلیق کار کا پورا نام تقی الدین محمد بن معین الدین محمد بن سعد الدین محمد الاوحدی الحسینی الدقاقی البلیانی واصفہانی ہے جو "کعبہ عرفان"[3] کی تکمیل یعنی ۱۰۳۶ھ تک

---

[1] سہوا "عالمگیری" تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان ص ص ۸۴-۲۳، ۵۵۸، تاریخ تذکرہ ہای فارسی ص ص ۴۱، ۴۲، ۴۳۹۔

[2] "گلدستہ" کے متن کی عبارت جو صفحہ پر درج کی گئی ہے صاف ظاہر کرتی ہے کہ جہانگیر کے حکم سے "عرفات العاشقین" کا انتخاب بشکل "کعبہ عرفان" وجود میں آیا۔ نہ معلوم مولوی عبدالمقتدر نے یہ کیسے جان لیا کہ "عرفات العاشقین" کا انتخاب تقی الدین اوحدی نے "کعبہ عرفان" کی شکل میں اپنی مرضی سے کیا اور پھر جہانگیر کے حکم سے "کعبہ عرفان" کا انتخاب بنام "انتخاب کعبہ عرفان" کیا۔ اور زیر بحث مخطوطہ "گلدستہ" اسی "انتخاب کعبہ عرفان" کا اختصار ہے۔ رجوع کنید: فہرست عربی و فارسی مخطوطات خدا بخش لائبریری پٹنہ ص ص ۱۱۰، جلد ۸۔ اس فہرست سے استفادہ کرنے والے مورخین اور مصنفین جیسے استوری و دکتر علی رضا نقوی وغیرہ نے بھی سہوا اس نوشتہ "انتخاب کعبہ عرفان" کو ہی گلدستہ کا ماخذ کہا۔ رجوع کنید: PERSIN LITERATURE A BIO-BIBILOGRAPHICAL SURVEY ص ص ۸۰۸-۸۱۱، تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان ص ص ۲۰۰-۲۰۲۔ نہ "گلدستہ" میں کہیں بھی تقی اوحدی کی اس تیسری کتاب "منتخب کعبہ عرفان"

[3] ڈاکٹر نبو نے ایک جگہ "کعبہ عرفان" اور "عرفات العاشقین" کے حوالے دیئے ہیں۔ ص ۲۰، ماخوذ از برگ (الف، ب) "گلدستہ" قلمی نسخہ خدا بخش

مندرجہ ذیل کتابیں لکھ چکا تھا۔ ان کتابوں کی فہرست "کعبہ عرفان" و "گلدستہ"[1] میں موجود ہے۔

(۱) مثنوی یعقوب و یوسف۔ (۲۲۲۲ بیت)۔ (۲) ساقی نامہ موسوم بہ نشاء خمار (۶۰۰ بیت)۔ (۳) کعبہ دیدار (۲۰۰۰ بیت)۔ (۴) سفینۃ السکینۃ (۶۰۰۰ بیت)۔ (۵) کعبۃ الحرمین (۴۰۰۰ بیت)۔ (۶) لوح محفوظ (۷) قلم قدرت۔ (۸) تبصرۃ العارفین۔ دیوان قصاید (۱۰۰۰۰ بیت) (۹) تذکرۃ العاشقین۔ دیوان غزل (۹۰۰۰ بیت)۔ (۱۰) دیوان تراکیب و ترجیعات۔ (۱۱) دیوان مقطعات و مطائبات، اہاجی و رباعیات، اضافیہ و اوصافیہ (۱۰۰۰ بیت)۔ "بروش نجوم ازوی فال گرفتہ" (بقول مولف)۔ (۱۲)۔ دیوان عین الحیات (۵۰۰۰ بیت) درہند گفتہ شدہ "در ۱۰۱۳ھ باتمام رسیدہ"۔ (۱۳) دیوان امیداباد در جواب اشعار امیدی۔ (۱۴) دیوان آدمیت۔ (۱۵) دیوان غزل موسوم بہرام دستان (۱۶) دیوان جواہر زواہر (۱۷) دیوان درر و غرر کہ قصاید محض اند (۱۸) عرفات العاشقین (۷۵۰۰۰ بیت)۔ (۱۹) کعبہ عرفان "کہ انتخاب عرفات العاشقین است"۔ (۲۰) سرمہ سلیمانی در لغت فرس (۲۱) کافیۃ القافیہ در روش سخن (۶۰۰ بیت)۔ (۲۲) مفتاح مفاتیح و علینہ در تصوف (بایک دیوان در قزوین از دست رفت۔۔۔ القصہ آنچہ فوت شدہ قریب بدہ دوازدہ ہزار کم و بیش بود) (۲۳) جفر اوحد۔

چہار شنبہ سیوم رمضان ۹۷۳ھ کو فارس کے قصبہ کازرون میں یہ عظیم مصنف و شاعر ایک معزز خاندان میں پیدا ہوا اس کا باپ شیخ معین الدین محمد تقی کی پیدائش سے پہلے ہی سفر ہند پر چلا گیا تھا اور اپنے اس چشم و چراغ کو دیکھنے سے پہلے ہی وہ دکن میں انتقال کر گیا۔ تقی کے آباواجداد میں شیخ ابوعبداللہ و شیخ ابوعلی دقاق جیسے بڑے پایہ کے بزرگ

---

۱ "گلدستہ" برگ ۹۸ الف پر مندرجہ بالا کتابوں کی فہرست دی گئی ہے۔ کتابوں کے نام کے بعد دی ہوئی ابیات کی تعداد وغیرہ "عرفات العاشقین" برگ ۷۶۷ ب تا ۷۶۸ الف پر مندرج ہیں۔ ڈاکٹر سید علی رضا نقوی نے تین مزید کتب کے نام "تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان" میں صفحہ ۱۵۰ پر دیے ہیں جو یہ ہیں: (۱) "انتخاب کعبہ عرفان": یہ کتاب وجود میں آئی ہی نہیں۔ اس سے پہلے متن اور پاورقی میں اس کے بارے میں لکھا جا چکا ہے۔ تقی اوحدی کی کتابوں کی فہرست "جو گلدستہ میں" ہے اس میں یہ کتاب شامل نہیں ہے۔ (۲) مثنوی شتر گربہ: اس کتاب کا نام بھی "عرفات العاشقین" یا "گلدستہ" میں دی گئی فہرستوں میں نہیں ہے۔ ڈاکٹر سید علی رضا نقوی نے "ریاض الشعرا" کا حوالہ دیا ہے۔ اس میں علی قلی والہ داغستانی نے تقی اوحدی کے بیان میں صرف یہ لکھا ہے: "در مثنویاتش اشعار شتر گربہ بنظر رسید" برگ ۔۔۔ ب، جلد ا نسخہ خطی خدا بخش (۳) فردوس خیال اوحدی: تقی اوحدی نے اس کتاب میں بہت سے شعرا کے کلام جمع کیے تھے۔ پھر اس میں ان شعرا کے حالات کا اضافہ کر کے اس کو "عرفات العاشقین" میں بدل دیا (عرفات العاشقین برگ ۱ ب، جلد ۱) اسی وجہ سے یہ کتاب اس نے اپنی فہرست میں شامل نہیں کی۔ ۲ سہوا "سفینۃ السفینہ" "تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان" ص ۱۵۴۔

پیدا ہوئے۔ اُس کا سلسلہ نسب زین الاولیا خواجہ حسن مانحی تک پہونچتا ہے۔[1]

بارہ سال کی عمر تک اس بچہ کی پرورش تنہا ماں نے بڑی نفلشانی کے ساتھ کی پھر وہ بھی اس وسیع و عریض دنیا میں اس کو تنہا چھوڑ کر سفر آخرت اختیار کر گئی۔ بچپن ہی سے تقی بہت ذہین اور بہت زبردست حافظہ کا مالک تھا۔ آٹھ نو سال کی عمر میں ہی اس کو شعر فہمی اور شعر گوئی کا شعور پیدا ہو گیا تھا جس محفل میں جاتا لوگوں کو اپنی ذہانت سے گرویدہ بنا لیتا۔ کمسنی میں ہی اس نے تمام علوم حاصل کر لیے تھے پھر بھی اس کا علمی ذوق و شوق زندگی بھر بڑھتا ہی گیا۔ اُس کو بڑے بڑے علما و فضلا کی صحبت حاصل رہی۔ اپنی ذاتی قابلیت اور ہمہ دانی کی بنا پر وہ شاہ عباس صفوی کا مقرب اور سب سے زیادہ پسندیدہ شاعر بن گیا۔ وہ کان بلاغت اور آسمان فصاحت کا اختر تاباں تھا۔ ہندوستان میں شعرا کی ہنر پروری کی کشش نے اس کو وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور وہ یکم رجب ۱۰۱۵ھ کو سفر ہند کیلئے چل پڑا۔ یہاں بھی اس کو بادشاہ جہانگیر کی قربت حاصل ہو گئی۔ ۱۰۲۲ھ میں اس نے مشہور تصنیف "عرفات العاشقین" کو لکھنا شروع کر دیا۔ جس کے بارے میں خود لکھا ہے:

"این نسخہ کہ غرہ ذی القعدہ ۱۰۲۲ھ در دار السلطنت آگرہ مستقر نمودہ وقتیست کہ بادشاہ جہانگیر غریب نواز دوست فراز دشمن گداز خواستہ کہ نور دیدہ خود شہزادہ خسرو را از قید اطلاق فرماید و بشکار اجمیر عزم کردہ ... بندہ کہ بسبب اتمام این نسخہ شریفہ در شہر آگرہ باز ماندہ ام"[2]

۱۰۲۴ھ میں "عرفات العاشقین" مکمل ہوئی۔ اس میں ۳۴۹۵ شعرا کے تراجم و کلام حروف تہجی کے اعتبار سے درج ہیں۔ پوری کتاب میں ۲۸ عرصات ہیں اور ہر عرصہ میں تین غرفہ ہیں جو بالترتیب متقدمین و متوسطین اور متاخرین شعرا کے لئے بنائے گئے ہیں۔ ان ادوار کا تعین کس طرح کیا گیا یہ تقی اوحدی نے کہیں واضح نہیں کیا ہے۔ متن سے پتہ چلتا ہے کہ بہرام گور و حنظلہ بادغیسی وغیرہ سے لیکر آٹھویں صدی ہجری کے قریب تک کے شعرا متقدمین میں رکھے گئے ہیں اور پھر اس کے بعد دسویں صدی کے نیمہ کے قریب تک کے شعرا متوسطین میں ہیں۔ اس کے بعد سے ۱۰۲۴ھ

۱۔ تقی اوحدی کی زندگی کے حالات "گلدستہ" میں نہیں ہیں۔ اس میں صرف اس کے ادبی کارنامے دیئے گئے ہیں۔ البتہ اس نے اپنی پیدائش سے لے کر "عرفات العاشقین" کی تکمیل تک کے مجاہدانہ و مجردانہ زندگی کے مفصل حالات "عرفات" کے دیباچہ میں برگ ۱ الف تا برگ ۱۲ الف میں دیئے ہیں۔ اوپر دیئے گئے مختصر ترین حالات اسی دیباچہ سے ماخوذ ہیں۔ مصنفین تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان (ص ص ۱۵۱، ۱۹۲) و تاریخ تذکرہ ہائے فارسی (ص ص ۱، ۳-۴) نے بھی اس کی زندگی کے حالات پر روشنی ڈالی ہے جن کا ماخذ بھی دیباچہ عرفات ہے۔ ۲۔ ماخوذ از عرفات العاشقین برگ ۲۰ الف خدا بخش۔

یعنی تکمیل کتاب تک کے شعرا متاخرین میں رکھے گئے ہیں۔ ہندوستان میں اس کا ایک ایک خطی نسخہ پٹنہ[1] و علی گڈھ[2] اور حیدرآباد[3] کے کتب خانوں میں محفوظ ہے۔

سنہ ۱۰۳۶ھ جب مصنف نے "عرفات العاشقین" کا انتخاب "کعبہ عرفان" کے نام سے کیا تو ترتیب بدل دی۔ تین رکن "حنائی" "منائی" اور "ذیائی" بالترتیب متقدمین، متوسطین اور متاخرین شعرا کیلئے بنائے۔ شعرا کی ترتیب ذبیح الغبا کے اعتبار سے رکھی گئی۔ ہندوستان میں ابھی تک "کعبہ عرفان" کے کسی نسخہ کی موجودگی کا پتہ نہیں لگ پایا۔ البتہ تاریخ تذکرہ ہائے فارسی میں احمد گلچین معانی نے دو خطی نسخوں کی نشاندہی کی ہے جو لیڈ زیانہ (ص ۲۲۳، نمبر ۲۱۴ مورخہ ۱۰۳۶ق) اور کتابخانہ فخر الدین نصیری، طہران میں موجود ہیں۔

"گلدستۂ کعبہ عرفان" کا انتخاب ہے اس کا ایک خطی نسخہ کتب خانہ خدا بخش پٹنہ (جلد ۸ نمبر ۲۲۲) میں موجود ہے۔ وہ میری نظر سے گذرا۔ عبدالوہاب عالم گیر نے گلدستہ میں شعرا کی ذبیح مذکورہ بالا ترتیب قائم رکھی۔ کعبہ عرفان میں تقی الدین اوحدی رکھی تھی۔ تینوں ارکان یعنی حنائی (متقدمین) منائی (متوسطین) اور ذیائی (متاخرین) حروف تہجی کے ۲۸[4] عرصات میں منقسم ہیں اور "عرفات العاشقین" کی طرح ہر شاعر کے حال و کلام کو "عرفہ" کا نام دیا گیا ہے۔ کاتب کی غلطی سے بعض جگہوں پر لفظ "عرفہ" لکھنے سے رہ گیا ہے۔ کتاب کا سائز ۸ء۱۲×۵ء۸ سنٹی میٹر ہے۔ اور صفحات پر ۱۲-۱۵ تک سطریں ہیں۔ نسخہ کو پرکشش بنانے کی خاطر کاتب نے کسی کسی صفحہ پر متن کو ترچھی سطروں میں لکھا ہے۔ خط نستعلیق ہے مگر ہلکی سی خط شکست کی آمیزش کے ساتھ۔ حروف کی ادائیگی میں عموماً "ب" و "پ"، "ج" و "چ"، "ز" و "ژ" اور "ک" و "گ" میں فرق نہیں ہے۔ لیکن "پ" و "چ" اور "ژ" کا استعمال کہیں کہیں دیکھنے میں آجاتا ہے۔ البتہ "گ" کا استعمال بالکل نظر نہیں آیا۔ نقاط کا استعمال خوب کیا گیا ہے۔ حرف "ی" کے نیچے بھی دو نقطے (ی) لگائے گئے ہیں۔ جب کسی لفظ میں حرف "ت" یا حرف "ق" پہلے یا بعد میں حرف "ف" یا "خ" یا حرف "ن" کے ساتھ آیا تو دونوں کے تین نقطے ملا کر بعد والے حرف پر لگائے ہیں۔ (جیسے شک بجای تنگ، نقد بجای نقد) اسی طرح جب حرف "ی" پہلے یا بعد میں حرف "ب" یا حرف "ج" کے ساتھ آئی تو ان کے تینوں نقطے بعد والے حرف کے

۱۔ فہرست عربی و فارسی مخطوطات کتب خانہ خدا بخش پٹنہ جلد ۸ نمبر ۲۲۹، ۲۳۰۔ ۲۔ فہرست حبیب گنج کلکشن مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ جلد اول حصہ دوم ش ۱۱۱۳ "سہواً بنام تبصرۃ العارفین"۔ ۳۔ فہرست کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد ج ۲ ص ۱۶۴ ش ۲۰۹۔ ۴۔ "پ" کو "ب" عرصہ میں، "چ" کو "ج" کے عرصہ میں اور "گ" کو "ک" کے عرصہ میں رکھا گیا ہے۔

نیچے کاتب نے لگائے ہیں (جیسے نقیپ بجائے نقیب، رنجیدہ بجائے رنجیدہ) تشدید (ّ) کا استعمال بھی خوب دیکھنے میں آتا ہے۔ عناوین سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔ کل اوراق کی تعداد ۲۷۴ ہے۔ اوراق کا رنگ بدل کر خاکی مایل ہو گیا ہے۔ کتاب کی مرمت ہوئی ہے اور ہر ورق پر جمینیشن ہے۔ متن کے چاروں طرف کالی، نیلی اور شنگرفی لائینوں سے بارڈر بنا ہوا ہے۔ جن کے بیچ میں سنہرا رنگ بھرا ہوا ہے۔ حاشیہ صاف ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ کسی باحیثیت اور باذوق ہستی نے اپنے ذاتی کتب خانہ کیلئے تیار کرایا ہوگا۔ برگ ۱۷۳ (ب) پر ایک لال رنگ کی مٹی سی مہر لگی ہے جس کو سمجھنا دشوار ہے۔ اوراق کے نمبر کہیں نیلی کہیں لال روشنائی اور کہیں پنسل سے ڈالے گئے ہیں جن کی ترتیب صحیح نہیں ہے۔ پورے مخطوطہ میں کاتب کا نام کہیں لکھا نظر نہ آیا اور نہ کتابت کی تاریخ کہیں درج ہے۔ مولوی مقتدر کی رائے[1] میں یہ نسخہ اٹھارویں صدی میلادی کا ہے۔ نسخہ کے شروع یا آخر میں کوئی فہرست نہیں دی گئی ہے۔

دراصل اس کتاب میں عبدالوہاب عالمگیر نے "کعبۂ عرفان" میں دنیا مختلف شعرا کی رباعیات کو جمع کر کے ان ان شعرا کا مختصر حال دیکر "گلدستہ" کی شکل میں پیش کیا ہے۔ جن شعرا کی رباعیات کا یہ انمول خزانہ ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

<u>حتانی (شعرای متقدمین)</u>:۔ (۱) شیخ ابویزید البسطامی (۲) ضیاءالدین علاءالملک ابوبکر بن احمد البخاری (۳) ابوعم (۴) ابوالیامہ بن جلال الدین محمد (۵) ابوحفص (۶) عبداللہ بن عمر ثانی (۷) خواجہ ابوبکر بن نظام الملک (۸) خواجہ ابوبکر ترمذی (۹) نجیب امین ابوبکر ترمذی خطاط (۱۰) شیخ ابوبکر بجلی رازی (۱۱) ابوبکر کرمانی (۱۲) ابومحمد یمین الدین غزنوی (۱۳) ابوعلی حسن (۱۴) قاضی ابوطاہر یحیٰی (۱۵) سلطان علاءالدین بن اتسز خوارزم شاہ (۱۶) اثیرالدین محمد الاخسیکتی (۱۷) ابوسعید سعادت ابن مسعود سعد سلمان (۱۸) شیخ الرئیس ابوعلی (۱۹) شیخ ابوالحسن خرقانی (۲۰) شیخ ابوسعید بز غوش (۲۱) استاد ابوالفرج رونی (۲۲) شیخ احمد غزالی (۲۳) شیخ احمد النافعی الجامی (۲۴) مجدالدین احمد (۲۵) سنادالدین ارقم الفارسی (۲۶) ابوبکر ازرقی (۲۷) سعدالدین سمرقندی (۲۸) تاج الدین اسمعیل باخرزی (۲۹) حکیم شاہ نوراشہری (۳۰) اشرفی سمرقندی (۳۱) حکیم اسمی (۳۲) خواجہ افضل الدین محمد کاشی (۳۳) شیخ امین الدین بلیانی (۳۴) امامی ہروی (۳۵) حکیم اوحدالدین انوری خاوری (۳۶) شیخ ابوحامد اوحدالدین کرمانی (۳۷) شیخ اوحدالدین عبداللہ بن

---

[1] ماخوذ از فہرست مخطوطات فارسی مخطوطات کتب خانہ خدابخش پٹنہ ص ۱۱۸ جلد ۸

ضیاء الدین مسعود بلیانی (۳۸) حکیم بدیع الزمان ترکوہی (۳۹) حسن بن احمد بن بدری (۴۰) بدر الدین حاجرمی (۴۱) خواجہ کمال الدین بندار رازی (۴۲) تاج الدین (۴۳) مولانا جلال الدین (۴۴) شیخ جمال الدین ہانسوی (۴۵) شیخ الاسلام حارثی (۴۶) اشرف الدین حسن بن ناصر علوی (۴۷) سید حسینی (۴۸) ابوالحرث (۴۹) حمید الدین (۵۰) حمید الدین (۵۱) حمید الدین (۵۲) عمر خیام (۵۳) شمس الدین داعی (۵۴) عز الدین رافعی (۵۵) امام الدین ابوالقاسم رافعی (۵۶) خواجہ رشید الدین ہمدانی (۵۷) رشق خطی (۵۸) رضی الدین نیشاپور (۵۹) شیخ رضی الدین (۶۰) رفیع الدین الابہری (۶۱) شیخ رضای گیلانی (۶۲) رفیع الدین کرمانی (۶۳) رفیع الدین عبد العزیز (۶۴) رفیع الدین مروزی (۶۵) مولانا رکن الدین (۶۶) ابو جعفر عبد اللہ ابوالحسن محمد الرودکی (۶۷) شیخ روزبہان (۶۸) لطیف الدین زکی (۶۹) عبد اللہ زکی (۷۰) زین الدین (۷۱) زین الدین سجزی (۷۲) سدید الدین الاعور (۷۳) خواجہ سعد سلمان (۷۴) شیخ سعد الدین (۷۵) سعد وراق (۷۶) سلطان ولد نقد مولانا جلال الدین محمد رومی (۷۷) سلجوق شاہ (۷۸) سلغر (۷۹) سلطان سلیمان شاہ (۸۰) سلطان شاہ خوارزمشاہ (۸۱) حکیم سنائی غزنوی (۸۲) حکیم سنجری (۸۳) حکیم سوزنی (۸۴) شیخ سیف الدین (۸۵) علاء الدین سیفی نیشاپوری (۸۶) نصرۃ الدین شاہ کبود جامہ (۸۷) شاہ سجان (۸۸) شاہ شرف بو علی قلندر (۸۹) شرف الدین علاء الملک (۹۰) شرف الدین محمد بن محمد فرای (۹۱) شرف الدین طوسی (۹۲) شرف الدین میزی (۹۳) شمس الدین (۹۴) شمس الدین (۹۵) شمس الدین (۹۶) شمس الدین محمد بن نصر (۹۷) شمس الدین مبارک شاہ (۹۸) شمس الدین محمد جوینی (۹۹) ملک شمس الدین کرت (۱۰۰) شمس الدین نیازی (۱۰۱) شہاب الدین طلمہ (۱۰۲) شہاب الدین مقتول (۱۰۳) شیخ شہاب الدین ابی حفص (۱۰۴) شیخ صدر الدین نیشاپوری (۱۰۵) خواجہ صدر الدین نجندی (۱۰۶) شیخ صدر الدین قونوی (۱۰۷) شیخ صفی الدین (۱۰۸) شیخ صفی الدین بن اسحاق اردبیلی (۱۰۹) ابو سنجر غزنوی صندلی (۱۱۰) ضیاء الدین محمد بن ابی نصر (۱۱۱) ضیاء الدین عمر (۱۱۲) ضیاء الدین محمد (۱۱۳) سلطان طغرل (۱۱۴) ملک طغان شاہ بن محمد (۱۱۵) حکیم طیان الیمنی (۱۱۶) ظہیر الدین طاہر (۱۱۷) عبد الملک ابو نصر (۱۱۸) عایشہ سمرقندیہ (۱۱۹) عبد اللہ (۱۲۰) سید عبد اللہ بن ابی عبد اللہ (۱۲۱) عبد الواسع جبلی (۱۲۲) حکیم عبد الحمید (۱۲۳) عبد اللہ بن منصور محمد انصاری (۱۲۴) خواجہ عبد الخالق غجدانی (۱۲۵) عبد العزیز کاشانی (۱۲۶) ابوالفضل حاجی عثمان بن احمد ہروی (۱۲۷) شیخ عزیز الدین محمد محمود کاشانی (۱۲۸) حکیم ابوالمظفر عبد العزیز

بن منصور عسجدی (۱۲۹) عبدالرحمٰن بن محمد (۱۳۰) شیخ فریدالدین عطار (۱۳۱) علاؤالدین حسین (۱۳۲)
ملک علی شاہ (۱۳۳) حکیم ابوالقاسم حسن بن احمد عنصری (۱۳۴) حکیم غزالی (۱۳۵) مسماۃ فاطمہ (۱۳۶)
فریدالدین علی منجم (۱۳۷) خواجہ فریدالدین (۱۳۸) حکیم ابوالقاسم منصور فردوسی (۱۳۹) فرخی (۱۴۰) شیخ
فریدالدین شکرگنج (۱۴۱) افضل الدین فضلی (۱۴۲) قابوس (۱۴۳) حکیم قطران بن منصور الاعلی عضدی
(۱۴۴) شیخ قطب الدین محمد بن احمد جامی (۱۴۵) قلیج طمغاج خان (۱۴۶) قلیج ارسلان خاقان (۱۴۷)
قنبری بغدادی (۱۴۸) ملک کمال کورتہ (۱۴۹) کمال الدین اسمٰعیل (۱۵۰) کیکاؤس (۱۵۱) حکیم لولوی
(۱۵۲) مجدالدین نسوی (۱۵۳) مجدالدین محمد (۱۵۴) مجدالدین محمد بلوریچ (۱۵۵) مجدالدین شریف بغدادی
(۱۵۶) مجیدالدین بیلقانی (۱۵۷) محمد غزالی (۱۵۸) محی الدین یحییٰ (۱۵۹) محمد ابن بدیع نسوی (۱۶۰) محمد
بن محمد عوفی (۱۶۱) پہلوان محمود (۱۶۲) شیخ محمود شستری (۱۶۳) شیخ مختاری (۱۶۴) امیر فخرالدین (۱۶۵)
مسعود ابن سعد سلمان (۱۶۶) سعد بن مسعود (۱۶۷) مطربہ سمرقندی (۱۶۸) مسلم الدین قوشنجی (۱۶۹)
ملک شاہ بن الپ ارسلان محمد (۱۷۰) مہستی (۱۷۱) امیر ناصرالدین عثمان (۱۷۲) خواجہ ناصرالدین
بن قطب الدین سرخسی (۱۷۳) شیخ نجم الدین کبریٰ (۱۷۴) شیخ نجم الدین رازی (۱۷۵) حکیم نجم الدین
محمود بن الیاس (۱۷۶) شیخ نجم الدین یعقوب (۱۷۷) نجم الدین سمنانی (۱۷۸) نصیر اللہ الدنیا والدین محمد
ابن حسن طوسی (۱۷۹) شیخ نظامی گنجوی (۱۸۰) نظام الدین خالد دہلوی مشہور بہ شیخ نظام الدین اولیا
(۱۸۱) نظام محمد بن تاج الدین عمر (۱۸۲) نظام الدین محمد محمود قمری صفاہانی (۱۸۳) ولد شاہ (۱۸۴)
ہندو شاہ (۱۸۵) یوسف بن الیاس (۱۸۶) شیخ ابو یوسف ہمدانی

متانی (شعرای متوسطین): (۱۸۷) ابن نصوح (۱۸۸) خواجہ ابوالقاسم ولد
خواجہ شہاب (۱۸۹) خواجہ ابوالوفا (۱۹۰) مرزا ابوبکر بن جوگی شاہ (۱۹۱) ابواسحاق شیرازی (۱۹۲)
مولانا جلال الدین ابوالخیر عاشق (۱۹۳) شیخ ابوالوجد (۱۹۴) میر ابراہیم قانونی (۱۹۵) شیخ ابوالواسع (۱۹۶)
بابی آتون (۱۹۷) سید احمد رفاعی (۱۹۸) مولانا ادہم کاشی (۱۹۹) شیخ جلال الدین آذری (۲۰۰) مولانا
سہمی ہروی (۲۰۱) خواجہ افضل الدین آفاق جلایر (۲۰۲) نظام الدین امیر علی شیر (۲۰۳) امیر سلطان حسین
امینی (۲۰۴) مولانا امید رازی (۲۰۵) مرزا بایسنقر بن شاہ رخ مرزا (۲۰۶) سلطان ابوالقاسم بن بایسنقر
مرزا بن شاہ رخ مرزا (۲۰۷) ظہیرالدین محمد بن عمر شیخ بن میرزا ابوسعید بن سلطان محمد بن میرانشاہ صاحبقرانؔ

امیر تیمور گورگان (۲۰۸) بادشاہ خاتون (۲۰۹) سلطان بایزید بن محمد مظفر (۲۱۰) میر برہان الدین (۲۱۱)
بی بی پردہ (۲۱۲) خواجہ بہاء الدین نقشبند (۲۱۳) طالبی ہروی (۲۱۴) مولانا تندوری (۲۱۵) مولانا ثوری
(۲۱۶) مولانا نور الدین عبد الرحمٰن جامی (۲۱۷) مولانا محمد جانی (۲۱۸) خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی
(۲۱۹) سید حسن (۲۲۰) سید حسن شہاب (۲۲۱) سلطان حسین مرزا بایقرا ابن عمر شیخ (۲۲۲)
مولانا حسام (۲۲۳) قاضی میر حسین (۲۲۴) مرزا حیدر گورگانی (۲۲۵) درویش حیدر (۲۲۶) میر دوری
(۲۲۷) خواجہ سیف الدین محمود رجائیؒ (۲۲۸) مولانا رشید (۲۲۹) شرف الدین رضائیؒ (۲۳۰) خواجہ
رکن الدین صاین (۲۳۱) شیخ زین الدین ابوبکر (۲۳۲) شیخ زین الدین خوافی (۲۳۳) خواجہ زین الدین
نسائی (۲۳۴) سراج الدین قمری (۲۳۵) خواجہ سلمان ساوجی (۲۳۶) حافظ سیستانی (۲۳۷) میرزا شاہ
حسین صفاہانی (۲۳۸) شاہ شجاع (۲۳۹) مولانا شرف الدین علی یزدی (۲۴۰) مولانا شرف الدین
علی (۲۴۱) شکری قلندری (۲۴۲) شمس الدین کرمانی (۲۴۳) شمس الدین عبد القادر (۲۴۴) شمس الدین
بدخشانی (۲۴۵) شمس الدین بخاری (۲۴۶) شہاب الدین ساوجی (۲۴۷) شیخ رباعی (۲۴۸) شیخ
زادہ پورانی (۲۴۹) مولانا صالح بدخشانی (۲۵۰) میرزا صادق (۲۵۱) شاہ صفی الدین محمد رازی (۲۵۲)
ضعیفی سمرقندی (۲۵۳) طالب جاجرمی (۲۵۴) نادر شاہ طاہر (۲۵۵) مولانا عبد الصمد (۲۵۶) عبد اللہ
خان (۲۵۷) عسکری میرزا ابن ظہیر الدین بابر (۲۵۸) مسماۃ عصمتی (۲۵۹) میر برہان الدین عطاء اللہ شیخ
علاء الدولہ سمنانی (۲۶۰) میر سید علی ہمدانی (۲۶۱) بابا علی شاہ ابدال (۲۶۲) مولانا میر علی (۲۶۳) عماد الدین
قزوینی (۲۶۴) قاضی مسیح الدین عیسائی ساوجی (۲۶۵) میرزا غیور بیگ (۲۶۶) مولانا غیاث (۲۶۷) مولانا
غیاث الدین مشہدی (۲۶۸) فخری بن امیری (۲۶۹) فخری بغدادی (۲۷۰) فخری (۲۷۱) شیخ فدائی
(۲۷۲) فراہی (۲۷۳) فصیح خواجہ عبد القادر (۲۷۴) فقیہ نجاشی (۲۷۵) شاہ قاسم انوار (۲۷۶) ملک
قاسمی دیلمی (۲۷۷) میرزا قاسم جنابادی (۲۷۸) قاسم خان موجی (۲۷۹) قدمی نقاش گیلانی (۲۸۰) میرزا شیخ
محمد کامران برادر ہمایوں بادشاہ (۲۸۱) امیر خواجہ کلان (۲۸۲) کوکبی (۲۸۳) شہزادہ کچک میرزا (۲۸۴)
مولانا لطف اللہ نیشاپوری (۲۸۵) شیخ محمود بن شیخ علی غجدانی (۲۸۶) نجم الدین محمود (۲۸۷) مولانا محمد
خراسانی (۲۸۸) خواجہ مسعود (۲۸۹) امیر سلطان مسعود (۲۹۰) مسکین کازرونی (۲۹۱) معتی (۲۹۲)
مولانا معین (۲۹۳) عز الدین محمد نقیب (۲۹۴) شیخ معزی (۲۹۵) درویش مقصود تیر گر (۲۹۶)

خواجہ ملائی کازرونی (۲۹۷) بی بی مہری جلایر (۲۹۸) مولانا امیر سبزواری (۲۹۹) میرم سیاه (۳۰۰)
مام سبزواری (۳۰۱) سید نورالدین شاه نعمت اللہ (۳۰۲) نزاری (۳۰۳) سید نسیمی (۳۰۴)
شیخ نورالدین عبدالرحمٰن اسفرائنی (۳۰۵) مولانا نیازی (۳۰۶) مولانا یوسف نیازی (۳۰۷) ولی بیگ
(۳۰۸) باتقی (۳۰۹) محمد ہمایوں (۳۱۰) ہندال میرزا برادر بزرگ ہمایوں (۳۱۱) مولانا ہوائی (۳۱۲) یار محمد (۳۱۳) یعقوب بن اوزن۔

دیاتی (شعرای متاخرین): (۳۱۴) ملا ابراہیم حسین، (۳۱۵) میر ابوالقاسم استرابادی
(۳۱۶) میر ابوالحسن فراہانی (۳۱۷) مولانا احسنی سندی، (۳۱۸) خواجہ میرزا احمد رازی (۳۱۹) احمد
(۳۲۰) خان احمد (۳۲۱) قاضی احمد لاغری (۳۲۲) اختری (۳۲۳) اخگری لاری (۳۲۴) مولانا
آدی (۳۲۵) میر اسداللہ متولی صفاہانی، (۳۲۶) شاه اسمعیل بن شاه طہماسپ (۳۲۷) میر محمد باقر
المدعو بالاشراف (۳۲۸) اشرف گیلانی (۳۲۹) اصدق ہمدانی (۳۳۰) افضل الدین ترکہ اصفہانی
(۳۳۱) مولانا آقا شیخ تتردینی (۳۳۲) جلال الدین محمد اکبر بادشاه، (۳۳۳) مولانا آگہی (۳۳۴) میر
آلہی (۳۳۵) مسیح الزماں آلہی (۳۳۶) امامی اردبیلی (۳۳۷) محمد امین نجیب (۳۳۸) امیق
(۳۳۹) خواجہ محمد امین گورشہ (۳۴۰) مولانا امینی یزدی (۳۴۱) عبدالرزاق انسی (۳۴۲) حسن بیگ
انسی (۳۴۳) میر قلی انیسی (۳۴۴) مولانا آہنگ (۳۴۵) مولانا ایزدی یزدی (۳۴۶) مولانا
ایرج تبریزی (۳۴۷) مولانا ایاز منجم (۳۴۸) مولانا آیت صفاہانی (۳۴۹) بابا ملا شاه (۳۵۰)
نور محمد باقر (۳۵۱) محمد باقر (۳۵۲) میرزا باقر (۳۵۳) محمد باقر تبریزی (۳۵۴) محمد باقر خورده
(۳۵۵) باقی ماوراءالنہری (۳۵۶) باقی کرمانی (۳۵۷) میر بخاری (۳۵۸) قاضی بدیع الزماں (۳۵۹)
مولانا بلبلی یزدی (۳۶۰) بنت سالار عقیقہ (۳۶۱) بہرام میرزا (۳۶۲) بہادر خان بن خواجگی (۳۶۳)
بہادر خان (۳۶۴) مولانا بہیت (۳۶۵) شیخ بہاءالدین عاملی (۳۶۶) مولانا بیخودی سمنانی (۳۶۷)
مولانا تجلی کاشی (۳۶۸) ترابی کرمانی (۳۶۹) تسلیم (۳۷۰) میر محمد تقی کاشی (۳۷۱) محمد آتی۔
(۳۷۲) میر محمد تقی ہمدانی (۳۷۳) تقی الدین محمد بن معین الدین محمد بن سعد الدین محمد واعظ الاوحدی الحسینی
الدقاقی البلیانی ثم الصفاہانی (۳۷۴) خواجہ حسین ثنائی (۳۷۵) میرزای جاہی (۳۷۶) میرزا جانی (۳۷۷)
میرزا جانی بیگ (۳۷۸) جذبی (۳۷۹) جری (۳۸۰) جعفر اعور (۳۸۱) میر جعفر مکتب دار (۳۸۲)
جعفر رازی (۳۸۳) میر محمد جعفر مشہدی (۳۸۴) جلال الدین حسین نیشاپوری (۳۸۵) چلپلی بیگ

تبریزی (۳۸۶) جمیلہ فصیحہ (۳۸۷) ملا جمشید قصہ خوان (۳۸۸) جمیل بیگ حارثی بدخشی (۳۸۹) میر جمال الدین کازرونی (۳۹۰) محمد شریف جم (۳۹۱) حکیم حاذق (۳۹۲) قاسم بیگ حالتی (۳۹۳) حاکم بیگ (۳۹۴) حاتم کاشی (۳۹۵) مولانا حالی تبریزی (۳۹۶) شمس الدین حالی یزدی (۳۹۷) مولانا حامد شستری (۳۹۸) خواجہ حبیب اللہ (۳۹۹) حرفی صفاہانی (۴۰۰) حزمنی (۴۰۱) جذبی آوتی (۴۰۲) حسن بیگ (۴۰۳) آقا فتی حسین خوانساری (۴۰۴) حسن یزدجرد (۴۰۵) میرزا محمد حسین ابہری (۴۰۶) میرز الحسابی (۴۰۷) مولانا حسین اردبیلی (۴۰۸) بیگ گرامی شاملو (۴۰۹) میر حسن (۴۱۰) محمد حسین (۴۱۱) محمد حسین (۴۱۲) مولانا علی بیگ حشمتی (۴۱۳) مولانا حشری تبریزی (۴۱۴) میر حضوری قمی (۴۱۵) حقی خوانساری (۴۱۶) حقانی (۴۱۷) حکیم اردستانی (۴۱۸) مولانا حمد اللہ (۴۱۹) میرزا حمزہ بن ملک جلال الدین سیستانی (۴۲۰) مولانا حیاتی کاشانی (۴۲۱) مولانا حیاتی گیلانی (۴۲۲) مولانا حیدری تبریزی (۴۲۳) حیدر معمائی (۴۲۴) حیدر بیگ بن علی خان بیگ ہمدانی (۴۲۵) خان زمان (۴۲۶) خان اعظم موسوم بہ عزیز کوکہ (۴۲۷) خان خانان (۴۲۸) خاطری کاشانی (۴۲۹) خادمی لحصائی (۴۳۰) خاوری سمنانی (۴۳۱) میرزا بیگ خطلی (۴۳۲) امیر خسرو قزوینی (۴۳۳) امیر خسرو قائینی (۴۳۴) سلطان خسرو بن نور الدین جہانگیر (۴۳۵) ملا خصالی کاشی (۴۳۶) خضری (۴۳۷) مولانا خلقی شستری (۴۳۸) محمد خان شرف الدین اغلی (۴۳۹) داعی انجدانی (۴۴۰) مولانا داعی ہمدانی (۴۴۱) داخلی صفاہانی (۴۴۲) درویش محمد قصہ (۴۴۳) دیری (۴۴۴) ذوقی (۴۴۵) ذوقی اردستانی (۴۴۶) مولانا حیدر ذہنی (۴۴۷) رای منوہر (۴۴۸) رستم مرزا (۴۴۹) مولانا رشکی ہمدانی (۴۵۰) حکیم سعید رشدی (۴۵۱) رشیدا (۴۵۲) رشدی یافتی (۴۵۳) حکیم شاہ رضائی (۴۵۴) رضی الدین ارتیمانی (۴۵۵) رفعتی تبریزی (۴۵۶) رازی کمانچہ شیرازی (۴۵۷) مولانا زاہدی (۴۵۸) میر محمد زمان مشہدی (۴۵۹) زین خان کوکلتاش (۴۶۰) زین العابدین رمال اعور صفاہانی (۴۶۱) حکیم زین الدین محمد خان (۴۶۲) سام میرزا (۴۶۳) ساکائی کاشانی (۴۶۴) شیخ ثاقب (۴۶۵) محمد یوسف صادقی (۴۶۶) سارو خواجہ جریتی (۴۶۷) سیاہی بخاری (۴۶۸) مولانا سحابی (۴۶۹) میر سخی رازی (۴۷۰) مولانا سروری (۴۷۱) سری موصلی (۴۷۲) سیدائی اردستانی (۴۷۳) محمد سعید (۴۷۴) بابا سلطان تبریزی (۴۷۵) سلیم گرگانی (۴۷۶) مولانا سلوتی اردستانی (۴۷۷) امیر سنجر (۴۷۸) سنگین

بیگ شہلای بدخشی (۴۷۹) سوزی لاہوری (۴۸۰) سودائی گجراتی (۴۸۱) میاں حسن صلائی (۴۸۲)
سیری غزنوی (۴۸۳) شانی تکلو (۴۸۴) آقا شاہ پور (۴۸۵) شاہ نظر بیگ قمشہ (۴۸۶) ملک شاہ
حسین عباس (۴۸۷) میر شجاع الدین محمود صفاہانی (۴۸۸) مولانا شجاع مشہدی (۴۸۹) محمد شریف
آملی (۴۹۰) شریف سہلی (۴۹۱) محمد شریف (۴۹۲) شعوری کاشی (۴۹۳) خواجہ شعیب خوشقانی (۴۹۴)
حسین شفائی (۴۹۵) محمد رضا شکیبی صفاہانی (۴۹۶) شکیبی عطار (۴۹۷) شکوہی ہمدانی (۴۹۸) مولانا حیدر شگونی (۴۹۹) شمسای
(۵۰۰) بابا شمس (۵۰۱) ملا شمس ہمدانی (۵۰۲) شوکت (۵۰۳) مولانا شہودی (۵۰۴) شیوئی قاینی
(۵۰۵) مولانا حیدر زنگونی (۵۰۶) خواجہ محمد میرک صالحی (۵۰۷) صادقی بیگ کتابدار (۵۰۸) صالح بیگ
ہمتی آزادانی (۵۰۹) خواجہ صاین الدین علی ترکہ (۵۱۰) مولانا صبوحی (۵۱۱) امیر روزبہان صبری
(۵۱۲) غضنفر صبری (۵۱۳) صحیحی یزدجرد (۵۱۴) پسر زین العابدین واحد العین صفاہانی (۵۱۵) آقا
صفیای صفاہانی (۵۱۶) میر جلال الدین حسن صدای (۵۱۷) حسن بیگ صلائی (۵۱۸) صلحی مازندرانی
(۵۱۹) سیفلی یزدجردی (۵۲۰) محمد صالح نام ضابطی (۵۲۱) مولانا ضیاء الدین محمد کاشانی (۵۲۲) شاہ
ضیاء الدین کرمانی (۵۲۳) ضیای ششتری (۵۲۴) مولانا طاہر نائینی (۵۲۵) محمد طاہر موسوی (۵۲۶)
بابا طالب صفاہانی (۵۲۷) محمد طالب آملی (۵۲۸) میر طرمی شیرازی (۵۲۹) طفیلی گیلانی (۵۳۰) طلوعی
کشمیری (۵۳۱) شاہ طہماسپ (۵۳۲) مولانا ظہوری ترشیزی (۵۳۳) مولانا عادلی ختلانی (۵۳۴)
عاقلی (۵۳۵) حکیم عارف (۵۳۶) ابوالفتح عالمی (۵۳۷) شیخ عارف (۵۳۸) مولانا عاشقی (۵۳۹)
عاصی (۵۴۰) مولانا عاکفی گیلانی (۵۴۱) مولانا عبدالرزاق گیلانی (۵۴۲) مولانا عبدالباقی گونابادی
(۵۴۳) عبدالباقی نہاوندی (۵۴۴) میر عبدالباقی تبریزی (۵۴۵) عبدالباقی ابن میرزای صلائی صفاہانی
(۵۴۶) میر عبدالوہاب معموری عتابتی (۵۴۷) عبدالرزاق ختنی (۵۴۸) میر عبدالغفار (۵۴۹) عبیداللہ
خان ازبک (۵۵۰) عبدالوہاب فریدی (۵۵۱) عبیدی قلندر خوانساری (۵۵۲) عبیدی گونابادی
(۵۵۳) عبیدی ششتری (۵۵۴) عبادی شیرازی (۵۵۵) شیخ عبدالصمد جبل آملی (۵۵۶) شاہ عباس
(۵۵۷) عبداللہ خاں (۵۵۸) قاضی عبداللہ رازی (۵۵۹) عبداللہ قندھاری (۵۶۰) میرزا عبداللہ
جعفری (۵۶۱) مولانا عبداللہ ششتری (۵۶۲) میرزا عبداللہ نیشاپوری (۵۶۳) میر عتابی (۵۶۴)
حسن بیگ عجزی تبریزی (۵۶۵) مولانا عرفی شیرازی (۵۶۶) عرفی لاہیجی (۵۶۷) عرب صفاہانی

(۵۶۸) عزیزی تبریزی (۵) میر عزتی (۵۷۰) میرزا جان عزتی (۵۷۱) شیخ عبدالکریم عطائی
جونپوری (۵۷۲) امیر علی اکبر شاہی (۵۷۳) بابا علی جعفر (۵۷۴) مولانا علی گل استرآبادی (۵۷۵) ملا علی
رضای صوفی (۵۷۶) میر سید علی سمنانی (۵۷۷) میر علی قزوینی (۵۷۸) میر علائی یزدی (۵۷۹)
میر عزیز اللہ (۵۸۰) علی بیک دده (۵۸۱) میر علی اصغر (۵۸۲) خواجگی عنایت اللہ (۵۸۳) امیر
عنایت اللہ (۵۸۴) مولانا عہدی ساوشی (۵۸۵) میر عہدی تونی (۵۸۶) میر عہدی ورامینی (۵۸۷)
قاضی عہدی رازی (۵۸۸) عہدی قراکوئی (۵۸۹) آقا عیسی یزدی (۵۹۰) درویش عیانی (۵۹۱)
حکیم علین الملک (۵۹۲) میرزا غازی وقاری (۵۹۳) ملا غباری (۵۹۴) قاری غباری (۵۹۵)
میر غروری کاشی (۵۹۶) مولانا غزالی مشہدی (۵۹۷) قاضی غضنفر (۵۹۸) غضنفر (۵۹۹) غنی
بیگ ہمدانی (۶۰۰) میر عبدالغنی تفرشی (۶۰۱) دده غیری (۶۰۲) میر غیاث الدین نائینی (۶۰۳)
غیاث الدین منصور (۶۰۴) فارغی (۶۰۵) مولانا علی فائیقی (۶۰۶) فتوحی اردبیلی (۶۰۷) شاہ
فتح اللہ شیرازی (۶۰۸) فتح ملکابادی (۶۰۹) ملا فتح اللہ ہروی (۶۱۰) فخرای خراسکانی (۶۱۱)
فردی (۶۱۲) ملا فرج اللہ (۶۱۳) مولانا فرج اللہ شستری (۶۱۴) میرزا فرہاد بخاری (۶۱۵) میر
محمود فردی (۶۱۶) میرزا فصیحی انصاری (۶۱۷) فضولی بغدادی (۶۱۸) فضلی جرباد قانی ۔
(۶۱۹) مولانا فطرتی کشمیری (۶۲۰) حکیم فغفور (۶۲۱) فقیہی ہروی (۶۲۲) درویش فکری (۶۲۳) فکری خراسانی

(۶۲۴) خواجہ محمد رضای فکری (۶۲۵) قاضی احمد فگاری (۶۲۶) فہمی طہرانی (۶۲۷) فہمی کرباس کاشانی
(۶۲۸) فیضی ترتبتی (۶۲۹) شیخ فیضی مولانا قاطعی ہروی (۶۳۰) قاطعی (۶۳۱) قاطعی طہرانی (۶۳۲) مولانا
قاسمی (۶۳۳) قاسمی اردستانی (۶۳۴) مولانا قاسم صفاہانی (۶۳۵) قاسم (۶۳۶) قاسم دہلوی
(۶۳۷) قیلان بیگ (۶۳۸) حاجی محمد جان قدسی (۶۳۹) قدری شیرازی (۶۴۰) نورالدین محمد قراری
گیلانی (۶۴۱) قریشی خانم (۶۴۲) قنائی قزنی (۶۴۳) قسمتی استرابادی (۶۴۴) قاسم بیگ (۶۴۵)
محمد قطب شاہ (۶۴۶) قلی خان مجرم (۶۴۷) قلیچ محمد خان (۶۴۸) قوسی شستری (۶۴۹)

قیصری (۶۵۰) مولانا قیدی (۶۵۱) قاسم کاہی (۶۵۲) میرزا محمود کافری (۶۵۳) میرزا کازری (۶۵۴)
کامی سبزواری (۶۵۵) ملک سعید خلخالی کامل (۶۵۶) قوام الدین عبداللہ کامل (۶۵۷) مولانا کامل
نظیری (۶۵۸) کاملہ بیگم (۶۵۹) مولانا کاشفی بدخشانی (۶۶۰) مولانا کرمی یزدجردی (۶۶۱)

مولانا گرامی تبریزی (۶۶۲) کسوتی یزدی (۶۶۳) مولانا کسری (۶۶۴) میر محمد حسین کفری (۶۶۵)
گلشنی (۶۶۶) ابوطالب کلیم (۶۶۷) کلب بیگ تبریزی (۶۶۸) مولانا فهدی علی کشمیری الذتی
(۶۶۹) مولانا لسانی شیرازی (۶۷۰) مولانا لطفی تبریزی (۶۷۱) لطفی شیرازی (۶۷۲) مجد الدین
خوافی (۶۷۳) مولانا عبدالعلی محوی (۶۷۴) شیخ محی الدین محوی لاہیجی (۶۷۵) مولانا محمد فاضل تیین زری
(۶۷۶) مولانا محمد صوفی مازندرانی (۶۷۷) مولانا محمدی بغدادی (۶۷۸) مولانا محمد حسین خطاط تبریزی
(۶۷۹) حکیم محمد رضای مشہدی (۶۸۰) قاضی محمد رازی اصفہانی (۶۸۱) آقا محمد قمی (۶۸۲) مولانا محمد
جامی (۶۸۳) مولانا محمد علی کاشی (۶۸۴) میر محمود گیلانی (۶۸۵) میر سید محمد (۶۸۶) محب مداح
شیرازی (۶۸۷) محمد بیگ (۶۸۸) شیخ محمد شیرازی (۶۸۹) خواجہ محمد (۶۹۰) میر محمد کسکن سبزواری
(۶۹۱) مولانا محبی شاملو (۶۹۲) محبی شیرازی (۶۹۳) مولانا شیخ محمد حکاک تبریزی (۶۹۴) مولانا
محمد خباز واحد العین صفاہانی (۶۹۵) میر مجازی (۶۹۶) میرزا محمد حکیم (۶۹۷) میر مغیث الدین
محوی ہمدانی (۶۹۸) میرزا محمد رازی (۶۹۹) محمود رازی (۷۰۰) محمد حسین (۷۰۱) محمد حسن رازی
(۷۰۲) محسن خلقی یزدی (۷۰۳) مولانا مزاری (۷۰۴) مولانا محمد مرشد (۷۰۵) شاہ مرتضی ارتیمانی
(۷۰۶) مرشد شاہی یزدی بروجردی (۷۰۷) میرزا مراد (۷۰۸) مسیب خان تکلو (۷۰۹) حکیم رکن الدین
(۷۱۰) مسعود کاشانی مسیح (۷۱۱) مولانا مسعود یزدی (۷۱۲) نجم الدین مسعود ہروی (۷۱۳) مولانا
مسعود بیگی (۷۱۴) مولانا محمد امین مستغنی (۷۱۵) شیخ ماکہن سنبھلی (۷۱۶) مرزا مشرقی تکلو (۷۱۷)
مرزا ملک مشرقی (۷۱۸) میر مصطفیٰ (۷۱۹) مظفر کاشی (۷۲۰) مظفر (۷۲۱) مظہری کشمیری (۷۲۲) مولانا معین
(۷۲۳) مولانا معین الدین عبداللہ شیرازی (۷۲۴) امیر عبداللہ شیخ معین الدین محمد شیخ سعد الدین محمد
الاوحدی الدقاقی الحسینی البلیانی (۷۲۵) معز الدین آقا ملک (۷۲۶) محمد یحییٰ (۷۲۷) مولانا علی معافی (۷۲۸)
مقصدی ہمدانی (۷۲۹) مقصود بیگ (۷۳۰) ملک قمی (۷۳۱) ملک طیغور انجدانی (۷۳۲) مولانا ملک
محمد طوفی (۷۳۳) آقا ملک صفاہانی (۷۳۴) میرزا ملکی (۷۳۵) مولانا ملہمی تبریزی (۷۳۶) ملہم بن ہمن
(۷۳۷) خواجہ ملا کازرونی (۷۳۸) میر منتہی (۷۳۹) شیخ منصور کاشانی (۷۴۰) مولانا عبدالحق منصف
(۷۴۱) موتسی شستری (۷۴۲) محمد مومن سلطان ترکان (۷۴۳) محمد مومن سبزواری (۷۴۴)
مولانا محمد مومن حسین یزدی (۷۴۵) محمد مومن ابرقوہی (۷۴۶) مہدی قلی سلطان افشار (۷۴۷)

مہابت خان (۷۴۸) میرزا ... (۷۴۹) میرزا میرک بیگ (۷۵۰) میلی (۷۵۱) میر غیاث الدین محمد میر میران (۷۵۲) محمد نادری سیال کوتی (۷۵۳) شمسی نامی (۷۵۴) میر محمد معصوم خان نامی (۷۵۵) نورانی نامی (۷۵۶) علی خان نامی (۷۵۷) مولانا ناطق (۷۵۸) ملا ناجی کاشی (۷۵۹) بابا ناجی شروانی (۷۶۰) ناقد گیلانی (۷۶۱) نجاتی شیرازی (۷۶۲) مولانا نظری کاشی (۷۶۳) خواجہ نصیر ہمدانی (۷۶۴) نظام کلاغ قزوینی (۷۶۵) سید نظام غرہ (۷۶۶) میر نظام الملک دست غیب (۷۶۷) حکیم نظام الدین علی (۷۶۸) درویش نظام مشہدی (۷۶۹) مولانا محمد حسین المشہور بانظیری نیشاپوری (۷۷۰) نعیم خیاط (۷۷۱) سید نعمت اللہ (۷۷۲) فقیر نامی (۷۷۳) مولانا نفیسی کاشانی (۷۷۴) شیخ علی نقی کمرہ (۷۷۵) میر نقیب خان قزوینی (۷۷۶) نورالدین جہانگیر بن جلال الدین اکبر بادشاہ بن محمد ہمایوں (۷۷۷) قاضی نورالدین محمد صفاہانی (۷۷۸) نیازی بدخشانی (۷۷۹) واحد صفاہانی (۷۸۰) میر والہی (۷۸۱) محمد امین وجدی کرمانی (۷۸۲) مولانا وجہی گرد (۷۸۳) نورالہدیٰ بن میر محمود شبوشتانی (۷۸۴) مولانا محمد رضای نوعی خبوشانی (۷۸۵) نیکی صفاہانی (۷۸۶) نیکی (۷۸۷) مولانا ولی دشت بیاضی (۷۸۸) ہماسبقلی بیگ وہمی (۷۸۹) محمد ہاشم مروی (۷۹۰) ہجری شمشیر قمی (۷۹۱) وجہی ہروی (۷۹۲) مولانا وحشی بافقی (۷۹۳) میر وحدتی (۷۹۴) مولانا وضعی (۷۹۵) مولانا وصلی صفاہانی (۷۹۶) ولائی استرابادی (۷۹۷) ہمدم کوکہ (۷۹۸) ہمدی شیرازی (۷۹۹) مولانا یاری تردی (۸۰۰) یعقوب میرزای استاجلو (۸۰۱) یقینی مشہدی (۸۰۲) امیر یوسف امم (۸۰۳) یوسف بیگ (۸۰۴) یوسفی زرگرد (۸۰۵) میرزا یوسف خان۔

"کعبہ عرفان" میں جن شعرا کے کلام میں کوئی رباعی نہ ملی ان شعرا کو "گلدستہ" میں نہیں رکھا گیا ہے۔ لہذا رکن ممانی (شعرای متوسطین) کے عرصہ حرف 'ذ'، و عرصہ حرف 'ظ' کے ایک بھی شاعر کو شامل "گلدستہ" نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ عبدالوہاب عالمگیر نے "رباعی ننوشتہ بود" لکھی ہے۔ شعرا کے حالات بیان کرنے میں اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ کہیں کہیں صرف شاعر کا نام لکھ کر ہی اسکا کلام دیدیا ہے جیسے فتوحی اربیلی[۲]، میر عمادی تونی[۳]، حکیم عہدی ورائینی[۴] و علی بیگ[۵] وغیرہ بہت سے شعرا کے تراجم میں اہم

۱- ماخوذ از برگ ۵۳ (ب) و برگ ۱۶۰ (الف) گلدستہ خطی (خدا بخش)

۲- گلدستہ خطی برگ ۱۰۸ (ب)، ۳-۴- برگ ۱۳۵ (الف) ایضاً، ۵- برگ ۱۳۴ (ب)

واقعات کی تواریخ بھی دی گئی ہیں مگر کاتب نے سنین میں صفر کو کہیں بھی نہیں لگایا ہے جیسے برگ ۱۱۰ (الف) پر ۱۳۶ھ بجائے ۱۰۳۶ھ، برگ ۱۳(الف) پر ۱۱۴ھ بجائے ۱۰۱۴ھ اور برگ ۸۹(الف) پر ۱۲۲ھ بجائے ۱۰۲۲ھ وغیرہ۔

نمونۂ تراجم: حکیم عمر خیام

"عرفہ حکیم عمر خیام ہمدرس خواجہ نظام الملک طوسی و حسن صباح آخر در علامتیر در آمده سرآمد صاحب کمالان زمان خود بوده چنانچہ سلطان سنجر سلجوقی او را با خود یک تخت نشانده، ہمیشہ بیخود و سرمست بودی، گویند بعد از وفات وی والده اش بدرگاہی الٰہی تضرع استدعای مغفرت بجہت وی کردی. یک شب در واقعہ این رباعی بما درخوانده:

ای سوختہ سوختہ سوختنی — وی آتش دوزخ از تو افروختنی
تا کہ گوئی کہ بر عمر رحمت کن — حق را تو کی برحمت آموختنی

ولہ:

گویند بحشر گفتگو خواہد بود — وآن یار عزیز تند خو خواہد بود
از خیر محض جز نکوئی ناید — خوش باش کہ عاقبت نکو خواہد بود

گر بادہ خوری با خردمندان خور — یا با صنمی لالہ رخی خندان خور
بسیار مخور فاش مکن در دہ ساز — اندک خور و گہ گہی خور و پنہان خور

ایزد چو نخواست آنچہ ما خواستہ ایم — کی گردد راست آنچہ ما خواستہ ایم
گر ہست صواب آنچہ او خواستہ است — پس جملہ خطاست آنچہ ما خواستہ ایم

آباد خرابات ز می خوردن ماست — خون دو ہزار توبہ در گردن ماست
گر ما نکنیم جرم رحمت کہ کند — آرایش رحمت از گنہ کردن ماست

برخیز مخور غم جہان گذران — برخیز و جہان بشادکامی گذران
در طبع جہان اگر وفائی بودی — نوبت بتو خود نیامدی از دگران

دانی ز چہ روی افتاد ست و چہ راه — آزادی سرو و سوسن اندر افواه
کین دارد صد زبان لیکن خاموش — وآن دارد صد دست ولیکن کوتاه (گلدستہ برگ ۱۲)

۱۔ "مہ تازہ رخی" عرفات العاشقین برگ ۲۱۳(الف) ایضاً ۲۔ "خرابات" برگ ۱۰(ب) ایضاً ۳۔ "برخیزه" ایضاً ۴۔ این رباعی در عرفات نیامده۔

نمونۂ دیگر: بہرام میرزا

"عرفہ۔ بادشاہ زادہ کامگار نامدار عالی مقدار ابوالفتح بہرام میرزا ابن شاہ اسمعیل حیدر حسینی در نہایت ابہت و جلالت در پرورش فضلا و شعرا و اہل تاریخ میکوشید، قندہار را از برادر بزرگوار خود شاہ طہماسپ یافت، مدتہا خود و فرزندان درانجا سروری کردہ اند۔ 'لب التواریخ' بنام وی نوشتہ شدہ۔ از دست:

بہرام درین خرابۂ پر شر و شور — تاکی بحیات خویش باشی مغرور
کردہ ست درین خرابہ صیاد اجل — در ہر قدمی ہزار بہرام بگور
افسوس کہ در خیال خوابیم ہمہ — پیوستہ[2] بفکر ناصوابیم ہمہ
در پردۂ ظلمت و حجابیم ہمہ — از شوخی نفس در عذابیم ہمہ" (گلدستہ برگ ۸۵)

"گلدستہ" میں میرزا یوسف خاں کے عرفہ کے بعد جس طرح تذکرہ "عرفات العاشقین" ختم ہو جاتا ہے اسی طرح "گلدستہ" میں تذکرہ کا حصہ برگ ۱۰۴ (الف) پر تمام ہو جاتا ہے۔ اگلا صفحہ سادہ ہے۔ صرف حاشیہ پر یہ شعر درج ہے:

رخت یوسف لبت عیسیٰ خطت خضر — بیک صورت سہ پیغمبر کہ دیدست

اس کے بعد دوسرے صفحہ سے شیخ عمر خیام کا مندرجہ ذیل بیان شروع ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلے صفحہ ۱۰۱ الف پر تذکرہ کے متن میں بھی عمر خیام کا بیان موجود ہے:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ در تاریخ قدما مسطور ست کہ وفات ملک الحکما مولانا ی عمر خیام نیشاپوری در سنہ سبع عشر و خمسمایہ بود، او در حکمت یگانہ و عالم زمانہ خود بود، خواجہ[3] نظامی سمرقندی کہ یکی از شاگردان او بود، حکایت میکند کہ در بلخ امام الحکما مولانا ی عمر خیام اتفاق افتاد، در اثناء سخن میگفت کہ قبر من در موضعی باشد کہ ہر بہار باشمال بر و گل افشانی کند مرا ازین سخن تعجب آمد، اما دانستم کہ او سخن گذاف نگوید، تا بعد ازان بچند گاہ نیشاپور بسر قرار رفتم کہ قبر او در کنار دیوار باغ بود، درختان میوہ دار مراز دیوار باغ بر آوردہ چندان شگوفۂ گل بر سر قبر او ریختہ بود کہ قبر او در میان نمی نمود، او را رباعی بسیار ست، حکمت

۱۔ "گلدستہ" عرفات العاشقین برگ ۱۰۰ (الف) جلد ۱۔ — ۲۔ "سرگشتہ" تذکرۂ ایضاً برگ ۱۵۵ (ب)

۳۔ خواجہ نظامی عروضی سمرقندی نے بھی اپنے "چہار مقالہ" میں ان حکایات کو درج کیا ہے۔ اس کے علاوہ "طرب خانہ" تصنیف یار احمد بن حسین رشیدی تبریزی نے بھی ان واقعات کی تفصیل دی ہے۔ دیکھئے کتاب مذکور ص ۱۴۰۔ اس کے بعد کتاب "حکیم عمر خیام" تالیف ابوالمکارم سلیم اللہ فہمی (اردو) میں بھی اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

آمیختہ اما در شرع بعضی سخنان او ممنوع میدارند از ان جملہ یک سبب رباعی نوشتہ کہ بعد از وفات او مادرش بخواب دیدہ پرسید کہ ای فرزند حق تعالیٰ با تو چہ کرد این رباعی بر مادر خواند چو مادر عمر از خواب بیدار شد این رباعی یاد داشت۔ بعد ازان مشہور شد و آن رباعی اینست:

ای سوختہ سوختہ سوختنی ۔۔۔ وی آتش دوزخ از تو افروختنی

تا کہ گوئی بر عمر رحمت کن ۔۔۔ حق را تو کی برحمت آموختنی " (گلدستہ برگ ۱۰۵)

"گلدستہ میں عمر خیام ہی ایک ایسا شاعر ہے جس کا بیان دو مرتبہ آیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عبدالوہاب عالمگیر کو رباعیات سے بے حد دلچسپی تھی اسی وجہ سے اس نے عمر خیام کی مزید رباعیات کو حروف تہجی کے اعتبار سے "الف" تا "دال" اوپر دیئے ہوئے بیان کے بعد سپرد قلم کیا ہے۔ رباعیات کے اس سلسلہ کے بعد کچھ اور منظوم کلام بھی ہے۔ جن کے عناوین سرخ روشنائی سے بالحاظ ابتث مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) برق (۲) بادام (۳) بوریا (۴) پستہ (۵) پل (۶) پیری (۷) پیوند (۸) پیمانہ (۹) پرکار و مرکز (۱۰) تیر و کمان (۱۱) تیغ (۱۲) توکل (۱۳) تمکین (۱۴) تخال (۱۵) ترازو (۱۶) تنور (۱۷) تاک (۱۸) توبہ (۱۹) جام (۲۰) چین جبین (۲۱) چشم (۲۲) چنار (۲۳) چراغ (۲۴) خاموشی (۲۵) خم و خشت خم (۲۶) خم افلاطون (۲۷) خانہ زین (۲۸) خضر (۲۹) خواب (۳۰) خط (۳۱) خال (۳۲) دہن (۳۳) دندان (۳۴) داغ (۳۵) درد (۳۶) دختر رز (۳۷) دام (۳۸) دستار و جبہ (۳۹) دل (۴۰) رشتہ و گہر (۴۱) روز و شب (۴۲) ریگ روان (۴۳) رگ گردن (۴۴) زنبور (۴۵) زلف و کاکل (۴۶) زخم و بخیہ (۴۷) سبو (۴۸) سفال و ریحان (۴۹) سیب زنخدان (۵۰) سوختہ و شرر (۵۱) ساغر (۵۲) سرو (۵۳) سہیل (۵۴) سایل و فقر و درویش (۵۵) سپند و مجمر (۵۶) سیماب (۵۷) سیل (۵۸) شمع پروانہ (۵۹) شب آدینہ (۶۰) شبنم (۶۱) شگوفہ (۶۲) شیشہ (۶۳) شیر و نیستان (۶۴) شہباز (۶۵) صندل (۶۶) طفل و دیوانہ (۶۷) غربال (۶۸) فلاخن (۶۹) فتراک (۷۰) فرہاد و تیشہ (۷۱) قبلہ و قبلہ نما (۷۲) قلم و خامہ و سخن (۷۳) قد و قامت (۷۴) قلاب و نشست و ماہی و فلس (۷۵) قافلہ (۷۶) قفس (۷۷) قارون (۷۸) قفل و کلید (۷۹) کعبہ و بتخانہ (۸۰) کاہ و کہربا (۸۱) کبک و کہسار (۸۲) کنج و ویرانہ و جغد (۸۳) کاروان (۸۴) کباب و نمک (۸۵) کمند (۸۶) کشتی و لنگر (۸۷) گرد یتیمی (۸۹) گہوارہ (۹۰) گوی و چوگان (۹۱) گردباد (۹۲) گرداب (۹۳) گل و گلشن و گلاب (۹۴) گہر و صدف

(۹۵) گل رعنا (۹۶) لالہ (۹۷) لیلیٰ مجنوں (۹۸) محراب (۹۹) محمود و ایاز (۱۰۰) موج و سراب (۱۰۱) موی میان (۱۰۲) مکا ت (۱۰۳) مور و خرمن (۱۰۴) مور و سلیمان (۱۰۵) مہ احسان (۱۰۶) مہتاب (۱۰۷) مرجان (۱۰۸) مومیائی (۱۰۹) منصور و دار (۱۱۰) نامہ و پیغام (۱۱۱) نگین و خاتم (۱۱۲) نرگس (۱۱۳) نقاب (۱۱۴) نی (۱۱۵) ہلال و آفتاب (۱۱۶) ہما و استخوان (۱۱۷) ہالہ (۱۱۸) یعقوب و یوسف۔

نمونۂ کلامِ منظومہ: "شبِ آدینہ"

مستان ز قید شنبہ و آدینہ فارغ اند   رو در پیالہ پشت ... کردہ اند
در جوانی ز مئی ناب گذشتن ستم است   شنبہ خود شب آدینہ نمی باید کرد
منکہ بودم رونق کوی خرابات این زمان   آفتاب شنبہ و ابر شب آدینہ ام" (گلدستہ ۲۴۴ الف)

نمونہ دیگر کلام منظومہ: "ریگ روان"

شوخ چوں ریگ روان منزل نمیداند کہ چیست   موج ایں دریا لب ساحل نمیداند کہ چیست
حال ما راہ روان آبلہ پائی داند و،   کہ نفس سوختہ در ریگ روان افتادست
در صراط مستقیم عشق عقل خواجہ بیں   در دل شب راہ در ریگ روان گم کردست"

"گلدستہ" کلام منظومہ کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ گلدستہ میں اس کلام منظومہ کے ساتھ ساتھ ۷۹۵ علما، فضلا، حکما، ظرفا، اعلیٰ اور ادنیٰ مرد و زن کی چنیدہ رباعیات کا بہت بڑا خزانہ ہے۔ اس میں درج شعرا کے حالات و تاریخی واقعات کی بنا پر فارسی شاعری کی ابتدا سے لے کر عہد جہانگیری تک کے شعرا پر کام کرنے والے محققین و ناقدین وغیرہ کیلئے "عرفات العاشقین" کے ساتھ ایک مزید اہم نسخہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۱۰۲۴ھ میں "عرفات العاشقین" مکمل ہوئی اُس کے بعد سے ۱۰۳۶ھ تک یعنی تکمیل "کعبۂ عرفان" تک جن مزید شعرا کی دریافت اور ملاقات تقی الدین اوحدی سے ہوئی ان کا اضافہ اس نے "کعبۂ عرفان" میں کیا۔ جس کو "گلدستہ" میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس طرح "عرفات العاشقین" کے ساتھ "گلدستہ" کا اپنا مقام ہے۔ "عرفات العاشقین" اگر آسمانِ ادب کا درخشاں آفتاب ہے تو "گلدستہ" ماہِ تاباں سے کم نہیں۔
یہ نسخہ شریفہ ہمارے اسلاف کے انمول آثار میں سے ایک بے بہا سرمایہ ہے۔ یہ ہمارا قومی فرض ہے کہ ہم اس کو طباعت کے وسایل جدیدہ کے ذریعہ سدا کے لیے محفوظ کر لیں اور اپنے سنہرے ماضی کی عظمت کو سمجھیں۔ ●●

ڈاکٹر ایرکن ترکمان
(رئیس شعبۂ اردو، سلجوق یونیورسٹی، قونیہ، ترکی)

سجّاد حیدر یلدرم اور ان کے ترکی تراجم

سجاد حیدر یلدرم ہندوستان اور پاکستان کے ممتاز افسانہ نگاروں میں سے ہیں۔ ان کی شہرت اس لیے زیادہ ہے کہ وہ اردو کے پہلے افسانہ نگار خیال کیے جاتے ہیں۔ اس شہرت میں ان ترکی افسانہ نگاروں کا بھی حصہ ہے جنکے افسانوں کا انھوں نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اردو شاعری میں بھی وسط ایشیا کے مہاجرین ترکوں نے دل کھول کر حصہ لیا تھا۔ اور اب ہمیں اس بات پر بھی فخر ہے کہ ترکی افسانوں نے اردو کے جدید افسانوی ادب پر بھی اثر ڈالا ہے۔ اور یہ اثر سجاد حیدر یلدرم کی خداداد قابلیت کے ڈھلنے بچے میں ڈھل کر اور اردو طرز بیان کا لباس پہن کر کامیاب ہوا ہے وگرنہ ترکی سے لغوی ترجمے پھیکے پھیکے، بے لذت اور مغلق ہوتے۔ حیدر یلدرم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ترجمان کو صرف ترجمان ہی نہیں بلکہ ادیب بھی ہونا چاہیے۔ حیدر صاحب کے بہت سے افسانے ترکی سے ترجمہ ہیں اس لحاظ سے پطرس بخاری کے اس بیان میں کچھ مبالغہ نظر آتا ہے:۔

"یہ محض ان کا حسن بیان ہے یا محض انکسار جو انھیں ایک نئی تکنیک برتنے کی معذرت کے طور پر برتنا پڑا۔ چند داخلی شہادتوں کی بنا پر مجھے شبہ ہے کہ یہ تراجم دراصل تقریباً طبعزاد تخلیقات ہیں اور جیسا سمجھا جاتا ہے اس سے کہیں زیادہ اوریجنل واقع ہوئی ہیں"۔ (پگڈنڈی، امرتسر جلد ۹، شمارہ ۵، ۱۹۶۱ء ص ۱۰۴)

میرے ہم کار اور بھائی جناب ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے بھی پطرس کا حوالہ دینے کے بعد یوں فرمایا ہے:۔

"یلدرم کی ان نگارشات کا مقابلہ، اصل ترکی تصانیف سے ابھی تک نہیں کیا جاسکا ہے اس لیے وثوق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ یلدرم کس حد تک "نرے مترجم" ہیں لیکن اگر محض داخلی شواہد کچھ معنی رکھتے ہوں تو یلدرم کے ان چار "مبیّنہ تراجم" میں سے کم از کم "صحبتِ ناجنس" کے بارے میں وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یہ پورم پور طبعزاد ہے"۔ (ڈاکٹر سید معین، خیالستان ص ۱۹)

ہم نے معین الرحمٰن صاحب کے اس بیان کو ایک اشارہ سمجھ کر لسانیات کے ماہر اور صوفی شاعری سے لگاؤ نہ رکھنے کے باوجود یلدرم کی نگارشات کا مقابلہ ترکی متون سے کرنے کا سلسلہ جاری کیا ہے۔ اس سے

پہلے مفصل طور پر میں نے مشہور ادیب احمد حکمت مفتی اوغلو کی اصل تصنیف "لانہ منکسر" (ٹوٹا ہوا گھونسلا یا گھر) اور "ثالث بالخیر" کا مقابلہ انگریزی اور ترکی میں کیا تھا۔ یہ مقابلہ چونکہ طویل تھا اس لئے میں نے اب اور بھی اختصار سے کام لیکر یلدرم کے وہ تین تراجم جو انہوں نے ترکی سے کیے ہیں یعنی (۱) "ثالث بالخیر" (۲) "صحبتِ ناجنس" (۳) "خارستان وگلستان" کا مقابلہ ایک جگہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تینوں افسانے ایک ہی ادیب کے قلم سے نکلے ہیں اور وہ ہیں احمد حکمت مفتی اوغلو۔ ان تراجم کے بارے میں کچھ لکھنے سے پہلے یہ بجا ہوگا کہ ہم اس مصنف کے متعلق مختصر سی معلومات دیں:

احمد حکمت مفتی اوغلو ۱۸۷۰ء میں استنبول میں پیدا ہوئے[۱] آپ کے والد یحیٰی سنرائی آفندی وسط درجہ کے شاعر تھے لیکن آپ بہت ہی نیک اور خدا پرست آدمی تھے۔ سات سال کی عمر تھی کہ والد صاحب کا انتقال ہوگیا۔ بڑے بھائی نے آپکی پرورش کی۔ تعلیم، استنبول کے گلاتا سرائے کے اسکول میں پائی اور اس طالب علمی کے زمانہ میں فرانسیسی سے ترجمے کرنے شروع کر دیئے۔ والد کی طرح جوانی میں اشعار بھی کہے لیکن بعد میں اپنا پورا رجحان افسانہ نگاری کی طرف موقوف کر دیا۔ تعلیم کے بعد آپ قونصل کی حیثیت سے یورپ چلے گئے۔ یورپ جانے سے پہلے کچھ عرصے کے لیے گلاتا سرائے کے اسکول میں پروفیسر بھی رہے تھے۔ آپکا انتقال ۱۹۲۷ء میں ہوا[۲]۔

احمد حکمت نے ترکی کے سب سے پہلے ملی رسالہ "ثروتِ فنون" میں حصہ لیا۔ یہ ایک قومی رسالہ تھا۔ چونکہ وہ ترک قومیت کے قائل تھے اس لئے ان کی تصانیف میں یورپین طرز زندگی کی جگہ ترکی طرز زندگی کو اپنایا گیا ہے۔ جگہ جگہ انہوں نے یورپ کی نقالی کی ہجو کی ہے۔

ان کی سب سے مشہور تصانیف یہ ہیں: (۱) خارستان وگلستان (۲) چاغلیانلار (۳) گونل خانم وغیرہ۔ وہ یحیٰی کمال، محمد عاکف، ضیا گوک الپ، عمر سیف الدین جیسے مشہور شاعر اور ادیب نہیں ہیں تاہم ان کا شمار قومیت پرست ادیبوں میں ہوتا ہے[۳]۔ انھوں نے ترکی قوم اور تمدن کے بارے میں بہت سے مقالے بھی لکھے ہیں۔

۱۔ حکمت رزدار اوغلو، مفتی اوغلو احمد حکمت، ترک دل قورومو، آنقرہ ۱۹۶۴ء

۲۔ ڈاکٹر فتحی توت اوغلو، مفتی اوغلو احمد حکمت، ترکش کلچر اینڈ ٹورزم منسٹری آنقرہ ۱۹۸۰ء نمبر ۲۶۶ ص ۳۰

۳۔ نہاد سامی بنارلی، رسملی ترک ادبیات تاریخی، جلد ۲، ص ۱۰۰۲

۱۔ ثالث بالخیر (لڑکی کی کارستانی)

عنوان:۔ ترکی کے اصل افسانے کا عنوان "لانہ امنکسر"[۱] ہے جس کو حیدر صاحب نے بدل کر "ثالث بالخیر یا لڑکی کی کارستانی" میں تبدیل کر دیا۔ یہاں شریر لڑکی سے مراد رعنا ہے جس نے بچھڑے ہوئے ماں باپ کو بڑی عقلمندی (کارستانی) سے پھر ملا دیا۔

کردار:۔ کہانی کے چار بڑے کردار ہیں ۱۔ نریمان (شوہر) ۲۔ مہربان (بیوی) ۳۔ رعنا (لڑکی) ۴۔ نریمان کی محبوبہ حمرا۔ ان سب کرداروں کے نام جوں کے توں ترجمے میں استعمال ہوئے ہیں سوائے نریمان کے جس کا نام اردو متن میں رمزی ہو گیا ہے۔ یہ نام کی تبدیلی کس بنا پر ہوئی معلوم نہیں۔

کہانی کا خاکہ:۔ کہانی بہت ہی سادی ہے۔ نریمان ایک قصبے سے آکر استنبول میں رہنے لگتا ہے اور اس شہر میں امیر ہو جاتا ہے۔ اس کی شادی یورپ کے ایک شیدائی کی لڑکی مہربان سے ہو جاتی ہے۔ لیکن نریمان اپنی رشتہ دار لڑکی حمرا' جو بہت جدید طرز کی لڑکی ہے' پر عاشق ہو جاتا ہے۔ اور اپنی سادہ لوح بیگم کو پسند نہیں کرتا حمرا نریمان سے شادی نہیں کرنا چاہتی اس پر نریمان سکون دل کے لئے یورپ چلا جاتا ہے۔ لیکن اُسے وہاں بجائے خوشی کے درد اور وطن کی حسرت کے اور کچھ نہیں ملتا۔ کئی سال کے بعد استنبول واپس آتا ہے تو اس کی عقلمند لڑکی رعنا (یعنی ثالث بالخیر) جس نے ترکی ہی میں اپنی ماں کی نگرانی میں تعلیم پائی تھی نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ بچھڑے ہوئے ماں باپ کو ملا دیا۔ رعنا چونکہ یورپین طرز کی زندگی سے ذرا دور رہی تھی اور پرانے ماحول میں پلی پھولی تھی، اس لئے وہ اپنے ماں باپ کی طرح نمائشی نہ بنی۔

مضمون:۔ مضمون مترجم اور مصنف دونوں کا ایک ہی ہے لیکن مقاصد میں کچھ تبدیلی نظر آتی ہے۔ یہ کہانی یورپ پرستوں کے لیے نہیں لکھی گئی[۲] بلکہ یورپ پرستی کے خلاف ہے۔ اب چونکہ حیدر یلدرم صاحب کو "ثروت فنون" کے مصنفین کے بارے میں زیادہ معلومات نہ تھیں اس لئے انہوں نے احمد حکمت کو مغربیت پسند خیال کیا حالانکہ بات بالکل الٹی ہے۔ احمد حکمت مغربیت نہیں ترکیت کی طرف رجحان رکھتے تھے۔ ان کی رعنا وہ صاف ستھری لڑکی ہے جس نے یورپ کے بجائے اپنے آبا و اجداد سے سبق لیا ہے۔ اس لحاظ سے مترجم نے متن میں جابجا اصل خیال اور طنز گوئی سے لقدرے گریز کیا ہے۔

۱۔ یہ نیلی ویا خوذ مجموعہ نگ انتقامی کا ترجمہ نہیں ہے جیسے کہ پروفیسر اکمل ایوبی خیال کرتے ہیں (اردو کے ترکی ترجمے" نوائے ادب" بمبئی جلد ۱۳ نمبر ۲ ص ۴۵۔ ۲۔ دیکھئے حیدر یلدرم "ثالث بالخیر" لکھنؤ ۱۹۳۲ (مقدمہ ج)

زبان:۔ احمد حکمت نے جدید ترکی میں نہیں، عثمانی میں لکھا ہے جس میں لاتعداد عربی اور فارسی کے الفاظ اور محاورے ملتے ہیں جیسے :۔ "رخنہ دار"، ساختہ عشوہ "اضمحلال"، مرارت "، "انفعال خود کام" امتزاج" "استہزا"، "معذب"، "ستمدیدہ" "احتیال"، وغیرہ جو اردو میں بھی استعمال ہو سکتے تھے لیکن حیدر نے انھیں سادی اور سلیس اردو میں نقل کر دیا۔۔ اسلوب بیان ہندوستانی ہے، ترکی نہیں۔ متن میں جہاں جہاں خالص ترکی طرز یا مناظر آئے ہیں انھیں ہندوستانی انداز میں ڈھال دیا ہے۔ چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔[1]

ا۔ "سیاہ نقاب کے نیچے تم نے اپنے بالوں کو قید کر رکھا ہے وہ بیچارے تڑپ رہے ہیں" جو ترکی میں یوں تھا، نقاب کے مایوس سیاہ رنگ کے نیچے زرد بال گویا رو رہے ہیں کیا کوئی دوسرا ذرا اشفاف نقاب آپ کے پاس نہیں ؟"

۲۔ "لو میں گڑیا بنی جاتی ہوں"، ترکی کے جملے "مجھے ایک تصویر کی طرح سجا"، کا ترجمہ ہے اور " وہ نیلی آنکھوں کے چاروں طرف ایک سیاہ ہالہ بنا" کی جگہ "پلکوں کو کھول کر اُن نیلی آنکھوں میں ایک خطِ سیاہ کھینچ دیا" سے یہ ظاہر ہے کہ حیدر صاحب نے وہ تفصیلات جو ہندوستانیوں کے لئے پرائی تھیں تبدیل کر دیں۔ جدید زندگی میں سرمہ آنکھوں میں نہیں بلکہ آنکھوں کے ارد گرد لگایا جاتا ہے۔

۳۔ بعض اوقات مترجم نے کوئی سین گرا دیئے ہیں اور یا تو بالکل ہی بدل ڈالے ہیں مثلاً "اسوقت تم ستم ڈھا رہی ہو، اُف کیا حسن کا عالم ہے!"، یہ ترکی کے اس سادہ جملے کا ترجمہ ہے "اُف اس وقت آپ کتنی حسین ہیں"، اور "جانے کیا بک رہے ہو، چپ بھی رہو"، ایک ہندوستانی عورت کے منہ سے نکلا ہوا یہ بے لاگ جملہ ترکی ادب کے لحاظ سے سخت ہے اور اصل میں ترکی یوں ہے" ہاں میں جانتی ہوں اسلیے آپ خاموش رہیے"۔

۴۔ ثالث بالخیر دوسرے تراجم کے لحاظ سے سادہ، مگر خیالات اور تصویر کے لحاظ سے اصل متن سے ذرا ضعیف ہے۔ تاہم مترجم نے ادبی مزاج کا خیال رکھ کر "لانہ منکسر" کا ہو بہو ترجمہ نہیں بلکہ ہندوستانی مذاق کے مطابق اقتباس کیا ہے۔ اور کئی جگہ پر اردو کے ایسے الفاظ یا محاورے استعمال کئے ہیں جو ترکی زبان سے کافی مختلف ہیں مثلاً "ناامیدی اور غم کی تصویر بنی رہتی ہے"، "مگر موت مانگے نہیں آتی"، "مادرانہ حقوق

ا۔ تفصیلات کے لیے دیکھئے میرا انگریزی مقالہ
SEJJAD HAYDAR YILDIRIM'S TRANSLATIONS, "KHUDA BAKHSH ORIENTAL PUBLIC LIBRARY, PATNA 1986".

جتائے،، "اس کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی" "امیدوں پر پانی پھر گیا" یہ وہ اوصاف ہیں جو ہر مترجم میں ملنے چاہیں۔

۲۔ صحبتِ ناجنس

عنوان :۔ احمد حکمت مفتی اوغلو کے "ایکی مکتوب،، (دو خط) کا ترجمہ ہے۔ "صحبتِ ناجنس" کے ساتھ ساتھ "عذرا دن سلمایہ" (عذرا کی طرف سے سلما کو) کا عنوان بھی ملتا ہے۔ اردو میں اس کے مقابل "دو لڑکیوں میں خط و کتابت،، کا جملہ موجود ہے۔[۱]

کردار :۔ دو لڑکیاں "سلما اور عذرا"۔ ان ناموں میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ اتنا ضرور ہے کہ اردو میں ایرانی نوکرانی "دور دانہ خانم" ملتی ہے اور ترکی میں "فتینہ" ایک یونانی عورت ملتی ہے۔

کہانی کا خاکہ :۔ عذرا، سلما کو خط لکھ کر اپنے شوہر کی بری عادتوں کی جو پرانے ترکی رسم و رواج کے مطابق ہیں، شکایت کرتی ہے۔ چونکہ عذرا نے یورپ (فرنچ) کی طرزِ زندگی گذاری تھی اس لئے وہ اپنے شوہر کو بدمزاج اور ناشائستہ خیال کرتی ہے۔ سلما بھی اپنے شوہر سے خوش نہیں زیرا اُس کا شوہر بالکل یورپین طرزِ زندگی بسر کرتا ہے۔ ان دونوں خطوط میں یورپی اور مشرقی زندگی کا تصادم موجود ہے۔ مصنف نے جدید زندگی کی ہجو کی ہے۔

مضمون :۔ مترجم نے پھر خطوط کو ہندوستانی رنگ میں ڈھالا ہے۔ خط کے شروع ہی میں "حیدرآباد دکن ۲۴ ستمبر ۱۹۲۵،، اور "راولپنڈی ۳۰ اکتوبر ۱۹۲۵،، کی عبارتیں ملتی ہیں۔ اصل خط استنبول سے سلانیک کی طرف لکھا گیا ہے۔ سلانیک اب یونانستان میں ہے۔ ترجمہ میں زبان اور اسلوب بیان کا فرق ضرور موجود ہے مگر مضمون پورم پور وہی ہے۔ دو تین پیراگراف حذف کئے گئے ہیں جن سے متن کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے۔ مترجم نے اس کے علاوہ جگہوں کا نام بھی بدل دیا ہے عذرا کا خط ایک عورت جسکا نام "عادلہ خانم" ہے کے ذریعے بھیجا گیا ہے اور "شادی کی تاریخ آپ کو عادلہ خانم بتا سکتی ہیں" والا جملہ ترجمہ میں نہیں ملتا۔ ترجمہ کی زبان سادہ اور سلیس ہے مثلاً "میری جان میں جان آتی ہے کہ اتنے میں عورتیں ملاقات کے لئے آجاتی ہیں ان سے سرکھپاتی ہوں" جیسے محاورے ترکی میں نہیں ملتے۔ اور "ایک قفس (گھر) سے نکل کر دوسرے قفس (بگھی) میں بیٹھ کر باغِ عام کا نظارہ

۱۔ خیالستان، سید سجاد حیدر یلدرم، مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، تاج بک ڈپو لاہور، ۱۹۸۷

کرتی ہوں " کی جگہ ترکی میں صرف یہ جملہ ہے، "اور پھر مہمان آجاتے ہیں"۔ اس کے علاوہ دو باتیں اور ہیں جو دلچسپی سے خالی نہیں اور ان پر روشنی ڈالنا بھی ضروری ہے۔ وہ یہ ہیں:-

۱۔ حیدر نے بڑی مہارت سے فرنچ تہذیب جس کا چرچا استنبول میں ہو رہا تھا کو انگریزی تہذیب میں بدل ڈالا ہے۔ یعنی "OLD LANGE SYNE", "BULBUL AND THE ROSE" جیسے انگریزی گانے گائے جا رہے ہیں۔ ملٹن کا ذکر ہو رہا ہے۔ ترکی متن میں فرنچ گانا ملتا ہے۔ "DITES MOIS VOS CHAGRINS" (مجھے اپنے درد دل کو سنا)۔

۲۔ حیدر کے متن میں ترکی گانوں کی جگہ ہندی گانے ملتے ہیں۔ ترکی شعرا کی جگہ یعنی فضولی اور نابی کی جگہ اردو شاعر مولانا حالی اور داغ ملتے ہیں۔ ہندی گانوں "دونوں ہاتھوں میں مہندی لگائے پری" "میں قربان زلفوں کے لٹکانے والے" "آہمت مردانہ جگہ تری جا ہے" وغیرہ نے ترکی کے مشہور گانے اور موسیقاروں کی جگہ لے لی ہے۔ اردو میں ترکی موسیقاروں کی جگہ مداری لال اور امانت کا ذکر آتا ہے۔

ان کے علاوہ ایرانی ماما دردانہ خانم، قاتینہ کا رول لے بیٹھی ہیں۔ دردانہ خانم فارسی بولتی ہیں اور اردو نہیں جانتیں، قاتینہ یونانی بولتی ہیں اور ترکی نہیں جانتیں۔

حیدر صاحب نے اپنے اسلوب بیان کو اردو کے ڈھنگ میں پیش کرنے کے لئے بہت دلچسپ جملے اور محاورے استعمال کئے ہیں جن کی چند مثالیں یہ ہیں:-

۱۔ چھوٹی چڑیا کی طرح ان کا خون ہوگیا ۲۔ کوئی راگنی کوئی ٹپہ، کوئی غزل ہمارے واسطے ہونا۔ ۳۔ آواز بھاری گویا ہاتھی پی رہا ہے ۴۔ سوچتے سوچتے کبھی میں چلا اٹھی ۵۔ سکون کی خواہش ہے تو اس کے لیے قبر موجود ہے۔

چونکہ عذرا کے شوہر حیدر آباد کے رہنے والے ہیں اس لیے ان کی زبان دکنی ہے۔ ترکی شوہر سادی ترکی بولتے ہیں۔

۲۔ خارستان و گلستان[۱]

یہ بہت دلچسپ کہانی ہے جس میں عورتوں اور مردوں کی جاتی کا ڈرامہ پیش کیا گیا ہے یعنی فطرت کے خلاف انسان کو رہنے پر مجبور کرنا صحیح نہیں ہے۔

عنوان:- اس افسانے کے تین بڑے حصے ہیں:- ۱۔ گلستان ۲۔ خارستان ۳۔ شیرازہ۔ اردو میں بھی یہی تین

۱۔ احمد حکمت مفتی اوغلو، خارستان و گلستان، قنات کتابخانہ سی، درسعادت نمبر ۲۲۵۔ ۱۳۲۴ ہجری، استنبول

عنوان استعمال ہوئے ہیں۔

کہانی:۔ کہانی میں اختصار سے کام نہیں لیا گیا۔ ایک بڑھیا عورت جو مردوں کے ظلم و ستم سے تنگ آگئی تھی اس نے اپنی پانچ سالہ بچی (نسرین نوش) کو ایک جنت نما جزیرہ میں انگلستان لے جاکر پالنا شروع کر دیا۔ اس جزیرہ میں پھولوں اور پرندوں کے علاوہ دنیا کی ساری خوبصورتیاں اور نعمتیں موجود ہیں لیکن مرد کا نام و نشان نہیں۔ لڑکی جب بڑی ہوتی ہے تو فطری طور پر مرد کو "تلاش کرنا شروع کر دیتی ہے۔

ایک اور جزیرہ (خارستان) ہے جہاں ایک لڑکا بچپن سے پلا ہے۔ کشتی کے غرق ہونے پر چند مرد اس بچے (خالا) کو لے کر ایک خشک سنسان جزیرہ میں مشکل سے جان بچا کر پناہ لیتے ہیں۔ کوئی عورت زندہ نہیں رہی تھی اس لئے جوان بچہ عورت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ وہ بھی فطری طور پر عورت کی تلاش میں ادھر ادھر جزیرہ میں پاگلوں کی طرح گھومتا رہتا ہے۔ آخر کار ایک دن چھوٹی سی کشتی بنا کر نسرین نوش کے جزیرے کی طرف آجاتا ہے۔ دونوں جوان بڑے جوش و خروش سے ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ یہ ساری کہانی اردو میں جوں کی توں ملتی ہے۔

مضمون:۔ مترجم نے حسب معمول زبان اور اسلوب بیان کو اردو ادب اور ذوق کے مطابق بدل دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ کچھ مناظر اور ماحول میں بھی تبدیلیاں ہو گئی ہیں۔ جن کی چند مثالیں یہ ہیں:۔

۱۔ "تمام موجودات میں یہ تازگی اور طراوت موجود تھی" کی جگہ اردو میں "تمام موجودات میں گویا ایک کروٹ لینے کی خواہش معلوم ہوتی ہے" کا جملہ ملتا ہے۔

۲۔ "ایک جزیرہ تھا جواب ناپید ہے" ("جواب ناپید ہے" ترکی میں نہیں ہے)

۳۔ "چاند خاموشی کے ساتھ گویا سوچ رہا ہے"۔ (ترکی میں صرف "چاندنی رات سوچ رہی تھی")

۴۔ "ان پر نظر ڈالی، برق تبسم گرا کر" (یہ بھی ترکی میں نہیں ہے)

۵۔ "مزمار، بربط، ستار پر نسرین نوش کے حسن اور ادا کی تعریف میں قصیدے، غزلیں، ٹھمریاں گانی شروع کیں۔ گانا بھی وہ گانا جو جوئے رواں کی طرح مسلسل تھا" اور اسی صفحہ پر "رفتہ رفتہ لالوں

۱۔ خیالستان، سید سجاد حیدر، ص ۶۵

اور پھولوں کو پھینک کے لڑائی شروع ہوئی۔ اور تھوڑی دیر میں پھولوں سے زخم کھا کھا کے پریاں گرنے لگیں" (یہ جملے حیدر صاحب کے اپنے ہیں)

۶۔ "اس کے نرم جسم کو سہلا سہلا کے اس کے دماغ کو تھپکا تھپکا کر ہلکے بادلوں کے نیچے بھاگتے ہوئے چاند کو پیش نظر کر کے غرض کہ عجب عجب دھوکے دے دے کے نیند اس کی آنکھوں میں چپکے سے آگئی اور گھنی پلکوں کو ہلا دیا۔ جس کی ترکی یوں ہے "بھاگتے ہوئے چاند کے پیچھے جانے والے بادل کے ٹکڑوں کو خمار بھری آنکھوں سے دیکھتے دیکھتے (نسرین) بے ہوش ہوگئی اور آہستہ آہستہ سوگئی"

جیسا کہ اوپر سے ظاہر ہے حیدر صاحب متن میں روانی اور نشاط پیدا کرنے کے لئے صنعتِ تکرار کا استعمال کرتے ہیں جو ترکی میں موجود ہونے کے باوجود احمد حکمت نے استعمال نہیں کی۔

۷۔ "وہ عندلیب جو پنجرے میں بیٹھی رہی تھی چپ ہوگئی ... گھنگرو آہستہ آہستہ اتار ڈالے"۔
حیدر کے یہ اپنے جملے ہیں جن سے متن میں مشرقی رنگ پیدا ہوگیا ہے۔

۸۔ "سوسن، نیلوفر، کبک ادا، طاؤس خرام جیسے الفاظ ترکی میں نہیں ملتے۔ اور اسی طرح "گلال اور چاندی کے ذرّے بکھرے ہوئے تھے"، "ہاتھوں میں پھول کے پنکھے"، بھی حیدر کے اپنے خیالات ہیں۔

۹۔ پھلوں کے ناموں میں بھی تبدیلیاں آگئی ہیں۔ انناس، کیلوں کی جگہ انار انگور جیسے ترکی پھل دیئے گئے ہیں۔ ترکی درختوں کی جگہ تار، برگد، سال، ببول وغیرہ ملتے ہیں۔

۱۰۔ حیدر اس جزیرے کو لنکا کے قریب دکھاتے ہیں حالانکہ ترکی میں اس جزیرے کی کوئی جگہ معین نہیں۔

۱۱۔ ترکی متن میں چیڑ کے درخت سے زخم کی دوا بنانے کا ذکر آتا ہے جو ترکی کے پرانے تمدّن کا حصّہ ہے۔ اسے حیدر صاحب نے نکال دیا ہے۔

<u>نتیجہ</u>:۔ یہاں ان تین افسانوں کے مقابلے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ میر نیرنگ کا بیان بالکل صحیح ہے وہ کہتے ہیں "ان کے بیان میں کہیں کہیں تو انگریزیت کی جھلک ہے اور کہیں غالباً ترکی طرز بیان کا چربہ ہے مگر داد کے قابل یہ بات ہے کہ انگریزی اور ترکی کی یہ تقلید علمی طور پر ایجاد کا حکم رکھتی ہے کیونکہ وہ غیر مانوس اور ناخوشگوار نہیں ہونے پاتی"[1]

●●

۱۔ میر غلام بھیک نیرنگ، تمہید خیالستان، خیالستان، سید معین، ص ۲۳۰

جناب رئیس احمد نعمانی
دانشپژوه، رشتهٔ تحقیقات زبان و ادبیات فارسی
دانشگاه، علیگره

قند پارسی

در مورد عده ای از کتابها، دانشمندان و پژوهشگرانی که نسخهٔ چاپی یا خطی ای آن را ندیده یا ذکرش در فهرستهای متداول بنظرشان نخورده، معتقد شده اند که آن کتابها اصلاً وجودی نداشته یا امروز باقی نیست، در حالیکه حقیقت چنین نبوده و نیست و نسخه های خطی یا چاپی یا از هر دو نوع از آن کتابها باقی مانده و هم اکنون در کتابخانه های مختلف جهان نگهداری می شود. "قند پارسی" گردآوردهٔ عبدالغفور خان نساخ نیز یکی از این گونه کتابهاست[1] که پژوهشگر معروف معاصر پاکستان دکتر علی رضا نقوی در اثر گرانبهائی خود بنام "تذکره نویسی فارسی در هند و پاکستان" دربارهٔ آن چنین قلمداد کرده است: "اسم کتابهائی زیر در بعضی از تذکره ها ذکر شده است، اما چون ظاهراً نسخه ای از این کتابها بجا نمانده بنابراین نمی شود بطور حتمی دربارهٔ موضوع آن چیزی گفت. بعضی از این کتابها مجموعهٔ اشعار بوده است:

۱. سخن الشعراء تالیف مولوی عبدالغفور خان بهادر نساخ (رجوع شود به شمع انجمن)

۲. قند پارسی تالیف مولوی عبدالغفور خان بهادر نساخ، از مآخذ اختر تابان و نگارستان سخن."[2]

محقق نامی ایران آقای احمد گلچین معانی در جلد دوم از تالیف نفیس خود که "تاریخ تذکره های فارسی" نام دارد، در زیر عنوان "قند پارسی" نوشته است:

"بعضی از تذکره نویسان متأخر هندوستان قند پارسی را در شمار مآخذ خود مذکور داشته اند در ک تذکرهٔ اختر تابان (ص ۴) و نگارستان سخن (ص ۱۶۱) و چون این دو کتاب در بهوپال تالیف و طبع شده است

---

[1] از باب مثال، "فریدهٔ جواهر" تالیف میرزای مظهر دهلوی را نیز میتوان نام برد که صدها نسخهٔ چاپی آن در کتابخانه های دنیا بالفعل موجود است، ولی محقق نامی معاصر ایران آقای احمد گلچین معانی از وجود خارجی آن انکار می فرماید. (در ک تاریخ تذکره های فارسی ج ۲، ص ۲۰)

[2] تذکره نویسی فارسی در هند و پاکستان ص ۱۱.

بطور قطع تا پایان قرن سیزدهم نسخهٔ آن در آن سامان وجود داشته ولی بالفعل در هیچ یک از فهرستها ذکرش نیامده است."[۲]

خوشبختانه، بنده موفق شدم نسخهٔ چاپی قند پارسی را بدست آورم، و اینک می خواهم اطلاعات لازم در پیرامون این کتاب و مؤلفش به علاقه مندان ادبیات فارسی تقدیم کنم و در ضمن اشاره ای به تسامحات دو استاد محقق نامبرده می نمایم:

گردآورندهٔ قند پارسی

ابو محمد عبدالغفور خان بهادر متخلص به محبور و سپس به نساخ، روز عید الفطر (دوم شوال)، به سال ۱۲۴۹ ه در شهر کلکته (بنگال باختری) دیده به جهان گشود. در هفت سالگی در مدرسهٔ عالیه کلکته (یکی از حوزه های علمی معروف آن سامان) شروع به دانش آموزی کرد، ولی بعلت وفات ناگهانی پدرش در ۱۲۵۹ ه رشتهٔ تحصیلات از هم گسیخته شد. اما پس از سه سال از آن سانحه در ۱۸۴۷ م به دانشکدهٔ هگلی راه یافت و در ۱۸۵۳ م دورهٔ دانشکده ای را در آنجا به پایان رسانیده به جست و جوی وسیله ای برای تامین امور معاش به داکا رفت و در ادارهٔ سرامی دوری ای با مواجب ده روپیه ماهانه به استخدام دولت در آمد. بعد چندی در دادگاه دیوانی صدر به سمت مترجمی منصوب گردید و در ۱۸۶۰ م به نیابت کلانتری و سپس به نیابت تحصیلداری رسیده و برای انجام وظایف منصبی خود در هگلی، بهاگلپور، راجشاهی، باریسال و داکا اقامت داشته و در ۱۲۸۴ ه اولین سفرش به دهلی کرد و پس از دو ماه به راه لکهنو و اله آباد بازگشت به بنگال نمود. از آن به بعد در سالهای ۱۸۶۰م، ۱۸۷۹م و ۱۸۸۵م سه بار دیگر به دهلی رفت. وفاتش در ۱۳۰۶ ه اتفاق افتاد.[۳]

نساخ یکی از دانشمندان و سخن سرایان بارز عصر خود بوده و علاوه بر سرودن شعر به فارسی و اردو، بیش از بیست کتب نگاشته است، از آن جمله چهار دیوان شعر است بزبان اردو که با عنوانهای مختلف به سالهای ۱۲۸۰ ه، ۱۲۹۱ ه، ۱۳۰۰ ه و ۱۳۰۴ ه بچاپ رسیده است. چشمهٔ فیض (ترجمهٔ پندنامهٔ عطار)، گنج تواریخ، کنز التواریخ، شاهد عشرت، ارمغان محبوب، وغیره نیز از آثار منظوم اوست. و اما در نثر مهم ترین آثارش عبارت است از: زندگی نامهٔ خود نساخ، انتخاب نقص،

۲- تاریخ تذکره های فارسی ج ۲ ص ۵۰۶.

۳- برای اخذ اطلاعات مفصل در پیرامون زندگانی نساخ باید به منابع زیر رجوع کرد: زندگی نامهٔ خود نوشت نساخ؛ نسخهٔ خطی آن در کتابخانهٔ انجمن آسیایی بنگال در کلکته نگهداری می شود. دیباچهٔ "دفتر بی مثال" که یکی از دیوانهای نساخ است و به سال ۱۲۸۰ ه توسط مطبع مظهر العجائب کلکته بچاپ رسیده است. دیباچهٔ "انتخاب نقص" تالیف نساخ چاپ در ۱۲۹۲ ه توسط مطبع نظامی کانپور. اردو در بنگال (بنگال میں اردو) نوشتهٔ وفا راشدی چاپ حیدرآباد (پاکستان)، در ۱۹۵۵ م ص ۴۰ تا ۴۵. اردو در بنگال خاوری (مشرقی بنگال میں اردو) تالیف سید اقبال عظیم چاپ داکا (ڈھاکا) در ۱۹۵۴ م ص ۴۵ تا ۶۰. نساخ (حیات و تصانیف) از دکتر محمد صدر الحق چاپ کراچی ۱۹۷۰ م. مقالهٔ آقای عقیدت الحسن در مجلهٔ "نگار" لکهنو شمارهٔ آوریل ۱۹۵۹ م. مقالهٔ سید لطیف الرحمن در مجلهٔ "نوای ادب" بمبئی شمارهٔ اکتبر ۱۹۶۰ م. مقالهٔ آقای دهشت کلکته ای در مجلهٔ "ماه نو" کراچی شمارهٔ مارس ۱۹۵۱ م.

قطعهٔ منتخبه، سخن شعرا و تذکرة المعاصرین. ؎

نساخ به فارسی نیز اشعاری می سروده که انتخاب آن را میتوان در شمع انجمن (ص ۸۴۰ تا ۸۴۹) دید. او خود او در قند پارسی بعضی از ابیاتش را آورده است که در شمع انجمن وغیره نیست. و آن این است:

خدایا شوخی طرزی عنایت کن زبانم را | بزن آتش ز شمع لن ترانی جسم و جانم را
دل پژمرده ام نساخ داغ گل نمی دارد | بهار تازه باشد در بغل نخل خزانم را
هر سرو که رست از گل ما | آهی است که خاست از دل ما
با تو شکایت غم هجران گناه من | با من بیان وصل رقیبان گناه نیست
چاک بر چاک سینه ام چو کتان | صنم رشک ماه کرد و گذشت
نساخ از این خرقهٔ سالوس که داری | کفار تنگ اند و مسلمان گله دارد
دل نساخ را روز نخستین | برای عشق خوبان آفریدند
هر تار گیسوی ترا تاتار و چین زیر نگین | یاقوت لبهای ترا کوه بدخشان در بغل
رخسار پر نور ترا صبح وطن در آستین | چشم سیه مست ترا شام غریبان در بغل ؎

قند پارسی

"قند پارسی" جنگ اشعاری است که ظاهراً نساخ در اواخر ایام جوانی خودش به انتخاب از دیوانهای شاعران و تذکره های فارسی گرد آوری نموده، و بعد ها نگارندهٔ همین مجموعه بعداً" او در تالیف تذکرهٔ شعرای فارسی اساس کار وی قرار گرفته چنانکه اساس بسیاری از تذکره های مهم فارسی و اردو همین گونه جنگها بوده است.

این کتاب در همان اوان که مؤلف آن هنوز بقید حیات بوده و از عمرش چهل سال بیش نرفته بود، توسط مطبع نول کشور در لکهنو به سال ۱۸۷۲م (۱۲۸۹ه) بچاپ رسیده بود. و همان نسخهٔ چاپی در دست نگارندهٔ این مقال است. ؎ این نسخه در ۱۱۸ صفحه بقطع وزیری چاپ و نشر گردیده است و در صفحهٔ اولش نام گرد آورنده چنین نوشته شده است:

"جمع کردهٔ مقتدای اد افهمان سخن، سر آمد سخن شناسان زمن جناب مولوی عبدالغفور خان بهادر متخلص به نساخ"

در آغاز قند پارسی دیباچه ای جز از "بسم الله الرحمن الرحیم" نیست، و همچنان در پایان کتاب نیز غیر از دو سطر بدست

؎ تذکره های شعرای اردو و تذکره نگاری (اردو شعرا کے تذکرے اور تذکره نگاری) ص ۳۵۳ ؎ قند پارسی ص ۱۰۶ ؎ قند پارسی

؎ اکنون یک بار دیگر توسط همان مطبع نولکشور لکهنو در ضمن مجموعه ای باعنوان "کلیات نساخ" چاپ گردیده است. و این مجموعه شامل این ده اثر

نساخ بوده: دفتر شاعره، مثنوی سخن شعرا، اشعار نساخ، مثنوی مرغوب دل، دفتر بی مثال، گنج تواریخ، چشمهٔ فیض، زبان ریختهٔ تعد سخن، و قند پارسی
(در این کتابه، فهرست کتب مطبع نولکشور لکهنو را آخر دیوان ظهیر فاریابی چاپ شده است)

کارمندان مطبع حتی کلمه ای از قلم گردآورندهٔ آن نیامده است. و چون کتاب حاضر در زمان حیات مؤلف آن بچاپ رسیده و انتشار یافته است، احتمال نمی رود که در ترتیب و تکمیل آن کاستی و غلطی راه یافته باشد، و باید کتاب را کامل دانست.

این مجموعه شامل منتخبات اشعاری که از هفت صد و نوزده شاعر متقدم و متأخر ایران و هند و پاکستان و روی هم رفته حاوی بیست و دو هزار و نهصد و هشتاد و چهار بیت برگزیده است. ترتیب کتاب الفبایی است بدون رعایت الف ممدوده، و در پاره ای از موارد حرف دوم تخلص شاعر نیز رعایت نشده است. کتاب با بیت زیر از ابدال اصفهانی آغاز می یابد:

دوش آمد ناصحی سوی ملامت خانه ام　　گفت عاقل می شوی؟ گفتم مگر دیوانه ام؟

و با این بیت میرزا یوسف قزوینی پایان می پذیرد.

چه کوتاه است شبهای وصال دلبران یارب　　خدا از عمر ما بر عمر این شبها بیفزاید

ناسخ در هیچ جایی نشان نداده است که در گردآوری این جنگ اشعار چه منابعی در دست داشته، ولی پیداست که دیوانهای همه هفت صد و نوزده شاعر را در دست نداشته و دقیقاً نخوانده باشد، بحکم ضرورت حتماً از تذکره و جنگهای اشعار دیگر نیز انتخاب زده و ظاهراً در موارد همعصران خودش از جریده و مجله های ادبی آن روز و ارتباطات کتبی و برخوردهای شخصی با معاصران نیز استفاده کرده باشد.

مطالعهٔ قند پارسی می رساند که گردآورندهٔ آن به مثنوی، رباعی و قصیده اعتنایی نداشته است، و همین است که در جمع آوری این مجموعه غالباً از سرایندگان غزل منتخبهٔ ابیات آورده است و اگر کسی از سرایندگان مثنوی یا رباعی و قصیده را در دست داشته است، از او نیز یا بیتی از ابیات عاشقانهٔ وی آورده و یا در دیگر و جایی قطعه ای را به انتخاب برداشته است، مثلاً عمر خیام (که باشتباه با عنوان یک رباعی گو در سراسر جهان شهرت دارد) ناسخ قطعه ای از او آورده است با آغاز بیت:

دوش در حلقل باستی بودم　　کشف شد بر دلم مثالی چند[۱]

و یا مثلاً از فرخی سیستانی تنها همین یک بیت را برگزیده است:

ترا چه غم که ترا هر کسی به جای من است　　مرا است غم که مرا هیچ کس به جای تو نیست[۲]

و از نظامی گنجوی قطعه ای با مطلع:

دوش رفتم به خرابات مرا راه نبود　　می زدم نعره و فریاد کس از من نشنود

اما از غزل سرایان نیز ابیات پراگنده ای برگرفته است غیر از یک دو شاعر که غزل کاملی از او آورده. بار انتخاب

---

[۱]، [۲]، قند پارسی ص ۲۷، ۲۸۲، ۴۰۸.

ابیات چندان سرسری نیست و نشان می دهد که مؤلف از ذوق سخن بی بهره نبوده است، و بر اثر همین ذوق است که از نزدیک به چهار صد شاعر در قند پارسی تنها یک بیت بنظر می خورد، و از بیش از صد سرائیده تنها دو بیت در این جنگ جای یافته است، و از جمله بیش از هفت صد شاعر فقط از دو بیت از آنها سه یا بیشتر بیت مورد پسند مؤلف قرار گرفته است. و از میان آنها تنها از بیست و نه کس ده یا مزید بر آن بیت انتخاب شده است.

واما از نظر کثرت ابیات، انتخاب غالب دهلوی از همه دیگران مفصل تر است که به چهل و دو بیت می رسد و دیگر شاعرانی که ابیاتشان را ناسخ بیشتر دوست داشته بدین قرار می باشد:

«عاشق اصفهانی (۲۷ بیت)، سعدی شیرازی (۲۶ بیت)، عبدالرحمن جامی (۵۲ بیت)، حافظ شیرازی (۲۵ بیت)، خسرو دهلوی (۲۷ بیت)، نظیری نیشاپوری (۲۶ بیت)، علی قلی میلی (۲۶ بیت)، علی حزین (۲۵ بیت)، شرف جهان قزوینی (۲۲ بیت) و شاعرانی که ده تا صد بیت آنها در این مجموعه ایراد شده است، عده شان از نوزده کس بیشتر نیست.»

<u>نوادر قند پارسی</u> و اینک ابیاتی از قند پارسی را رونویس کرده می آید از سرائیدگانی که اشعارشان در منابع دیگر به ندرت آمده و یا هرگز نیامده است و ناسخ ظاهراً از مآخذ کمیابی برگرفته است که از بین رفته و یا فعلاً در دسترس محققان نیست:

۱- اختر (؟):

تا ناز غمزه کرد کسانی به کمینی — یک صید نیا سود زمانی به زمینی (ص ۲)

۲- ارشاد، مولوی محمد ارشاد دهلوی:

دامن آلوده می روی، زنهار — پاک کن دل زگرد هستی ها

بگذر از راه این جهان غافل — هوشیاری است به زمستی ها (ص ۵)

۳- آصف، میرزا محمد باقر شیرازی:

صبح وصل ترا شب آمد نیست — شام وصل ترا سحر، چه علاج؟ (ص ۷)

۴- امین، مولوی امین الدین دهلوی:

خرقه سالوس را ترک بگو زاهدا — بیعت خمار کن از ید قلندر وش باشی (ص ۱۰)

۵- امین، محمد امین خان میر جمله:

افتادگی ای به طالعم هست — در پای تمی چرا نیفتم (ص ۱۰)

۶۔ اوج، لالا جگل کشور دهلوی:

به بازارش نبردم زان متاع طاعت خود را　　که می بینم گران آن جا بهای جنس عصیان را　　(ص ۱۱)

۷۔ اوجی اصفهانی:

قابل ماتم نیم، اما به رغم آسمان　　گه گهی از گریه بر شادی است، بجشمی ترکنید　　(ص ۱۱)

۸۔ آهی، سید احمد خان دهلوی:

خاکم چو نمو کند به میدان قیامت　　افتاده به هر گوشه به دامان تو پابند　　(ص ۱۳)

۹۔ بسمل، پنڈت رام کشن بسمل:

سرشک دیدۂ غماز کشف رازم کرد　　فغان که پرده زروی غم نهان برداشت　　(ص ۱۵)

۱۰۔ بلبل، پنڈت گوری شنکر لاهوری:

گشت ویران خانهٔ دیوانه ای　　هر کجا ویرانه ای آباد شد　　(ص ۱۵)

۱۱۔ تمنا جیوزی:

این قدر آشفتگی هر دم چرا بودی مرا　　آشنا گر آن بت نا آشنا بودی مرا　　(ص ۱۸)

۱۲۔ خافی، خانجهان دهلوی:

آن که به مستیم انکار به بیجای کرد　　چشم میگون ترا کاش تماشا می کرد　　(ص ۳۴)

۱۳۔ خسروی، نایینی:

بر ما خیال زلف تو شبهای تار را　　چندان دراز کرد که روز از میانه رفت　　(ص ۳۵، ۳۶)

۱۴۔ مولانا رازی (؟):

زدی آتشی به جان و زمنت خبر نباشد　　خبرت شود زمانی که زمن خبر نباشد　　(ص ۴۱)

۱۵۔ رازی، فصاحت خان:

بندگی گیشم تمیز کعبه و دیرم کجاست　　دیده ام هر جا دری آنجا سجودی کرده ام　　(ص ۴۱)

۱۶۔ رشکی، اعظم خان:

آخر به هیچ خاطرش آزرده شد زمن　　رشکی ببین که طالع دشمن چه می کند　　(ص ۴۲)

۱۷۔ رضی، قاضی رضی الدین اصفهانی:

از خدا قرب تو آن روز که می خواست رقیب کاش آزادی ما نیز تمنا می کرد (ص ۴۴)

۱۸- میر رومی (سید جعفر؟):

به کیش سخت دلان هم فسردگی ننگ است گواه این سخن است آتشی که در سنگ است (ص ۴۵)

۱۹- سعید (؟):

معماری اقلیم دل ما نتوان کرد چندان که درو دیده کند کار خراب است (ص ۵۹)

۲۰- صابری، ضیاءالدین محمد:

نه از ناز است اگر حرفش به لب دیر آشنا گردد سخن را دل نمی خواهد کز آن لبها جدا گردد (ص ۵۸)

۲۱- صالح، محمد صالح گورکانی:

ای به درگاه تو نیاز همه کرم تست کارساز همه
اگر از چهره پرده برداری به حقیقت کشد مجاز همه
سرو شان منظر جمال تو اند بهر آن می کشیم ناز همه (ص ۵۷)

۲۲- عزت (؟):

موسی به کوه طور که جا گرم داشته است دستی بر آتش دل ما گرم داشته است (ص ۱۰)

۲۳- کاشی (؟):

چشم بر راه صدمی خواران که کی باران شود ابر می خواهد مستان خانه گو ویران شود (ص)

۲۴- ملک سرکانی:

گر داشتی به قتل کسی تیغ ادسری هر دم هزار سر ز گریبان بر آمدی (ص ۱۰۱)

اشتباهات نساخ در قند پارسی متاسفانه بر اثر نقص تبع اشتباهاتی در قند پارسی راه یافته است که در زیر نشان داده می شود:

۱- ابوالطاهر که پیش از ابوالقاسم آورده شده است (ص ۲) ابوالمعاشر است که از سخن سرایان ری بوده.

۲- میرزا امیر رازی (ص ۹) و امیر قاضی امیری رازی (ص ۷) که دو کس نشان داده شده، همان یک امیری رازی است که به هند آمده و باز گشت به ایران نموده بود و همهٔ ابیاتی که زیر این دو نام نوشته شده است از همین امیری است.

۳- محمد سعید اشرف اصفهانی (ص ۷)، اشرف مازندرانی است که با نام سید اشرف شهرت دارد.

۴- اصلی شهدی (ص ۸)، اصلی قمی (ص ۸)، هر دو اصیلی هستند.

۵- ملا علی گل تورانی (ص ۸) نامش گل محمد و تخلص اعلی بود و این همان کس است که واله داغستانی در ریاض الشعرا به اشتباه او را اعلی دانسته و در روضة العین مذکور داشته است.

۶- مرزا نیاز امید (ص ۹) نام این امید امتیاز بوده که نساخ آن را نیاز ساخته، و این امتیاز از مردم بلخ است.

۷- انسی ترشیزی (ص ۱۰) تذکره نویسان با اعتبار این انسی را مناباذی نوشته اند

۸- اوجی نظری (ص ۱۱) نظری (ن ظاری) درست نیست، این اوجی نطنزی (ن طن زی) است از مردم نطنز.

۹- عبدالقادر ایجاد (ص ۱۲) نام این ایجاد، عبدالعزیز است و وی از تلامذۂ میرزا عبدالقادر بیدل بوده است.

۱۰- بھای عالی (ص ۱۵) بھائی یا بھایی عالی درست است.

۱۱- داغی ہمدانی (ص ۲۸) دامی به جای داغی درست است.

۱۲- میر اولاد محمد ذکایی بلگرامی (ص ۴۰) ذکا بدون یای نسبت است. آزاد بلگرامی که برادر حقیقی پدر ذکا بود تخلص وی را در همه جا ذکا نوشته است و به شیوۂ ایرانیان هم بنویسند باز ذکائی یا ذکایی درست نباشد و باید فقط یک یا به ذکا اضافه کرد نه که دو یا و یا یک همزه و یا.

۱۳- علی شاه ذوقی اصفهانی (ص ۴۰) این ذوق اردستانی است.

۱۴- مرزا سید رضا (ص ۴۳) و مرزا سید رضا اصفهانی (ص ۴۳) همان یک رضای اصفهانی است که نساخ دو پنداشته است.

۱۵- میر رضی ارتمانی (ص ۴۳) رضی آرتیمانی درست است.

۱۶- زلالی اد رگنجی (ص ۴۶) و زلالی هروی (ص ۴۶). این هر دو زلالی یکی است که دو پنداشته شده.

۱۷- سپهری اصفهانی (ص ۴۷). غالب تذکره نویسان این سپهری را زواره ای نوشته اند.

۱۸- سعد کمالی شیرازی (ص ۴۸) سعد گل شیرازی درست است.

۱۹- خواجه جلال الدین محمد سلمان ساوجی (ص ۵۰) جمال الدین به جای جلال الدین درست است.

۲۰- مولانا سهری (ص ۵۱). سپهری (با اضافه پ میان س و ه) درست است.

۲۱. شریف کاشی (ص ۵۴)، بیتی که در زیر این نام ثبت گردیده است از شریف تبریزی است.

۲۲. قاضی شمس الدین طبی (ص ۵۶)، طبسی به جای طبی درست است.

۲۳. صیفری دیلمی (ص ۶۱) و صیفری قزوینی (ص ۶۱). دو کس نیستند و همان یک صیفری قزوینی پسر ملا ملک دیلمی است.

۲۴. صیقلی یزد جردی (ص ۶۲). بزد جردی (ب ز د ج ر د ی) به جای یزد جردی (ی ز د ج ر د ی) درست است.

۲۵. طوقی تبریزی (ص ۶۴) طوفی (ط و ف ی) به جای طوقی (ط و ق ی) درست است.

۲۶. شاه اسماعیل ثانی صفوی عادل (ص ۶۶) عادلی با اضافهٔ یک «ی» درست است.

۲۷. عبدالله خان ازبک (ص ۶۹) و عبیدالله خان ازبک (ص ۶۹) ظاهراً همان یک عبیدالله خان ازبک است که عبیدی تخلص می کرده است. و واله داغستانی بر اثر نسیان خود همین یک کس را دو بار در ریاض الشعرا مذکور داشته است.

۲۸. عزیزالدین محمود کاشی (ص ۷۱)، عزالدین بجای عزیزالدین درست است.

۲۹. محمد مومن عزی شیرازی (ص ۷۰). هر چند که شیرازی بودن این عزی اشکالی ندارد ولی به بیان تذکره و تاریخ نویسان با عزی فیروزآبادی شناخته می شود (فیروزآباد از نواحی و محلات شیراز است)

۳۰. خواجه عزیزالدین شروانی (ص ۷۲)، عزالدین بجای عزیزالدین درست است.

۳۱. علائی اشتیاقی قمی (ص ۷۴) آشتیانی (آ ش ت ی ا ن ی) به جای اشتیاقی (ا ش ت ی ا ق ی) درست است.

۳۲. غضنفر گلخاری (ص ۷۹)، کله جاری (ک ل ه ج ا ر ی) به جای گلخاری (گ ل خ ا ر ی) درست است.

۳۳. ضیاءالدین فارسی خجندی (ص ۸۱). مانند بعضی از تذکره نویسان دیگر، نساخ هم تخلص این ضیاء را «فارسی» دانسته و در بند حرف (ف) آورده است ولی این اشتباه فاحشی است و می بایست این ضیاء در ذیل حرف (ض) آورده می شد.

۳۴. میرزا فصیح اسفاری هروی (ص ۸۴). انصاری به جای اسفاری درست است.

۳۵. قابلان بیگ (ص ۸۸). قبلان بیگ درست است.

۳۶. فضولی نجفی (ص ۸۹). همه تذکره نویسان معتبر این فضولی را بغدادی نوشته اند.

۳۷. کلبعلی شیرازی (ص ۹۲). نام درست این شاعر کلب علی و تخلص کلبی است.

۳۸. محسن طوسی (ص ۹۵). ارباب تذکره این محسن را مشهدی نوشته اند.

۳۹. میرزا ملک مشرقی (ص ۹۸) و مشرقی (ص ۹۸). همان یک مشرقی مشهدی است که نساخ دو دانسته است.

۴۰. میرزا زین العابدین نشاط مشهدی (ص ۱۰۷). این نشاط شیرازی بوده است.

۴۱ - نوعی جنونی (ص ۱۱۱)، خبوشانی (خ ب و ش ا ن ی)، به جای جنونی درست است.

۴۲ - وحشی یزدی (ص ۱۱۲). هر چند این وحشی در یزد نیز زندگی کرده است، ولی موطن اصل و زادگاهش بافق (از حوالی کرمان) است و محققان وی را با نسبت بافقی مذکور داشته اند.

۴۳ - مولانا هلالی استرآبادی (ص ۱۱۶)، و هلالی شیرازی (ص ۱۱۷). این هر دو هلالی یکی است.

۴۴ - محمد تقیم یزدجردی (ص ۱۱۸) بروجردی (ب ر و ج ر د ی) به جای یزد جردی (ی ز د ج ر د ی) درست است.

تسامحات محققان در شناختن و شناساندن قند پارسی

اشتباهات نساخ را دیدیم. باید نگاهی به تسامحات محققان بنام زبان فارسی نیز بکنیم که در معرفی کتاب "قند پارسی" از قلم ایشان سرزده است. اقتباس هائی که در صفحهٔ اول این مقاله رونویس شده است، آنها را باز بخوانید و ببینید که:

"آقای دکتر نقوی نام تذکرهٔ معروف و متداول نساخ را "سخن الشعرا" نوشته و در مورد این کتاب به "شمع انجمن" ارجاع داده است.

بنده به عرض می رسانم که نام این کتاب "سخن شعرا" بدون الف و لام و اثره "شعرا" است، و این با همین نام درست چندین چاپ خورده است. "سخن الشعرا" هم از نظر دستور درست نیست که سخن واژهٔ فارسی است و "شعرا" واژهٔ عربی، هر چند که بر واژه های عربی الف و لام برای معرفه ساختن اسم نکره می آید ولی در این صورت که مضاف اسم فارسی ای باشد نمی توان اسم عربی ای را با اضافه الف و لام مضاف الیه آن قرار داد. "سخن الشعرا" هم از این جهت اشتباه فاحشی است که "سخن شعرا" نام تاریخی این کتاب است که به سال ۱۲۸۱ هـ سمت تألیف یافته و همین عدد از "سخن شعرا" بدون الف و لام بر می آید ولی از "سخن الشعرا" با الف و لام شمارهٔ ۱۲۱۲ بدست می آید، در حالیکه مؤلف کتاب در ۱۲۰۶ هـ وفاتش واقع شده بود.

واما راجع به ارجاع به "شمع انجمن" اینکه در شمع انجمن ترجمهٔ حال نساخ در ۷ سطر و ۲۶ بیت منتخب از اشعارش (در ص ۴۸۷ تا ۴۸۹) آمده است، ولی در هیچ صفحه ای از صفحات شمع انجمن نام سخن شعرا ثبت نیفتاده است.

هر دو استاد نامور آقای نقوی و گلچین "قند پارسی" را از مأخذ "نگارستان سخن" و اختر تابان نوشته اند.

نگارنده می گویم: قند پارسی از منابع عمدهٔ "نگارستان سخن" بوده و مؤلف نگارستان سخن (هر که باشد)، اسامی و ابیات غالب سرایندگان را از قند پارسی برگرفته و برای بسیاری از آنها تراجم ساختگی نیم سطری و یک سطری افزوده است ولی "قند پارسی" حتماً و قطعاً از منابع "اختر تابان" نبوده و نتواند بود. زیرا که "اختر تابان" "تذکرهٔ زنان شاعر" است و شاعرانی

که اسما و اشعارشان در قند پارسی گردآوری شده است، حتی یک تن از آن بیش از هفت صد شاعر "زن" نیست.

آری، در (ص ۴) از اختر تابان نام قند پارسی به چشم می خورد، اما مؤلف "اختر تابان" هرگز این کتاب را از منابع خود نشمرده است. راستی آن است که این هر دو محقق عصر ما در مطالعهٔ دیباچهٔ "اختر تابان" به اشتباه فاحشی در افتاده و به منطوق مؤلف آن پی نبرده اند (و یا اصلاً "اختر تابان" را ندیده و تحقیقات مغلوط دیگران را در کتابهای خود بدون نشان دادن مرجع خود ثبت فرموده اند)، در حالیکه عبارت آن دیباچه هیچ ابهام و اغلاقی ندارد. اگر این محققان گرامی دیباچهٔ اختر تابان را با دقت و بیداری می خواندند، معلومشان می شد که مؤلف اختر تابان ۴۲ کتابی را که در دیباچهٔ خود نام برده است، آن کتابها را هرگز از منابع خود نشان نداده است و به عبارت روشن و ساده و قابل ادراک گفته است که آن کتابها از منابع "شمع انجمن، صبح گلشن، نگارستان سخن و روز روشن" بوده و این تذکره های چهارگانه به اقتباس از آن سی و چهل کتاب ترتیب و تالیف یافته است. و با اینکه این چهار تذکره از آن همه منابع مستفاد و ماخوذ است، روی هم رفته ذکر بیش از چهل زن سخنور در این تذکره یافته نمی شود. و اینک اصل عبارت اختر تابان:

"شمع انجمن و نگارستان سخن و صبح گلشن و روز روشن که حاوی ذکر خیر پنج شش هزار شاعر نامدار اند (و این سته اربعه از: سرو آزاد و خزانهٔ عامره و ید بیضا هر سه مؤلفهٔ میر آزاد مرحوم و آفتاب عالمتاب محمد صادق خان اختر و نشتر عشق حسن علی خان عظیم آبادی و آتشکدهٔ آذر و تذکرهٔ حسینی و تذکرهٔ جوهری دری و لب لباب (لباب الالباب) عوفی و تذکرهٔ سامی و دولت شاهی و خلاصة الاشعار میر تقی کاشی و هفت اقلیم مرزا امین رازی و منتخب التواریخ عبدالقادر و مجمع الفضلای ملا بقایی و تذکرهٔ مرزا طاهر و مرآة الخیال شیر خان و همیشه بهار اخلاص و حیات الشعرای متین کشمیری و سفینهٔ میر عظمت الله بی خبر و ریاض الشعرای علی قلی خان و کلمات الشعرای سرخوش و مجمع النفایس خان آرزو و تذکرهٔ تقی اوحدی و بی نظیر دولت آبادی و مردم دیده حاکم لاهوری و نتایج الافکار قدرت و تذکرهٔ ناظم تبریزی و تذکرهٔ ملا قاطعی و گل رعنا و شام غریبان و جواهر زواهر شفیق اورنگ آبادی و قند پارسی نساخ و گلستان مسرت و نشتر غم و نفایس المآثر و صبح صادق و تذکرهٔ باغ ارم و خریطهٔ جواهر و گلزار ابرار، و دیگر چند کتب معتبره جنگهای شعرای نامور و مجامیع و سفاین و اسفار فن ادب و دیگر علوم و فنون که تفصیل اسامی آن بسیار است) و تراجم اکثر سخن سنجان هم عصر آرایش و پیرایش یافته اند. چون تفحص بکار رفت صرف نام و نشان قریب چهل شاعره زنان برآمد." (ص ۳-۴)

• در ص ۶۱۹-۶۲۰ "تذکره نویسی فارسی در هند و پاکستان" و هم چنین در ص ۲۰ جلد اول از کتاب "تاریخ تذکره

های فارسی" نیز این حدود محقق مرتکب همین اشتباه شده اند که حتماً بر اثر همان بی دقتی و شتابزدگی در مطالعه دیباچه "اختر تابان" و تکیه بر تحقیقات ناشایسته دیگران بوقوع پیوسته است[۱۱].

• از محققان شهیر ایران و پاکستان از این گونه صدها اشتباهات سر زده است که ان شاء الله در مقاله های دیگر مورد بررسی و انتقاد قرار خواهم داد.

مراجع این مقاله:

۱. قند پارسی، عبدالغفور خان نساخ، چاپ مطبع نول کشور، لکهنو، ۱۸۷۲م (۱۲۸۹ھ)

۲. تذکره های شعرای اردو و تذکره نگاری، دکتر فرمان فتحپوری، چاپ لاهور، پاکستان. ۱۹۷۲م

۳. تذکره نویسی فارسی در هند و پاکستان، دکتر سید علی رضا نقوی، چاپ تهران (ایران) ۱۳۸۳ھ

۴. تاریخ تذکره های فارسی ج ۱ چاپ تهران ۱۳۴۹ ش

۵. تاریخ تذکره های فارسی، احمد گلچین معانی، چاپ تهران ۱۳۵۰ ش

۶. اختر تابان، ابوالقاسم محتشم، چاپ بهوپال، ۱۲۹۹ھ

۷. شمع انجمن، نواب سید صدیق حسن خان، چاپ بهوپال، ۱۲۹۲ھ

۸. مجله "اکادمی" لکهنو، شماره مارس و آوریل ۱۹۸۶م

۹. فهرست کتب، مطبع نول کشور، لکهنو، ۱۹۱۶م (۱۳۳۴ھ) / با پیوست دیوان ظهیر فاریابی)

۱۰. باغ فکر، عبدالغفور خان نساخ، چاپ بهوپال، ۱۹۸۷م

●●

---

[۱۱] گذشته از دیباچه "اختر تابان" در قرائت متن این کتاب نیز آقای گلچین دقت را بکار نبرده و مرتکب اشتباهاتی شده است. مثلاً در ص ۲۰ ج ۲ تاریخ تذکره های فارسی می نویسد: "در این تذکره پاره ای از اشعار مخفی رشتی بنام زیب النساء بیگم مخفی دختر اورنگ عالمگیر ثبت شده است، از جمله قطعه مشهور او که بر سبیل مطایبه سروده است:

مخفیا دختران خطهٔ رشت — چون غزالان مست می گردند

گر پا مشتری به هر بازار — بند تنبان بدست می گردند"

علاوه بر اینکه تخلص زیب النساء بیگم مخفی نبوده و نسبت این قطعه به مخفی رشتی نیز معتبر نیست، مؤلف اختر تابان این قطعه را بنام زیب النساء هرگز ثبت نکرده و به همان مخفی رشتی منسوب داشته است. (ببینید اختر تابان ص ۱۹).

حکیم وسیم احمد اعظمی
لٹریری ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (یونانی)
نئی دہلی

کتاب المنصوری اور اس کے تراجم

کتاب المنصوری[1] ابوبکر محمد بن زکریا رازی (متوفی ۳۱۳ھ / ۹۲۵ء) کی ایک بلند پایہ تالیف ہے۔ رازی نے یہ کتاب منصور[2] بن محمد بن اسحاق بن احمد بن اسد (عہد ۲۹۰ــــ۲۹۶ھ / ۹۰۲ــــ۹۰۸ء) کے لیے تالیف کی تھی۔ اس مناسبت سے اس کا نام "المنصوری" رکھا تھا۔

ابوبکر محمد بن زکریا رازی کی یہ کتاب حسن ترتیب و تبویب اور کمال ابلاغ وارسال کی وجہ سے بہت اہمیت کی حامل تصور کی جاتی ہے۔

ابن ابی اصیبعہ[3] (متوفی ۶۶۸ھ) نظامی عروضی[4] (متوفی قریباً ۵۵۰ھ) ابن خلکان[5] (متوفی ۶۸۱ھ) اور ڈاکٹر کمال سامرائی[6] وغیرہ مورخین نے اس کتاب کے اسلوب بیان اور راندانہ پیش کش کو بہت سراہا ہے، رازی کے عہد میں اس کتاب نے طب کی مطولات سے بے نیاز کر دیا تھا۔

المنصوری کے تراجم دنیا کی متعدد زبانوں میں ہوئے ہیں ان میں لاطینی، فرانسیسی اور فارسی زبانیں شامل ہیں ــــ ذیل میں ان تراجم کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

لاطینی: المنصوری کا لاطینی ترجمہ جیرالڈ آف کریمونا (۱۱۳۴ــــ۱۱۸۷ء) کے قلم کی یادگار ہے[7] ــــ یہ ترجمہ پہلی مرتبہ ۱۴۸۱ء میں لیڈن / میلانو[7] سے دوسری مرتبہ، ۱۴۹۷ء میں وینس سے اور تیسری مرتبہ ۱۵۴۴ء میں باسل سے شائع ہوا[8] ایک اطلاع کے مطابق ۱۴۸۹ء میں بھی شائع ہوا تھا[9]

۱۔ طب العرب ــــ تنقیدات و تشریحات ص ۳۰۵ مترجمہ نیر واسطی ۲۔ مختصر تاریخ الطب العربی جلد ۱ ص ۵۱۱ کمال سامرائی ۳۔ عیون الانباء فی طبقات الاطباء جلد ۱ ص ۳۱۷۔ ۳۲۰ ۴۔ چہار مقالہ ص ۷۰ ۵۔ وفیات الاعیان جلد ۵ ص ۸۷ ۶۔ مختصر تاریخ الطب العربی جلد ۱ ص ۵۱۱ ۷۔ مختصر تاریخ الطب العربی جلد ۱ ص ۵۱۱ ۸۔ طب العرب ص ۳۰۲ ۹۔ طب العرب ص ۵۵ ترجمہ نیر واسطی۔

فرانسیسی: "المنصوری" کو جزوی طور پر (صرف علم التشریح والاحصتہ) ڈاکٹر پی او وکیننگ نے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کر کے شائع کیا ہے۔[1]

فارسی: "المنصوری" کے فارسی ترجمہ کی نشاندہی آصفیہ لائبریری حیدرآباد میں کی گئی ہے۔[2]

نامعلوم زبان: "المنصوری" کا ایک ترجمہ کتب خانہ حمیدیہ (ترکی) میں اندراج نمبر ۱۰۱۳ کے تحت محفوظ ہے۔ یہ ترجمہ ۱۵۱ اوراق پر مشتمل ہے، زبان کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے، قوی امید ہے کہ یہ ترجمہ فارسی یا ترکی زبان میں ہوگا۔[3]

عربی متن: "کتاب المنصوری" کے عربی متن کی اشاعت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ڈاکٹر کمال سامرانی لکھتے ہیں:

"ونشر راسکہ (REISKE) النص العربی فی ہالہ بالمانیا سنۃ ۱۷۷۶ ۴ا (المانیا کے مشہور مستشرق) راسکہ (متوفی ۱۷۷۴ء) نے اس کا عربی متن ہالہ، المانیا سے ۱۷۷۶ء میں شائع کیا۔

حکیم نیر واسطی (متوفی ۱۹۸۵ء) لکھتے ہیں "اگرچہ اس (کتاب المنصوری) کا اصل عربی متن اب تک نہیں چھپا، لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ شارل کوئینز مدیر المعہد الفرنسی نے اصل عربی زبان میں قاہرہ سے شائع کرایا ہے"۔[5]

کتاب المنصوری کے نسخے: "کتاب المنصوری" خطی شکل میں ہند و بیرون ہند کی مختلف لائبریریوں میں موجود ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے۔ ۱۔ خدابخش لائبریری پٹنہ ۲۔ مولانا آزاد لائبریری، علیگڑھ ۳۔ رضا لائبریری رام پور۔ ۴۔ آصفیہ لائبریری حیدرآباد ۵۔ نیشنل بوٹانیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لکھنؤ ۶۔ جامعہ حلب (اس کی زیراکس کاپی لٹریری ریسرچ انسٹی ٹیوٹ یونانی میڈیسن نئی دہلی میں فراہم ہے) ۷۔ برٹش میوزیم ۸۔ بوڈلین (آکسفورڈ) ۹۔ اسکوریال ۱۰۔ پیرس ۱۱۔ ایا صوفیہ ۱۲۔ فیض اللہ آفندی ۱۳۔ سلیم آغا ۱۴۔ اسکندریہ ۱۵۔ المجمع العلمی (بغداد)۔

حاصل کلام یہ ہے کہ "کتاب المنصوری" ابوبکر محمد بن زکریا رازی کی ایک گرانقدر تالیف ہے، پندرہویں صدی عیسوی میں اس کے لاطینی تراجم اور اس کے آس پاس فارسی اور جزوی طور پر فرانسیسی تراجم بھی شائع ہوئے ہیں ——— ڈاکٹر کمال سامرانی کے بقول ۱۷۷۶ء میں اس کا عربی متن بھی شائع ہوا ہے، حکیم نیر واسطی بھی اس کے عربی متن کی اشاعت کا تذکرہ کرتے ہیں ——— لیکن اب یہ مطبوعات ناپید ہیں۔ خوشی و مسرت کا مقام ہے کہ ہند و بیرون ہند میں کتاب المنصوری کے تقریباً ۱۵ نسخے موجود ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ کتاب المنصوری کا ایک تنقیدی متن مع تصحیحات شائع کیا جائے★ تاکہ ابوبکر محمد بن زکریا رازی کی اس گرانقدر تالیف سے طبی دنیا مستفید ہو سکے۔ ●●

۱۔ طب العرب ص ۳۰۳ مترجمہ نیر واسطی۔ ۲۔ ہندوستان کے کتاب خانوں میں طبی نوادر ص ۳ شائع کردہ آئی۔ ایچ۔ ایم۔ آر ۳۔ فہرس مخطوطات الطب الاسلامی باللغات العربیہ والترکیہ والفارسیہ فی مکتبات ترکیا ص ۸ ۱۱ دہلی ۴۔ مختصر تاریخ الطب العربی جلد ۱ ص ۵۱۱۔ ۵۔ طب العرب تنقیدات و تشریحات ص ۳۰۳۔ ★۔ خدابخش لائبریری کی اشاعتی اسکیم میں "کتاب المنصوری" کا تدوین و اشاعت شامل ہے (شاہ محمد اسمٰعیل)

حکیم سید محمد حسان نگرامی
لٹریری ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (یونانی)
نئی دہلی

"القانون فی الطب" کی گمشدہ جلدیں — ایک جائزہ

شیخ الرئیس بوعلی سینا (متوفی ۱۰۳۷ عیسوی) کی تصانیف کی تعداد کے بارے میں ابھی تک کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جاسکی ہے خود اس کے شاگرد ابوعبید جوزجانی کے ہاتھوں تیار کردہ فہرست بھی حتمی نہیں کہی جاسکتی[1] اس کی تصانیف کی تعداد ۶۲ سے ۲۹۶ تک محیط ہے[2]۔ جی سی اناوتی نے ۲۹۶ کتابوں کی تعداد بتائی ہے جس میں اس نے بہت سی تصانیف پر اپنے شبہ کا اظہار کیا ہے[3] یحیی مہدوی کے نزدیک ۱۳۲ کی تعداد معتبر ہے باقی ۱۱۰ کے بارے میں وہ بھی مشکوک نظر آتا ہے[4]۔

یوں تو شیخ کی متعدد تصانیف اس کی شہرت و عظمت کا سبب بنی ہیں۔ لیکن مشرق و مغرب میں جو شہرت اسے اپنی کتاب "القانون فی الطب" سے حاصل ہوئی کسی اور سے حاصل نہیں ہوسکی۔

شیخ الرئیس کی کتاب "القانون" طب کی واحد کتاب ہے جس کے متعدد زبانوں میں بارہا تراجم اور ایڈیشن شائع ہوئے ہیں ایک زمانہ تک یہ کتاب یورپ کے تعلیمی اداروں کے نصاب میں شامل رہی اور آج بھی طب کے لیے ایک عظیم سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

قابلِ ذکر یہ ہے کہ اس درجہ اہمیت کی حامل کتاب اب تک صرف ۵ جلدوں میں شائع ہوئی ہے حالانکہ اہم ترین مصنفین اسے ۱۴ جلدوں پر مشتمل بتاتے ہیں، حیرت ہے کہ تمام طابعین و ناشرین نے اس مسئلہ پر کسی طرح کی بحث نہیں کی ہے اور تمام انگریزی اردو اور عربی حوالے اس موضوع پر خاموش ہیں۔

ذیل میں "القانون فی الطب" کی ۱۴ جلدوں کی موجودگی، گمشدہ جلدوں کے مشتملات اور مختلف لائبریریوں میں محفوظ "القانون" کے قدیم مخطوطات کی روشنی میں ایک جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

"القانون" کی ۱۴ جلدیں تاریخی حوالوں کی روشنی میں:

تاریخ طب پر لکھی گئی اہم ترین کتابوں میں ابن ابی اصیبعہ (متوفی ۱۲۷۰ء) کی کتاب "عیون الانباء فی طبقات

۱۔ انسائکلوپیڈیا آف اسلام جلد سوم ص ۹۴۳، ای جی۔ برل لندن ۱۹۷۱ء ۲۔ خدا بخش لائبریری جرنل شمارہ ۲، ص ۱۳۵ خدا بخش لائبریری میں ابن سینا کے مخطوطات از وسیم احمد اعظمی
۳۔ G.C. ANAWATI. ESSA DE BIBLIOGRAPHY AVICENNA CAIRO. 1950.
۴۔ مولفات ابن سینا یحیی مہدوی ص ۱۹۳ تہران ۱۹۵۴ء ۵۔ الاعلام جلد اول ص ۲۰۹ خیر الدین زرکلی

الاطباء" اور ـــــــــــــــ جمال الدین قفطی (متوفی ۱۲۴۸ء)[1] کی کتاب "تاریخ الحکماء" ہی کو زیادہ تر بطور حوالہ پیش کیا جاتا ہے۔

مطالعہ کے دوران معلوم ہوتا ہے کہ عیون الانباء فی طبقات الاطباء[2] اور تاریخ الحکماء[3] دونوں میں "القانون فی الطب" کے لیے اربع عشرۃ مجلدۃ (۱۴ جلدوں) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ ۱۲۷۰ء تک القانون کی ۱۴ جلدیں شمار کی جاتی رہی ہیں۔ ان عربی حوالوں کے علاوہ حکیم غلام جیلانی کی کتاب "تاریخ الاطباء" میں بھی "القانون" کی مطبوعہ پانچ جلدوں کے قطع نظر ۱۴ جلدوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔[4]

"القانون" کی بقیہ جلدوں کے مشمولات

مندرجہ بالا حوالوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے "القانون فی الطب" بنیادی طور سے ۱۴ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا موجودہ "القانون" کے مضامین بھی نامکمل ہیں چنانچہ مطالعہ سے یہ حقیقت بھی واضح ہوجاتی ہے کہ موجودہ جلدوں میں شیخ الرئیس بوعلی سینا کے معالجانہ تجربات پر مشتمل معلومات شامل نہیں ہیں۔

ابوعبید جوزجانی شیخ الرئیس کی سوانح حیات میں لکھتا ہے کہ بوعلی سینا "القانون" میں اپنے معالجانہ تجربات شامل کرنا چاہتا تھا۔[5] واضح رہے کہ ابوعبید جوزجانی شیخ الرئیس کا سب سے معتمد شاگرد تھا اور اس نے اپنی سوانح عمری جوزجانی کو املاء کرائی تھی۔ ان تمام حوالوں سے ثابت ہوجاتا ہے کہ شیخ کی "القانون" کی باقی جلدوں میں شیخ کے معالجانہ تجربات شامل کیے گئے تھے جو موجودہ القانون میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں۔

مختلف لائبریریوں میں "القانون" کے مخطوطات اور سات جلدوں کے مخطوطہ کی نشاندہی:

دنیا کی مختلف لائبریریوں کے کیٹلاگ پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ "القانون" کے قدیم مخطوطات کی تعداد نہایت مختصر ہے اگرچہ ان میں بعض بہت قدیم ہیں۔ لیکن وہ ۵ جلدوں پر بھی مشتمل نہیں ہیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہندوستان کی لائبریریوں میں ۶۲۷ ہجری سے پہلے کا کوئی مخطوطہ موجود نہیں ہے ہندوستان میں "القانون" کا قدیم ترین مخطوطہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کی زینت ہے اس مخطوطہ کا سن کتابت ۶۲۸ھ ہے۔

"القانون" کا جدید ترین عربی ایڈیشن جسے انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ نئی دہلی

۱۔ المنجد ص ۱۹۱۴ ۲۔ عیون الانباء فی طبقات الاطباء مطبوعہ بیروت ص ۴۴۴ ۳۔ تاریخ الحکماء (اردو ترجمہ ص ۳۸۸ ۵) جمال الدین قفطی ۴۔ تاریخ الاطباء حکیم جیلانی ص ۱۸۱ مطبوعہ ۱۹۱۳ء ۵۔ آئینہ سرگزشت CCRUM ص ۲۴ بہ حوالہ سابق ص ۳۔

نے شائع کیا ہے وہ بھی ایاصوفیہ لائبریری کے مخطوطہ (۶۱۸ھ) پر مشتمل ہے[1]

مختلف کتبخانوں میں "القانون" فی الطب کے قدیم مخطوطات

نام لائبریری	نمبر مخطوطہ	سن کتابت
ایاصوفیہ	۳۶۸۶	۶۱۸ھ
پیرس[2]	۲۸۸۵ - ۹۱	۵۹۳-۹۷ھ
جاراللہ[3]	۱۵۲۴	۵۸۴ھ
مغنیا[3]	۱۷۶۰	۶۱۷ھ
احمد ثالث[3]	۱۹۴۴	۶۳۵ھ
محمد پاشا[3]	۱۷۶	۶۵۴ھ
احمد ثالث[3]	۱۹۳۹/۲	۷۰۴ھ
ایاصوفیہ[3]	۳۶۳۸	۵۲۸ھ
خدابخش لائبریری[4]	۲۱۶۰	۶۲۷ھ

اس فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایاصوفیا لائبریری کا مخطوطہ نمبر ۳۶۳۸ سب سے قدیم ہے جسے ۵۲۸ھ میں لکھا گیا تھا۔

اس مخطوطہ کی آخری عبارت و اثنتة او ثولاث تسعة قراريط القوانوس اوقية ونصف ـ تم الكتاب الخامس من القانون في الطب وهو الاقراباذين وهو المجلدة السابعة۔

اس عبارت سے واضح ہوجاتا ہے کہ قرابادین کا بیان اصلاً "القانون فی الطب" کے ساتویں جلد میں شامل ہے اور اسے موجودہ ایڈیشن میں جلد پنجم میں شامل کردیا گیا ہے۔

یہ بات حیرت ناک ہے کہ اس مخطوطہ کا یہ آخری جملہ "القانون فی الطب" کے پہلے عربی ایڈیشن مطبوعہ روم ۱۵۹۲ء میں شامل نہیں ہے۔

---

[1] القانون فی الطب جلد اول، انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری میڈیشن اینڈ میڈیکل ریسرچ ص ۱ [2] مولفات ابن سینا، یحیی مہدوی ص ۱۹۳ [3] فہرس مخطوطات الطب الاسلامی باللغات العربیہ والترکیۃ والفارسیۃ فی مکتبات ترکیا ۱۹۸۴ء استانبول ص ۴۳ [4] ایاصوفیہ لائبریری میں القانون کے مخطوطات از نظام الدین مغربی (ہمدرد کلکشن)، خدابخش لائبریری میں ابن سینا کے مخطوطات وسیم احمد خدابخش جرنل جلد ۲۱ ص ۱۳۳

چنانچہ مذکورہ ایڈیشن میں "القانون فی الطب" کی عبارت درج ذیل جملہ پر ختم ہوتی ہے۔

"یغلی عشر غلیات ویرفع .... خل یخلط بماء الورد وادی وما محاشراب یتخذ بعصارۃ الورد مع عسل" [1]

ایسا لگتا ہے کہ بعد کے ایڈیشن میں بھی روم میں طبع شدہ ایڈیشن کی نقل کرلی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ اب تک چھپے تمام "القانون" کی آخری عبارت مذکورہ جملہ پر ختم ہوجاتی ہے۔

ایا صوفیا کے مذکورہ مخطوطہ کے علاوہ مخطوطہ نمبر ۲۸۸۵-۹۱ جسے ۵۹۳-۹۷ ھجری میں لکھا گیا ہے وہ بھی سات جلدوں پر مشتمل لکھا گیا ہے تاہم فہرست نویس نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا ہے [2]

مذکورہ بالا تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ "القانون فی الطب" بنیادی طور سے ۱۴ جلدوں پر مشتمل ہے اور باقی جلدوں میں بوعلی سینا کے معالجانہ تجربات شامل کیے گئے تھے ایسا لگتا ہے کہ "القانون فی الطب" کے پہلے ایڈیشن کے طبع ہوتے وقت صرف ۵ جلدوں پر مشتمل نسخہ کو بنیاد بنایا گیا ہے۔

لہٰذا ضرورت ہے کہ مذکورہ تجزیہ کی روشنی میں دنیا کی مختلف لائبریریوں میں محفوظ "القانون فی الطب" کے مخطوطات کی پھر سے تحقیق کرائی جائے تاکہ شیخ الرئیس کے معالجانہ تجربات دنیا کے سامنے پیش کیے جاسکیں اور اس قدر اہم کتاب "القانون فی الطب" کو مکمل سمجھا جائے۔ ●●

۱۔ القانون فی الطب مطبوعہ از روم ۱۵۹۳ء

۲۔ مولفات ابن سینا یحییٰ محمودی ص ۱۹۳

ڈاکٹر سلیم الدین احمد
خدابخش لائبریری

"القانون فی الطب" کی دستیاب جلدیں

"القانون فی الطب" کے کئی خطی نسخے خدابخش لائبریری میں موجود ہیں اس کا ایک مطبوعہ نسخہ بھی، جو مطبع عامرہ (قاہرہ) سے ۱۲۹۴ھ میں شائع ہوا تھا یہاں محفوظ ہے۔ قلمی نسخے کا مقابلہ جب مطبوعہ سے کیا گیا تو پتا چلا کہ قلمی نسخے کا خاتمہ مندرجہ ذیل عبارت پر ہو جاتا ہے:

"الثلاث او ثولات تسعة قراريط القوانوس اوقية و نصف"

جبکہ مطبوعہ نسخے میں مندرجہ بالا عبارت کے بعد مندرجہ ذیل اضافہ ہے:

"مالی هو العسل مالی قراطون هو ماء العسل وربما کتبوه ما القراطن او ماء القراطن اقوما لی هو مایموس فیه الشهد ویحتفظ به غیر مطبوخ او درومالی هو عسل وماء المطر العتیق منا صفة بشمس الشراب العسل هو متخذ من عصیر العنب الذی فیه قبض خمسة اجزاء ومن العسل جزء واحد یلقی ذلک فی ما یملأ انا واسع به لیتسع لغلیانها ویلق علیهما ملح قلیلا قلیلا حتی تنقذ فی الرغوة فاذا اسکن الغلیان رفع فی الخوابی شراب العسل شراب عتیق قابض جزآن عسل جید جزء واحد یحرز فی اناء و یترک حتی یدرک الطلاء یتخذ بان یترک العنب فی کرمه بعد ان ینضج زمانا یسیرا او یقطع العنب النضیج فیشمس ثم یعصر ویطبخ اکسومالی هو السکنجبین المتخذ من الخل والعسل والماء وقد یضیف الیه قوم ماء البحر او ملحه ومن جملة نسخ ذلک خل خمس قوطولی والقوطولی سبع اواق ومن ملح البحر منوین ومن العسل عشرة امنا ومن الماء عشر قوطولات یغلی عشر غلیات ویرفع اوکسالی خل یخلط بماء اللجی روذومالی شراب یتخذ بعصارة الورد مع عسل"

اس حقیقت سے پتا چلتا ہے کہ مطبوعہ "القانون" کی طباعت کے وقت القانون کے دستیاب تمام قلمی نسخے پیش نظر رکھے گئے ہیں اور طباعت کے لیے اس نسخہ کو بنیاد بنایا گیا ہے جو مکمل ترین تھا۔

حکیم سید محمد حسان نگرامی نے اپنے مضمون "القانون فی الطب کی گمشدہ جلدیں۔ ایک جائزہ" میں

مختلف کتاب خانوں میں "القانون فی الطب" کے قدیم مخطوطات کا ایک جائزہ پیش کیا ہے جس کی رو سے ایا صوفیہ لائبریری میں محفوظ اس کا قلمی نسخہ سب سے قدیم ہے جس کی کتابت ۵۲۸ھ میں ہوئی ہے۔ موصوف نے اس مخطوطہ کی آخری عبارت بھی نقل کی ہے جو عام مخطوطات کی آخری عبارت سے مختلف نہیں یعنی اس مخطوطہ میں بھی مطبوعہ ایڈیشن کا محولہ بالا اضافہ شامل نہیں ہے۔ البتہ اس مخطوطے کی مندرجہ ذیل عبارت نے موصوف کو اس شبہ میں ڈال دیا ہے کہ "القانون" کی مزید جلدیں بھی موجود ہیں جن کی تلاش ضروری ہے۔

"تم الکتاب الخامس من القانون فی الطب ھو الاقرباذین وھو المجلدۃ السابعۃ"

لیکن اس شبہ کی بظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کیوں کہ آغاز کتاب میں مصنف نے جو دیباچہ لکھا ہے اس میں "القانون فی الطب" کے مشتملات کا تذکرہ کرتے ہوئے پوری کتاب کو پانچ کتاب میں تقسیم کیا ہے۔ عبارت ملاحظہ ہو:

"واما الان فانی اجمع ھذا الکتاب واقسمہ الی کتب خمسۃ علی ھذا المثال (الکتاب الاول) فی الامور الکلیۃ فی علم الطب (الکتاب الثانی) فی الادویۃ المفردۃ، (الکتاب الثالث) فی الامراض الجزئیۃ الواقعۃ باعضاء الانسان عضو عضو من الفرق الی القدم ظاھرھا وباطنھا (الکتاب الرابع) فی الامراض الجزئیۃ التی اذا وقعت لم تختص بعضو وفی الزینۃ (الکتاب الخامس) فی ترکیب الادویۃ وھو الاقرا باذین"

چنانچہ اس روشنی میں اگر پوری کتاب صرف پانچ ہی "کتب" پر مشتمل ہے اور مطبوعہ اور قلمی نسخوں میں یہ پانچوں کتب موجود ہیں تو پھر مزید جلدوں کی تلاش بے سود ہے۔ اب اس کے مشتملات جو پانچ "کتب" پر مشتمل ہیں خواہ مخطوطہ کی سات جلدوں میں سما جائیں یا دس جلدوں میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ خدابخش لائبریری میں اس کا ایک ایسا نسخہ بھی ہے جس میں ایک ہی جلد میں پانچوں کتب "شامل ہیں بلا اختصار۔

حکیم سید محمد حسان نے "القانون" کی بقیہ گمشدہ جلدوں کے مشتملات کے سلسلہ میں بھی ایک رائے قائم کی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "القانون" کی موجودہ جلدوں میں شیخ رئیس بو علی سینا کے معالجانہ تجربات پر مشتمل معلومات شامل نہیں ہیں" اور یہ کہ "ابو عبید جوزجانی ... لکھا ہے کہ

بوعلی سینا "القانون" میں اپنے معالجانہ تجربات شامل کرنا چاہتا تھا" تو اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ کہ جوزجانی نے صرف یہ لکھا ہے کہ بوعلی سینا اپنے معالجانہ تجربات بھی اس کتاب میں شامل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا ظاہر ہے کہ وہ ایسا نہ کرسکا کیونکہ اگر شامل کیا ہوتا تو اسے یہ بات لکھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی کہ وہ ایسا کرنا چاہتا تھا۔ جمال الدین قفطی نے تو واضح طور پر لکھا ہے کہ "و چون "شیخ" را در معالجات تجربہ ہای بسیار حاصل شدہ بود، در خاطر داشت کہ آنہا را تدوین و جزو کتاب قانون نماید۔ آنہا را بر اوراق متفرق نوشتہ بود، لیکن قبل از اتمام قانون، آں اجزا از "شیخ" فوت شدند و آنچہ در خاطر داشت فعلیت نپذیرفت" (تاریخ الحکماء قفطی ص ۳۶۷، ترجمہ فارسی بہ کوشش بہین دارائی، انتشارات دانشگاہ تہران ۱۳۴۷)

جیسا کہ معلوم ہے کہ بوعلی سینا کی یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور متعدد زبانوں میں اس کے تراجم ہوئے، ساتھ ہی بوعلی سینا اور ان کی تصنیفات پر تحقیق کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ اگر "القانون" کی مزید کسی جلد کی موجودگی کی نشاندہی کہیں بھی ملتی تو یقیناً اب تک اس کا حوالہ کہیں نہ کہیں ضرور مل جاتا۔ ایسی صورت میں سوائے اس کے کہ موجودہ "القانون" کو ہی مکمل سمجھا جائے اور کوئی چارہ نہیں۔

●

ڈاکٹر زبیر قریشی
صدر شعبۂ فارسی
ایچ کے آرٹس کالج، احمد آباد

خدا بخش کے چند عربی و فارسی مخطوطات کے بارے میں

عربی مخطوطات ۱۔ الحاشیہ علی شرح التہذیب مصنفہ عبدالغنی بن قاضی عبدالرسول نمبر ۱۹۶۳: فہرست مفتاح الکنوز میں ان کے نام کے ساتھ الگجراتی لگا ہوا ہے یہ غلط ہے کیوں کہ خود مصنف "فیقول العبد..." وغیرہ کے بعد اپنے آپ کو احمد نگری کہتے ہیں۔ اس بات کی بھی وضاحت ہو جائے کہ یہ مصنف کے خط میں ہے۔

۲۔ الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام۔ نمبر ۲۳۰۴: فہرست میں مصنف کا نام قطب الدین نہروانی لکھا ہوا ہے جو غلط ہے۔ دراصل نہروالی ہونا چاہیے جو شمالی گجرات کے شہر پٹن کا دوسرا نام ہے۔ قطب الدین یہیں پیدا ہوئے اور بعد میں مکہ معظمہ چلے گئے۔ وہاں عہدۂ قضاۃ پر فائز ہوئے اور یہ کتاب لکھی۔ یہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔ اس کا مطبوعہ نسخہ ہمارے کالج میں ہے اور خدا بخش میں بھی ہے۔

۳۔ النور السافر نمبر ۲۳۷۶ مصنف کا نام یوں لکھا ہوا ہے عبدالقادر بن شیخ عبداللہ علوی۔ صحیح نام یوں ہے عبدالقادر بن شیخ بن عبداللہ العیدروسی۔ مصنف احمد آباد میں مدفون ہیں سن وفات ۱۰۳۹ھ ہے۔ یہ کتاب بھی چھپ چکی ہے۔ مطبوعہ نسخہ ہمارے پاس ہے۔ خدا بخش میں بھی ہے۔

۴۔ رسالہ فی حرمۃ شرب الدخان۔ نمبر ۳۶۲۵/۱۷۔ اس کے مصنف محمد اسحاق بہروچی ہیں۔ یہ علامہ شاہ وجیہ الدین علوی کے شاگرد تھے اور یہ رسالہ انھیں سے منسوب ہے۔ مگر فہرست میں انھیں شاگرد عبدالغنی لکھا گیا ہے جو غلط ہے۔ یہ بزرگ بھروچ (گجرات) میں مدفون ہیں۔ پہلے صفحہ پر تمام گجراتی اور خاص طور پر احمد آبادی کے بزرگوں کا ذکر ہے۔

۵۔ ذیل تشیع فقہاء الحنفیہ لتشیع سفہاء الشافعیہ: نمبر ۲۵۶۸/۴۴ مندرجہ بالا عربی مخطوطہ میں ملا علی قاری کے ۶۵ رسائل ایک ساتھ مجلد ہیں۔ فہرست میں مصنف کا نام زین العابدین صدیقی لکھا ہے جو غلط ہے اس کتاب کے مصنف ملا علی قاری ہیں نہ کہ زین العابدین۔

فارسی مخطوطات شرح حقیقۃ المحمدیہ: مصنفہ عبدالعزیز بن ولی نمبر ۱۳۲۶: مرآۃ العلوم فہرست میں لکھا ہوا ہے کہ اس کے ماتن و شارح ایک ہیں۔ یہ غلط ہے۔ اس کے ماتن حضرت شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی ہیں متن عربی میں ہے اور مترجم انھیں کے شاگرد رشید مولانا عبدالعزیز بن ولی ہیں۔ یہ دونوں احمد آباد کے بزرگ ہیں۔ شارح کم از کم ۱۰۱۶ھ تک بقید حیات تھے۔

عبدالعزیز نے فتوح الغیب مؤلفہ حضرت عبدالقادر جیلانی پر شرح لکھی ہے جس کا سن تصنیف ۱۰۱۶ھ ہے۔ شرح مذکور کا ایک نسخہ پیر محمد شاہ احمد آباد کے کتب خانے میں بھی ہے۔ ناچیز نے اس کا اردو ترجمہ کر کے ایڈٹ بھی کیا ہے۔

فہرست مخطوطات اردو

مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ، مظفر نگر، یوپی

نور الحسن راشد کاندھلوی

کاندھلہ ضلع مظفر نگر میں جو مغربی یو پی کا ایک معروف اور قدیم قصبہ ہے، علم و عمل، شعر و ادب، تصنیف و تالیف، ارشاد و معرفت اور نجی کتب خانے رکھنے کی روایت خاصی پرانی ہے۔ قدیم علما کے متعلق تفصیلی معلومات دستیاب نہیں، مگر بارھویں صدی ہجری یا ———— علامہ سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں:

"حضرت شاہ عبدالعزیز کے زمانہ سے آج تک اس قصبہ کا ایک سلسلۂ فیض مسلسل نظر آ رہا ہے۔"[1]

اس عہد بہار کی ابتدا حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کے ذریعہ ہوئی اور علم و عمل کا یہ گلکدہ شاداب سے شاداب تر ہوتا گیا، اور اس کے پاسبانوں کے ذوقِ علم نے ارشاد و معرفت، درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور علم و ادب کے میدانوں میں نئے نئے رنگ گل بوٹے کھلائے، اسی سلسلے کی ایک یادگار مخطوطات و نوادر سے گرانبار ایک وسیع کتب خانہ تھا جس کے باقی ماندہ نقوش کی ایک جھلک یعنی فہرست اردو مخطوطات اور اس کتب خانہ کے اولین جامع و مؤسس حضرت مفتی الٰہی بخش کا مختصر تعارف اور اس کتب خانہ کے ماضی و حال کا کچھ احوال نذر قارئین ہے۔

مفتی الٰہی بخش خلف مولانا محمد شرف حکیم شیخ الاسلام، کاندھلہ کے ایک قدیم علمی صدیقی گھرانے کے فرد[2]، حضرت شاہ عبدالعزیز کے ممتاز شاگرد[3]، شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے رفیق درس[4]، شاہ عبدالعزیز، شاہ کمال الدین اور سید احمد شہید[6] کے خلیفہ

۱۔ بحوالہ تذکرہ مولانا محمد الیاس کاندھلوی، یاد رفتگاں ص ۳۱ (کراچی: ۱۹۵۵ء)۔ ۲۔ اس خاندان کی ابتدائی معلوم تاریخ، بعض قدیم اہل علم و معرفت اور کاندھلہ میں آمد و قیام کی تفصیلات کے لیے دیکھیے: راقم سطور کا مقالہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کے اجداد، صحیح نسب نامہ اور حالات، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا نمبر، الفرقان لکھنؤ (۱۴۰۰ھ)۔
۳۔ شاہ عبدالعزیز کا ارشاد ہے: "از شاگردان من دو کس خوب بودند، چنانچہ مولوی رفیع الدین و مولوی الٰہی بخش"، ملفوظات شاہ عبدالعزیز، رحمۃ (مجتبائی میرٹھ ۱۳۱۴ھ)۔ ۴۔ محمد عبدالرحیم ضیا نے مقالات طریقت ص (حیدرآباد: ۱۳۵۰ھ) میں، مولانا عبدالحی حسنی نے نزہۃ الخواطر ص ۲۹ جلد ۷ (حیدرآباد ۱۳۷۸ھ) میں اور خود حضرت شاہ عبدالعزیز نے مفتی صاحب کے لیے سند میں اس کی وضاحت فرمائی ہے، سند کے متن کے لیے ملاحظہ کیجیے: حالات مشائخ کاندھلہ، مولانا احتشام الحسن کاندھلوی ص ۵۳، ۵۵ (دہلی: بدون سنہ)۔ ۵۔ شاہ کمال الدین، مفتی صاحب کے چھوٹے بھائی، شاہ عبدالعزیز کے شاگرد اور شاہ ابوالعلا دہلوی خلیفہ مجاز حضرت خواجہ محمد زبیر نقشبندی متوفی ۱۲۰۸ھ کے خلیفہ اول اور سجادہ نشین تھے۔ سنہ ولادت معلوم نہیں مگر مفتی الٰہی بخش سے چھوٹے تھے، تقریباً ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۷ء میں وفات پائی۔ شرح عقائد جلالی کا حاشیہ علمی یادگار ہے۔ مختصر معلومات کے لیے رجوع کیجیے: انوار القلوب، شہزادہ منعم بخت خلف شاہ عالم، مؤلفہ ۱۲۵۵ھ (مخزونہ کتب خانہ دارالعلوم دیوبند) نیز دیکھیے: حالات مشائخ کاندھلہ ص ۶۔ مہمات احمدیہ (ملفوظات و تعلیمات حضرت سید احمد شہید) تالیف مفتی الٰہی بخش (آگرہ، ۱۲۹۹ھ) نیز سیرت سید احمد شہید اور کاروان علم و معرفت از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مجاز، شعر و سخن[1] کے ماہر، علم و افادہ میں[2] اور زبان و ادب کے رمز شناس تھے۔ مفتی صاحب نے عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں تصنیفات و تالیفات، شروح و تراجم اور تلخیصات کا ایک وسیع ذخیرہ یادگار چھوڑا۔ تصنیفات کی مکمل فہرست دستیاب نہیں لیکن اس وقت تک چھیاسی کتابوں کا سراغ لگا ہے، جن میں سے ستر ہمارے ذخیرۂ کتب میں محفوظ ہیں۔ معلوم تصنیفات میں سے تیس[3] عربی میں، پچاس فارسی میں اور چھ اردو میں ہیں۔ اس وقت تک مفتی صاحب کی کل گیارہ کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ بعض کتابوں کے متعدد ایڈیشن نکلے، مقبول کتابوں میں سیرت کے موضوع پر شیم الحبیب اور سلوک و ادب کے موضوع پر مختصر یادگار رکھ کر کتابیں شامل ہیں۔ اول الذکر کے چوبیس ایڈیشن اور موخر الذکر کے کم سے کم سات ایڈیشن شائع ہوئے۔ مگر جملہ کتابوں میں سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت 'اختتام مثنوی مولانا روم' کو حاصل ہوئی جو متعدد اشارات و بشارات کے بعد ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۱ء میں معرض وجود میں آیا۔ اہل سلوک و معرفت کی محفلوں اور ارباب فضل و کمال کی مجلسوں میں یکساں باریاب و مقبول و محبوب و دلنواز قرار پایا۔

'اختتام مثنوی مولانا روم' کی نقلیں اور مولف کے حوالہ سے اس کی روایت و قرأت مفتی صاحب کی زندگی میں عام ہو گئی تھی مگر پہلا ایڈیشن [illegible] میں نولکشور پریس لکھنؤ سے نکلا اور اس قدر مقبول اور 'مثنوی مولانا روم' کے ساتھ اس طرح ملحق ہوا کہ اس وقت سے آج تک برابر شائع ہو رہا ہے، اور 'مثنوی مولانا روم' کے ہندوستانی تمام ایڈیشنوں کے ساتھ شامل ہے۔

مفتی الٰہی بخش (ولادت سنہ ۱۱۶۲ھ/۱۷۴۹ء) نے اپنی تمام زندگی علم و تحقیق، تعلیم و تدریس، ارشاد و تلقین، وعظ و تذکیر، معالجات اور تصنیف و تالیف میں مشغول بسر کی، اور بیاسی سال کی عمر میں ۱۵ جمادی الاخری، ۱۲ دسمبر سنہ ۱۲۴۵ھ/۱۸۲۹ء کو کاندھلہ میں وفات پائی۔

مفتی صاحب کے گھرانے میں علم اور کتب خانہ متوارث چلا آ رہا تھا۔ علم کی دولت مفتی صاحب اور ان کے برادران والاشان کو منتقل ہوئی، مگر کتب خانہ، کاندھلہ پر سکھوں، جاٹوں اور احمد شاہ ابدالی کے فوجی دستوں کی بار بار یورشوں سے

---

1. مفتی صاحب کا ذوق سخن متبع تصوف تھا۔ مفتی صاحب نشاط تخلص کرتے تھے۔ دیوان بھی مرتب کیا تھا جس پر حضرت شاہ عبدالعزیز کی منظوم تقریظ تھی۔ دیوان تو غالباً تلف ہو گیا مگر اردو فارسی کلام کی ضخیم بیاضیں محفوظ ہیں۔ متعدد تذکرہ نگاروں نے مفتی صاحب کے ذوق شعر گوئی کا تذکرہ کیا ہے، مثلاً واعظ ہوپالی گلشن بے خار ... طبع دوم (آگرہ ...)، گلشن ہمیشہ بہار، نصر اللہ خاں خویشگی ... طبع اول (مطبع الاخبار ...)، نیز طبع دوم مرتبہ ڈاکٹر اسلم فرخی ... (کراچی ...)، گلستان بے خزاں، قطب الدین باطن ... (نولکشور ...)، طبقات الشعرائے ہند، کریم الدین پانی پتی ... (دہلی ...)، سخن شعرا، عبدالغفور نساخ ... (لکھنؤ ...)۔ اس کے علاوہ بھی بعض تذکرہ نگاروں نے مفتی الٰہی بخش نشاط کا ذکر کیا ہے، نیز دیکھیے خطبات گارساں دتاسی ... (اورنگ آباد ...)

2. مولانا عبدالحی حسنی لکھتے ہیں: "درس وافاد مدة عمره واخذ عنه خلق لا یحصون بحد و عد" نزہۃ الخواطر ... (دہلی ...)

3. مفتی الٰہی بخش کے والد مولانا حکیم شیخ الاسلام کی وفات کے بعد قصبے کے قاضی کی مہر اور عزیز باشہر کی تصدیقات سے مزین ... اس واقعہ کی تفصیلات درج ہیں کہ ... جاٹوں اور سکھوں کے کاندھلہ پر بار بار حملوں اور قصبے پر مار اور آتش زنی کے واقعات کا تذکرہ ہوتا ہے۔

اس بری طرح تباہ و برباد ہوا کہ اس کا ایک ورق بھی محفوظ نہیں رہا۔ پرانے ذخیرے کی بربادی کے بعد مفتی صاحب نے اپنی ضرورت کے لیے ایک نئے کتاب خانہ کی بنا استوار کی۔ ذخیرۂ الٰہی بخش کا جدست کتابوں، مفتی صاحب کی تحریرات اور بیاضوں کے اندراجات سے معلوم ہوتا ہے کہ مفتی صاحب نے مختلف علوم و فنون کی مفید کتابوں کا منتخب ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔

مفتی صاحب کی وفات کے بعد ان کے اخلاف نے اس ذخیرہ کی قدر کی، سلیقہ سے محفوظ رکھا۔ اور اس کی توسیع و ترقی پر توجہ فرمائی۔ مولانا ابوالحسن[۱] نے طب کے بعض مصنفات بہم پہنچائے۔ درسیات خصوصاً منطق و فلسفہ اور اس کے متعلقات و شروح پر نادر کتابیں نقل کرائیں، اور اپنا تمام ذخیرہ مولانا نورالحسن[۲] کے سپرد فرما دیا، مولانا نورالحسن نے اس ذخیرہ کی حفاظت و نگہداشت اور آبائی کتب خانہ کی توسیع و ترقی کے لیے اپنے تمام وسائل اور زندگی کے بہترین اوقات صرف فرما دیے، ملک کے کونے کونے سے منتخب مخطوطات اور نادر کتابیں مہیا کیں اور خاندانی ذخیرہ کتب کو مصنفین کے لکھے ہوئے نسخوں، نامور علما کے رشحات قلم سے مزین کتابوں، نامور خطاطوں کی تحریرات، شاہی کتب خانوں کے آثار و باقیات اور حسین، و منقش قیمتی جلدوں سے مالا مال کر دیا اور سخت محنت و کوشش کے بعد مفتی صاحب کے متروکہ کتب خانہ کو ترقی دے کر اس مقام پر لے آئے تھے کہ اگر آج مولانا کا کتب خانہ بتمام و کمال محفوظ ہوتا تو اس کو ہندوستان کے اہم ترین کتب خانوں میں شمار کیا جا سکتا تھا۔

معلوم کتابوں کی تفصیلات سے قطع نظر، مولانا کے کتب خانہ کی اہمیت کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مولانا کے لیے کتب خانوں کی معلومات، اہم کتابوں کی تلاش و انتخاب، نقل نویسوں کا انتظام اور منقول کتابوں کے تصحیح و مقابلہ کے سلسلہ میں اہم اور قریب ترین ذرائع مولانا مفتی صدرالدین آزردہ، مولانا فضل حق خیرآبادی، مولانا امام بخش صہبائی جیسے نادرۂ روزگار افراد تھے۔ بعض اوقات مرزا غالب کے مشورے اور تعاون سے بھی مدد ملی، مولانا کے کاغذات میں ایک یادداشت ہے جس میں فارسی کے کتب لغات و منتخبات کے نام تحریر ہیں: "خریدکردہ از دہلی معرفت مرزا غالب" درج ہے۔

مولانا نورالحسن نے ہزارہا مخطوطات مختلف ذرائع سے حاصل کیے، سینکڑوں نقل کرائے، دہلی اور کلکتہ سے تازہ ترین

۱- مولانا ابوالحسن خلف حضرت مفتی الٰہی بخش، والد سے تعلیم حاصل کی، بڑے جید عالم، عارف اور طبیب تھے، متعدد منظوم و منثور تصنیفات اور مثنویاں یادگار ہیں۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، اور متعدد نامور علما کے استاد ہیں۔ ۱۲ جمادی الثانی ۱۲۶۹ھ مطابق ۲۲ مارچ ۱۸۵۳ء کو کاندھلہ میں وفات ہوئی۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، "حضرت حاجی امداد اللہ کے اساتذہ" مؤلفہ نورالحسن راشد مشمولہ امداد المشتاق، مرتبہ ڈاکٹر مختار احمد صاحب فاروقی، ص ۲۳۲ تا ۲۵۱ (دہلی: ۱۹۸۰ء) نیز دیکھیے ماہنامہ الفرقان لکھنؤ اپریل ۱۹۸۱ء۔ ۲- مولانا نورالحسن خلف مولانا ابوالحسن کاندھلوی بن حضرت مفتی الٰہی بخش، ربیع الثانی ۱۲۰۵ھ مطابق مئی ۱۷۹۰ء کو ولادت ہوئی۔ ابتدائی کتابیں والد ماجد سے پڑھیں، عربی متوسطات مدرسہ غازی الدین حیدر (دہلی) میں اور معقولات و ادب مولانا مفتی صدرالدین آزردہ، اور مولانا فضل حق خیرآبادی سے اخذ کیے۔ حدیث میں شاہ محمد اسحاق سے شرف تلمذ ہے۔ مولانا نورالحسن آزردہ اور مولانا خیرآبادی کے مخصوص شاگردوں میں شامل ہیں۔ خصوصاً مولانا خیرآبادی سے قربت و اختصاص میں کوئی اور تحقیق مولانا نورالحسن کا شریک نہیں۔ مولانا کے نام مولانا خیرآبادی کے خطوط سے اس خلوص و یگانگت کا علم ہوتا ہے، مولانا خیرآبادی کے مولانا کے نام اپنا کی خطوط ایک مجموعہ مکتوبات میں محفوظ ہیں۔ مجموعہ مکتوبات کا باب دوم آزردہ، مولانا فضل عظیم خیرآبادی اور مولانا رحمت اللہ کے مکتوبات پر مشتمل ہے، آزردہ کے خطوط کے متن کے لیے ملاحظہ فرمایئے راقم سطور کا مقالہ مکتوبات آزردہ بنام مولانا نورالحسن کاندھلوی مجلہ غالب نامہ (نئی دہلی) جنوری ۱۹۸۵ء

اہم مطبوعات کی فراہمی کا سروسامان کیا، اور وفات کے وقت بارہ تیرہ ہزار کتابوں پر مشتمل ایک شاندار کتب خانہ جس کا اکثر حصہ مخطوطات سے گرانبار تھا، یادگار چھوڑا۔ ہمارے خاندان میں موجود اور خصوصاً ہمارے زیرِ تعارف سرمایہ کی بیشتر قلمی کتابیں اسی خزانہ کی باقیات صالحات ہیں۔

مخطوطات کے علاوہ مولانا نورالحسن اور ان کے اسلاف سے وابستہ ایک انمول یادگار، حضرت شاہ عبدالعزیز سے سرسید احمد تک علما، فضلا اور مشاہیر اربابِ علم و کمال کے مکتوبات (بنام حضرت مفتی الٰہی بخش، مولانا ابوالحسن اور مولانا نورالحسن وغیرہ) کا ایک بڑا انبار تھا، جس میں صرف سرسید احمد کے ایک سو پچاس خطوط تھے، اسی سے تمام ذخیرہ کی وسعت و ثروت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ خزانۂ عامرہ جو ہندی ملت اسلامیہ کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ کا مرقع اور بے شمار اہلِ فضل و کمال کے ذاتی احوال و نظریات کا ترجمان تھا سنہ ۱۹۴۰ء تک محفوظ رہا، اس کے بعد جب اور سب چیزیں غائب ہوئیں، یہ سرمایہ بھی کالعدم اور بے نام و نشان ہو گیا۔

مولانا نورالحسن کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادگان نے جو علم و عمل کی خاندانی روایات کے امین اور مطالعہ و تصنیف کے ذوق سے بہرہ ور تھے، کتب خانہ میں ترقی اور اضافات کے لیے اپنے اپنے حسبِ ذوق نئے نئے گوشے تلاش کیے اور اس کو مختلف علوم و ادب کے مختلف عنوانات، تاریخِ اسلام اور علومِ عقلیہ کی تازہ کتابوں اور مصر و استنبول کی مطبوعات سے زینت بخشی۔

مذکورہ خانوادہ کی تیسری نسل ایم۔ اے۔ او کالج علیگڈھ کے ابتدائی دور کی تعلیم یافتہ، انگریزی زبان و ادب کی ماہر اور تعلیم و تحقیق کے نئے مغربی رجحانات سے واقف تھی، اس کے زمانہ میں مولانا نورالحسن کا کتب خانہ اسلامیات اور تاریخ پر انگریزی کی عمدہ کتابوں، یورپ کے مطبوعات اور اہم کتب حوالہ سے آشنا ہوا، اور اس کے بعد اس کتاب خانے کو نہ جانے کس کی نظر لگی کہ اس کی توسیع و ترقی کے جذبات پژمردہ، اور موجود بیش بہا سرمایہ آفات و مصائب کا شکار اور سموم حوادث کی نذر ہو گیا، پچھلے پچاس سال کی تاریخ اس کے زوال کی تاریخ ہے، کیا کیا قیمتی، نادر و نایاب کتابیں کہاں کہاں گئیں، کس کس طرح ضائع ہوئیں، کیونکر لکھوں کس طرح بتاؤں، قلب و جگر زخمی اور روح ماتم کناں ہے، تفصیلات سنانے کا یارا نہیں۔

★ مولانا نورالحسن سینٹ جونس کالج آگرہ میں شعبۂ عربی کے صدر اور مہاراجہ الور کے ملازم رہے۔ مولانا سے کثیر علما کو تلمذ ہے، مولانا عبدالحی حسنی کا قول ہے: "واخذ عنہ خلق کثیر من العلماء" نزہۃ الخواطر ص۱۱۵ ج ۷۔ تلامذہ میں علما کے علاوہ ممتاز ترین شخصیت سرسید احمد کی ہے، سرسید نے اپنی متعدد تصنیفات میں مولانا سے تلمذ و استفادہ کا عقیدت و محبت سے ذکر کیا ہے۔ مولانا سے سرسید احمد کے تلمذ، مولانا کے نام سرسید احمد کے خطوط اور مولانا کے مختصر حالات کے لیے ملاحظہ ہو راقم سطور کا مضمون "حیات سرسید کا ایک گم شدہ ورق" ماہنامہ آج کل نئی دہلی، مئی ۱۹۷۵ء، بعض اور تلامذہ کے لیے شجرۂ فیض علم الٰہی، نقش مرتبہ نورالحسن راشد۔ مولانا نورالحسن نے اٹھاسی سال کی عمر میں ۱۱ محرم ۱۲۸۵ھ/۵ مئی ۱۸۶۸ء کو کاندھلہ میں وفات پائی۔

مختصر یہ ہے کہ ہمارے خاندانی یعنی مولانا نورالحسن کے کتب خانے کا تقریباً ایک تہائی حصہ تو ۱۹۴۷ء سے پہلے ضائع ہو گیا تھا، جو باقی رہا اس کو مولانا کے اخلاف نے اپنے جدامجد کا ترکہ قرار دے کر میراث کے شرعی اصول کے مطابق مولانا کے ورثاء میں تقسیم کر دیا۔ کتابوں کا ایک قابل ذکر حصہ تک ضائع ہو جانے کے باوجود مولانا کا ذخیرہ مخطوطات سے اس قدر مالامال تھا کہ مجملہ ۳۲ سہام کے فی سہام کم سے کم سو قلمی کتابیں حصے میں آئیں، مطبوعات کا سرمایہ اس کے علاوہ تھا۔ اگرچہ کتابوں کی تقسیم خود اہل خاندان کی نظر میں بھی بہتر اور پسندیدہ نہیں تھی، لیکن افسوس کہ اس وقت کے غیر یقینی حالات کی وجہ سے کسی اور تجویز پر اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ تقسیم کے بعد اس کتب خانہ کا بھی وہی انجام ہوا جو ایسے مواقع پر ہوتا آیا ہے۔ کچھ شرکائے تو اپنی کتابوں کو شاید ایک مرتبہ دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی۔ بعض اصحاب کو وقتی طور پر کچھ دلچسپی رہی لیکن آہستہ آہستہ کتابوں سے ترک تعلق ہوتا گیا، آخر میں وہ سب کتابیں یا تو ادھر اُدھر گئیں یا ضائع ہوئیں، کچھ اور سرمایہ بعض مدرسوں اور دینی اداروں کو منتقل ہوا لیکن اس کو بھی بالآخر زوال اور تباہی سے سابقہ پڑا۔ لیکن چند افراد نے اپنے اپنے حصے کی پوری پوری حفاظت کی ضائع ہونے سے بچا لیا اور دوسروں کو بھی ان سے رجوع اور استفادہ کا موقع دیا۔ ایسا ہی ایک حصہ میرے والد ماجد حضرت مولانا افتخار الحسن کاندھلوی مدظلہ کی تحویل میں تھا۔ خاندانی اثاثہ کے علاوہ اس میں کچھ کتابیں ذاتی شوق کا حاصل اور خود خریدی ہوئی تھیں۔

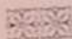
دس بارہ سال پہلے راقم سطور نے اس تمام ذخیرہ پر ایک مفصّل نظر ڈالی۔ ایک ایک کتاب بلکہ ایک ایک ورق دیکھا۔ اور حسب صلاحیت و ذوق اس کی خصوصیات و محاسن قلمبند کئے اور قدیم کتب خانہ کی یادگار وہ بستے اور بنڈل بھی کھولے جن کو شاید عرصہ سے کھولا نہیں گیا تھا۔ ان کے موجودات کا جائزہ لیا۔ منتشر اوراق مرتب کئے اور تمام چیزوں کی ایک چھوٹی سی فہرست بنا ڈالی۔

جب میرے والد ماجد کو میرے اس ذوق کا علم ہوا تو انھوں نے (بارک اللہ فی حیاتہ) کتب خانہ کی توسیع و ترقی پر، اور اہل خاندان میں منتشر کتابوں کو یکجا کرنے، ان کی جلدیں بنانے اور ان کی حفاظت و نگہداشت پر خاص توجہ مبذول فرمائی۔ اولاً اہل خاندان سے رجوع کیا اور ان میں سے بعض کی کتابیں قیمتاً حاصل فرمائیں اور دیگر ذرائع سے بھی کتابوں کی خریداری کا سلسلہ شروع کیا جو اس وقت تک جاری ہے۔ کچھ کتابیں والد ماجد کے متوسلین نے تحفتہً نذر کیں، کچھ اور کتابیں راقم سطور کو اپنے کرمفرماؤں سے حاصل ہوئیں۔ اور خدا کے فضل و کرم سے اس میں ہر لحاظ سے اور ہر سمت میں برابر ترقی ہو رہی ہے، سفر جاری ہے اور ان شاء اللہ رواں دواں رہے گا۔

میرے اولین جائزہ کتب کے وقت ہمارا مخطوطات و مطبوعات کا تمام سرمایہ ایک ہزار سے متجاوز نہیں تھا۔

لیکن اس کے بعد کتب خانہ کی توسیع و ترقی کے لیے والد ماجد مدظلہ کی گہری دلچسپی، دس بارہ سال کی تلاش و جستجو اور کثیر اخراجات کے بعد جس میں بسا اوقات احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا تھا اور اپنے وسائل سے تجاوز کر کے زیر بار بھی ہونا پڑتا تھا، اس وقت ہمارے ذخیرہ میں نو سو پچاس مخطوطات اور تقریباً ساڑھے سات ہزار مطبوعات محفوظ ہیں۔ مخطوطات میں چار سو دس (۴۱۰) عربی میں، تین سو بانوے (۳۹۲) فارسی میں، اور ایک سو تینتیس (۱۳۳) اردو میں ہیں۔ بارہ، پندرہ کتابیں نوادر ہیں۔

میری دلی خواہش ہے کہ اس ادارہ اور لائبریری (مفتی الٰہی بخش اکیڈمی) کا افادہ عام ہو اور اس کے وسیلے سے علم و تحقیق کی راہ میں کچھ اور چراغاں کچھ اور روشنی ہو، اردو مخطوطات مخزونہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کی فہرست، اور زیر نظر سطور کی اشاعت اسی احساس کی ترجمان ہیں۔



فہرست مخطوطات اردو کاندھلہ

تفسیر

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۱	تفسیر پارہ عم	مراد اللہ سنبھلی مؤلفہ ۱۱۸۴ھ			۱۹۱	
۲	تفسیر موضح القرآن جلد ا	حضرت شاہ عبد القادر محدث دہلوی مؤلفہ ۱۲۰۵ھ	مکارم علی ساکن مرادہ	۱۲۴۰ھ		نقل کردہ برائے مظفر حسین کاندھلوی
۳	تفسیر موضح القرآن	"	"			در مدرسہ شاہ محمد اسحاق صورت تحریر یافت آخری ۷ پارے
۴	تفسیر موضح القرآن	"	"	غریب اللہ صدیقی نقشبندی	۵۰۱	دیدہ زیب مطلا نسخہ
۵	تفسیر موضح القرآن	"	"			نصف آخر مکمل
۶	تفسیر موسوم بہ موضح القرآن	"	"	۱۲۳۴ھ		سات جلدوں میں بیگم صاحبہ امت الحبیب کے لیے لکھا گیا یہ وہی تفسیر ہے جس کو سید احمد ولی اللّٰہی اور مولانا اخلاق حسین قاسمی نے جعلی موضح القرآن قرار دیا ہے، مگر ان کی رائے صحیح نہیں ہے۔
۷	ترجمہ تفسیر عزیزی، پارہ عم	مترجم مولوی محمد حسین خاں شیدا الہوی			تقریباً ۱۵۰	

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق یا صفحات	کیفیت
۸	ترجمہ منظوم پارۂ عم (ناقص الطرفین)					نمونۂ ترجمہ: فان اللہ غنی عن العالمین یعنی بے پرواہ ہے وجود خلق سے بس وہ مستغنی وجود حق ہے۔
۹	مرآۃ حق نما ترجمہ تفسیر سورہ مزمل	مولفہ سید طٰہٰ کتانوی ترجمہ: عبدالحق ناطف بن حکیم محمد بخش ابن جلال الدین منظفر نگری	بخط مترجم	۱۲۹۷ھ	۳۹۰	یہ کتاب شائع ہو چکی ہے ایک خطی نسخہ صولت پبلک لائبریری رامپور میں ہے۔
۱۰	تفسیر قرآن		مسودہ مؤلف			سورۂ یوسف سے سورۂ دہر تک مختلف اجزاء ایک تفسیر کی مسودے شائع ہو چکے ہے حاشیہ پر کاتب ناقل کے اشارات اور صفحات لکھے ہوئے ہیں۔
۱۱	التقصیر فی التفسیر (مبیضہ)	مولانا تھانوی	اسعد اللہ رامپوری	۱۳۵۱ھ	۱۴۶ ص	شرح و تسہیل: مولانا اسعد اللہ رامپوری ایک صفحہ حضرت تھانوی کی اصلاحات سے مزین ہے۔
۱۲	التقصیر فی التفسیر (مسودہ)		شرح تسہیل: مولانا اسعد اللہ رامپوری			
۱۳	تحقیقات اشرفیہ	افادات: مولانا اشرف علی تھانوی تالیف: مولوی ناظر حسین تھانوی	مولوی ناظر حسن		۲۲	مختلف آیات کے معانی و مطالب
۱۴	ترجمہ قرآن شریف	شبیر احمد جذبی کاندھلوی	مسودۂ مؤلف	۱۹۵۶ء		فاتحہ سے نحل تک
۱۵	تاویل التنزیل یا تفسیر اشرف "جلد اول"	مولانا اشرف علی تھانوی	ناظر حسن تھانوی	۱۳۱۳ھ	۸۳۲	پہلے نو پارے
۱۶	" " "جلد دوم"	" "	" "	۱۳۱۴ھ		
۱۷	" " "جلد سوم"	" "	" "			تا سورۂ شوریٰ آیت ۳۱۔

تجوید

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۱	سبع طباق	مولانا اشرف علی تھانوی	غالباً مولوی ناظر حسن تھانوی	قبل از ۱۹۱۷ء		یہ کتاب "تنشیط الطبع فی الاجراء السبع" ہے جو شائع ہو چکی ہے
۲	رسالہ در تحقیق ضاد	مولانا عبدالعزیز امروہی	مسودہ مؤلف			

حدیث

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۱	کنز اللطائف یا تقریر ترمذی	مترجم: مولانا اشرف علی تھانوی	مولوی ناظر حسن	۱۳۱۳ھ	۳۳۶ ص	مولانا کی اصلاح و تحریرات سے مزین ہے
۲	تحفۃ القاری تقریر درس صحیح بخاری	افادات: شبیر احمد عثمانی مرتبہ: محمد مالک کاندھلوی	محمد مالک کاندھلوی			
۳	فوائد اشرفیہ متعلقہ موطا امام مالک	افادات: اشرف علی تھانوی ترتیب: ناظر حسن تھانوی	ناظر حسن تھانوی	۱۳۱۳ھ	۳۹	
۴	چہل حدیث (مترجم)			۱۲۴۸ھ		
۵	رسالہ گناہ کبیرہ	الٰہی بخش کاندھلوی	امام الدین کاندھلوی	۱۲۳۸ھ		

فقہ

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۱	ازالۃ الکفر (منظوم)	الٰہی بخش کاندھلوی	امام الدین کاندھلوی	۱۲۳۸ھ	۲۱	
۲	کتاب فقہ (منظوم)					عنایت احمد پر ہمیشہ افزوں، رکھو بنا و آخرت میں
۳	مفتاح الجنت	کرامت علی جونپوری				ناقص الآخر
۴	آداب ماں اور باپ کے					ناقص و ناتمام
۵	رسالہ متعلقہ مسائل زنان	عبدالکریم بن مخدوم درویزہ				

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۶	ہدایات	عنایت احمد کاکوروی	محمد یوسف	۱۸۸۰ء		
۷	جوابات چند سوالات	نذیر حسین میاں دہلوی	محمد یوسف			
۸	رسالہ در بیان بعض منہیات شرعی	قربان علی				
۹	رسائل متفرق اجتہاد و تقلید وغیرہ	مولوی عبدالکریم، مولوی کاشف نیا، مولوی محمد حسین، مولوی عبید اللہ مؤلف تحفۃ الہند		۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۱ء		
۱۰	تقریر الصلوٰۃ	شاہ عبدالقادر محدث دہلوی		۱۲۴۸ھ		
۱۱	صد وسی مسئلہ (منظوم)	محمد امیر				صد وسی مسئلہ فرض خدا نے تم سیکھو ...... (ملاحظہ ہو فہرست مخطوطات اردو انجمن ترقی اردو کراچی ص ۱۱۳ تا ۱۱۴ جلد اوّل)
۱۲	رسالہ نقد ہندی (منظوم)					سنتیں اب وضو کی دس پہچان جو کوئی چلے اسکو ہر دیے پہچان
۱۳	رسالہ بے نماز ان (منظوم)					
۱۴	رسالہ نقہ (منظوم)					اگر دو عدد تک کریں بیگنیاں شرک کی دیا بکری کی ہوں عیاں
۱۵	فتاوی مولانا رشید احمد گنگوہی	رشید احمد گنگوہی		۱۳۲۳ھ		خان آپ کا جوابات حضرت گنگوہی
۱۶	معیار الشریعۃ	عبدالحی لاہوری	غالباً مؤلف کا قلم ہے	۱۹۲۲ء		
۱۷	آداب معیشت	احتشام الحسن کاندھلوی	نسخہ مکتوبہ مؤلف			
۱۸	تقریر الصلوٰۃ	شاہ عبدالقادر محدث		۱۲۳۸ھ		(فوٹو اسٹیٹ)

مواعظ یا دینیات عامہ

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۱	رسالہ علامات قیامت					
۲	خیر الوصایا	غلام اکبر خاں	محمد یوسف تھانوی			
۳	رسالہ در احوال قیامت و بعض مسائل ضروریہ					ناقص الطرفین
۴	رسالہ ذکر دین (منظوم)	شمس الدین دیوبندی مرید سید احمد شہید	محمد حسن	تاریخ تحریر موجود نہیں	۳۲	مواعظ نو تاریخ دیوبند سید محبوب رضوی ص ۲۰۶ جمع دوم
۵	مواعظ حسنہ	افادات: اشرف علی تھانوی	ناظر حسین تھانوی	۱۳۱۵ھ	۳۰	یہ حضرت کے سب سے پہلے مطبوعہ مواعظ ہیں جو ابھی تک شائع نہیں ہوئے۔
۶	تحفظ قرآنی	" "	" "	۱۳۱۵ھ		اس میں ایک خاتون کا تذکرہ ہے جو تحفظ آیات قرآنی کیا کرتی تھیں۔
۷	اسلامی معاشرت کیا ہے؟	احتشام الحسن	نسخہ مؤلف	۱۳۸۶ھ		
۸	رسالہ جہادیہ	خرم علی بلہوری		تقریباً ۱۲۴۸ھ		بعد تحمید و نعت رسول کریم یہ رسالہ جہادیہ لکھتے تھے
۹	رسالہ فضائل علم و عمل		حکیم علی اکبر کیرانوی			
۱۰	رسالہ تذکرہ الجنۃ والنار	نواب قطب الدین احمد دہلوی	" "			

تصوّف

۱	انوار الوجود فی تحقیق وحدۃ الوجود والشہود	اشرف علی تھانوی	ناظر حسن تھانوی	۱۳۱۵ھ	۳۱	
۲	الوجود والشہود الفوائد فی التذکرہ الاشرفیہ	افادات: "	" "			جس میں برزخ وغیرہ مختلف مسائل پر حضرت کے افادات جمع کیے گئے۔

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۳	وصایا حکیم لقمان		محمد یوسف ٹانڈہ	۱۲۹۷ھ		

مجموعہائے ملفوظات

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۱	تذکرۂ اشرفیہ	ملفوظات اشرف علی تھانوی	ناظر حسن تھانوی			
۲	لاریب فیہ	ملفوظات مولانائے روم	شبیر احمد جلندی	۱۳۸۹ھ		ترجمہ فیہ ما فیہ
۳	مجموعہ مکتوبات	امداد اللہ مکی، محمد قاسم نانوتوی، رشید احمد گنگوہی، محمد یعقوب نانوتوی بنام امداد اللہ وغیرہ	غالباً عاشق الٰہی میرٹھی و عبداللہ گنگوہی			فوٹو اسٹیٹ

عملیات

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۱	ترجمہ الو مجربات دیربی	مترجم بشارت علی بن مردان علی	محمد زکریا بن محمد یوسف بڈھانوی	۱۹۳۲ء	۱۰۴ ص	
۲	جواہر خمسہ		" "	۱۳۵۶ھ	۱۶۶ ص	

اوراد و وظائف

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۱	اردو ترجمہ دلائل الخیرات			۱۲۳۰ھ		
۲	قصر العرفان علی بنیان الایمان	عبدالعزیز امروہوی				

ردّ بدعات

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۱	نصیحۃ المسلمین	خرم علی بلہوری		قبل از ۱۲۲۵ھ	۲۴	آخری صفحہ پر مفتی الٰہی بخش کے قلم سے انکی اپنی ایک نظم تحریر ہے مؤلفہ ۱۲۳۹ھ
۲	ہدایات المومنین	حسن علی قنوجی		تقریباً ۱۲۶۰ھ		
۳	ردّ رسوم	مظفر حسین کاندھلوی (م ۱۲۸۳ھ)	محمد رضا شہید …	تقریباً ۱۲۶۰ھ		

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۴	رسالہ تعزیہ داری	شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی	حکیم علی اکبر کیرانوی	١٢٧٩ھ		
۵	رسالہ سیف قاطع منظوم در رد اہل تشیع					
۶	رسالہ در رد عیسائیان				١٦٥	تقریباً سو سال پرانا نسخہ ہے۔ نفیس کاغذ خوشخط تحریر
۷	مولد شریف				١٢٧	
۸	وفات نامہ (منظوم)	خان مرادآبادی		تیرھویں صدی		
۹	وفات نامہ					

سیر الصحابہ

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
١	تحفۃ السلاطین فی فضائل اصحاب رسول الرحمٰن	نواب قطب الدین دہلوی		١٢٧٠ھ		ناقص الآخر
٢	احوال حضرت کعب بن زہیر رضی اللہ عنہ	شبیر احمد جذبی				

تذکرہ علما و صوفیا

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
١	تذکرۃ الاولیا	محمد زکریا بن یوسف بڈھانوی م ١٩٥٣ء			٦٠١	نسخہ مولف ١٤٠٠ علماء کا تذکرہ
٢	فہرست تذکرۃ الاولیا	" "				نسخہ مولف
٣	ترجمہ تحائف رشیدیہ از شاہ عبدالرشید قادری کیرانوی ١١٤٣ھ (در احوال مشائخ سلسلہ قادریہ)	مترجم: نصیر الدین احمد عثمانی پانی پتی	نسیم احمد خاں	١٣٩٩ھ	٧٧ ص	صرف اہل کیرانہ سے متعلق
۴	حالات صوفیا و مشائخ کیرانہ	شاہ عبدالرشید قادری کیرانوی	غالباً پیر جی ناظر حسن جھنجھانوی	١٣٦٠ھ		

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۵	حالات صوفیا و مشائخ کیرانہ (نقل)	شاہ عبدالرشید قادری کیرانوی	مصطفیٰ علی تھانوی	۱۳۹۲ھ		
۶	حالات منشی عبدالرزاق تھانوی	ناظر حسن تھانوی	ناظر حسن تھانوی	۱۳۳۲ھ	۸۴ص	تحریر از ناظر حسن (تاریخ تھانہ بھون)
۷	نابینا علماء		محمد زکریا بن یوسف بڈھانوی	۱۳۵۸ھ		

تذکرہ شعراء

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۱	گلدستۂ نازنیناں	کریم الدین پانی پتی	امیر بیگ امیر کاندھلوی برادر زادہ سعادت یار خاں رنگین		۵۰	یہ نسخہ اس لحاظ سے خاص اہم ہے کہ اس کی ترتیب گلدستہ کے مطبوعہ نسخے سے کچھ مختلف ہے اور اس میں بعض اضافات ہیں خصوصاً رنگین کے حالات ہیں۔

تاریخ

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۱	تاریخ عالم	محمد زکریا بڈھانوی			۳۳۱ ۳۶-۴۰ سطور	نسخۂ مؤلف، تاریخ اولیاء کا پہلا حصہ لیکن وضع مختلف
۲	خلاصہ تاریخ ہند		امیر بیگ امیر کاندھلوی			
۳	تاریخ قصبہ تھانہ بھون	ناظر حسن تھانوی	ناظر حسن تھانوی	۱۳۳۳ھ	۶۸۰ص	

ادب اردو نثر

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۱	مذہب عشق (گل بکاؤلی)	نہال چند عشق	امیر بیگ خاں کاندھلوی	۱۲۳۰ھ / ۱۸۳۰ء	۶۳	
۲	مذہب عشق	" "	سید باقر علی کرنالی	۱۲۶۰ھ		
۳	ترجمہ داستان وصال نامہ (مع اضافات و ترتیب جدید)	منور علی ولد شیخ نور علی ایذوی			۱۱۴ ۱۵ سطور	سن تالیف ۱۸۲۲ء / ۱۲۳۷ھ مؤلف نے باغ و بہار دلچسپ لکھا ہے۔

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۴	داستان					۱۲۰۴ھ میں واقع بندرابن کے ایک نوجوان کا قصۂ محبت

ادب اور نظم

۱	رسالہ حمد و نعت و مناجات		قدیر النساء		۱۲	
۲	انتخاب کلام حمد و نعت	علوی درنگیلا تھانوی، شوکت علی تھانوی، اصغر تھانوی، عارف تھانوی، انوت تھانوی	ایوب علی تھانوی، میکش تھانوی، بیدل رامپوری			
۳	بستان شہادت (ترجمہ منظوم)	علی احمد رازی سرادی	اصغر علی و منصور علی نیازی	۱۲۶۵ھ	۳۱۸ فی ۱۲ سطور	اس کا ۱۲۲۰ھ کا ایک نسخہ انجمن ترقی اردو کراچی میں بھی ہے فہرست ص۱۱ جلد ششم فہرست میں ۱۲۲۳ھ کو سنہ تالیف لکھا ہے جو درست نہیں ہے۔ تالیف ۱۱۸۲ھ ہے۔
۴	مثنوی دریائے عشق	میر تقی میر		۱۲۰۶ھ		
۵	دیوان رنگین	سعادت یار خاں رنگین	امیر یار بیگ برادر زادہ رنگین			
۶	دیوان امیر	امیر یار بیگ برادر زادہ رنگین	،،			
۷	مثنوی مظہر العجائب و عمدۃ الغرائب	میر ضمیر لکھنوی (م ۱۲۷۳ھ)				در حیات مؤلف ضمیر کو سلّمہ اللہ لکھا ہے۔
۸	مثنوی مرغوب القلوب	شاہ غیاث الدین رہتکی	میر اسد اللہ	۱۲۱۶ھ		
۹	مثنوی قصہ سیاہ پوش	شکوہ علی	عبد المجید			اسی نام کی ایک مثنوی شاہ رحمان کی بھی ہے
۱۰	مثنوی قصۂ بدر منیر					ناقص الطرفین درمیان سے بھی کچھ اوراق ضائع ہو گئے ہیں
۱۱	مجمع فیض العلوم مثنوی مولانا روم (ترجمۂ منظوم)		الٰہی بخش نشاط و مولانا ابوالحسن کاندھلوی	۱۲۶۳ھ	۱۶۴	(ترجمہ ابتدائی ایک ہزار اشعار) مفتی الٰہی بخش
۱۲	،، ،،		ابوالنصر گنگوہی (تاریخ سہارنپور ص ۱۹۹)			(ترجمہ دفتر اول) ابوالحسن خلف الٰہی بخش نشاط
۱۳	،، ،،		اعجاز احمد کیرانوی	تقریباً ۱۲۷۵ھ		

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۱۴	مثنوی گلزار ابراہیم	ابوالحسن کاندھلوی		۱۲۵۲ھ	۱۵۳	نسخۂ مؤلف
۱۵	" "	" "	خلیفہ محی الدین کاندھلوی	۱۲۶۳ھ	۱۲۹	تصحیح کردہ مؤلف
۱۶	مثنوی بحر الحقیقت	" "				نسخۂ مؤلف
۱۷	" "	" "	مولانا حسن			ناقص الطرفین
۱۸	مثنوی سمجھ بوجھ	" "				
۱۹	مرثیہ نہر جمنا شرقی کاندھلہ	محمد احمد رسوا کاندھلوی				دو نسخے رسوا کاندھلوی غالباً ذوق کے شاگرد تھے
۲۰	ساقی نامہ	حکیم عبدالرحمن حیرت جھنجانوی (شاگرد صہبائی)		۱۸۸۵ء	۱۳۳	نسخۂ مؤلف تالیف بفرمائش شبلی نعمانی
۲۱	قصیدہ بانت سعاد (ترجمہ منظوم)	شبیر احمد جذبی کاندھلوی				نسخۂ مؤلف
۲۲	قصیدہ بردہ (ترجمہ منظوم)	" "				"
۲۳	معلقہ امرؤ القیس (ترجمہ منظوم)	" "				"
۲۴	مسدس عروج اسلام	" "	خلیق الرحمن کاندھلوی	۱۲۶۴ھ	۱۸۰	(بجواب مسدس مد و جزر اسلام حالی)
۲۵	بیاض اشعار و منتخبات	حکیم محمد نعیم خلف حکیم محمد سعید کیرانوی مہاجر مکی		۱۲۵۳ھ	۱۸۰	
۲۶	محاربات اسلام (جلد اوّل و دوم)	اولاد علی لکھنوی	امت المعبود بنت حکیم مولانا رضی الحسن کاندھلوی	۱۲۵۸ھ	۳۹۸+ ۳۷۶	
۲۷	مسدس رفیوض	شاہ نذیر حسن		۱۲۷۲ھ		
۲۸	تذکرۃ البلاغت	ذو الفقار علی دیوبندی	محمود (؟)	۱۳۳۳ھ		قیاس ہے کہ کاتب نسخہ شاید شیخ الہند مولانا محمود حسن ہیں

طب

۱	طب نبوی	اکرام الدین احمد دافلود پوری	حافظ محمد صادق	تقریباً ۱۲۶۱ھ	۶۰	
۲	طب نبوی تتمہ و تکملہ	نظر محمد خان				نسخۂ مؤلف مرید و مسترشد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۳	فوائد الطب	حکیم محمد علی اکبرآبادی	حکیم علی اکبر کیرانوی	۱۲۸۳ھ		
۴	کتاب طب نامعلوم الاسم					ناقص الآخر باب اوّل در تعریف صحت
۵	کتاب در تحقیق فلزات وجواہر				تقریباً ۱۰۰۰ ص	اس میں تمام دھاتوں اور اُپ دھاتوں کے بننے اسکے اور مختلف طریقوں سے انکے متفرق استعمال کا تذکرہ ہے
۶	مفردات یونانی	گنگا پرشاد رونق			۷۸	
۷	تنظیم المسلمین عن موالات المشرکین	عزیز الحسن کاندھلوی		۱۹۳۸ء		نسخۂ مؤلف (در جواب مسلک حضرت تھانوی)

Hejazi, *Zangana*, *Zabangir*, *Shahana*, and three others namely *Muzhik*, *Mubki*, *Munawwim*, which induced laughter, weeping and sleep respectively, come in Harf three, Vol. II of *Risail-ul-Ijaz* which contains a long discourse on Music, consisting of three sections, spread over seventeen pages. It relates to the root or fundamentals (*Usul*) of music and the branches or derivatives (*Furu'*) thereof (*Inshi'ab-i-Usul-o-Furu'-i-Musiqi*). These are mainly foreign and Persian. One could not expect the use of the nomenclature or terminology of the Indian system such as *Grama* (Scale), *Jati* (Fundamental harmony), *Srutis*, *Murchhana* (intervals), *Sarigam* (gamut), *Saptak* (Scale of 7 notes), *Svara*, *Tala*, *Laya*, *Dhun* and *That*. But there is nothing to show that Amir Khusrau's *Pardas* and *Maqams* were connected or identical with the 36 Ragas and Raginis and the other modes and melodies of the Indian musicians.

One finds no reference in the *Risail* or elsewhere to the modes or airs of the composite character such as *Qaul*, *Qalbana*, *Naqsh*, *Nigar*, *Aiman*, *Zilaf*, *Khiyal*, *Basit*, *Saham*, *Ghanam*, *Suhaila*, *Gul*, *Ghara*, etc. which are ascribed to him. In *Risail* he does write about the musical contest and the arrival of foreign musicians, real or fictitious, such as the two Abul Farrukhi instrumentalists, one of whom played on *Nay* and the other on *Barbat*, and the two *Goindas* (Singers) named Daud Jabalish and *Sha'aban* Qamarish who came from Bakharz and Farghana and he called upon the Indian artists, led by Kamal-uz-Zaman, the Amir-ut-Tuyar, to challenge and defeat them so that "the dove-pigeon of *Bala* (upper or western region) should know what type of (singing) birds are found in the spring of Hindustan" (*Ke Murgh Chun Buwad andar Bahar-i-Hindustan*). But he is completely silent about his eclipsing and outshining the musical wizard of the South, Gopal Naik, to earn the epithet of Nayak for himself. There is no reference to classical Indian Music or its composition and theorists like Bharata, but Amir Khusrau incidentally mentions Safiuddin Abdul Momin (692/1294), the famous author and the theorist of the systematic school of Eastern Arabs, and makes frequent mention of Barbad and Nikisa, the celebrated ministers of the Sassanid king, Khusrau Parwez (590-628).

(7) Sometimes when the musician himself began to sing, a whole world was drawn to, and became enlivened by the note of *Nawa*. (8) Sometimes when he brought out the *Bu Salik* note, the heart became like a silk-threaded pearl. (9) Sometimes he deludes the silkful artist and makes the area of *Nihawan* too narrow for the music. (10) Sometimes with the musical notes (Naghma) full of fresh modulations, he found his way into the land of *Bākharz*. (11) Sometimes when he hugs the Chang (harp) tightly to his bosom and holds it in his lap the Chang divulges the note of *Ushshāq* (lovers). (12) Sometimes like the grief-affected lover, torn by pangs of separation, the Ṇāi (lute) emitted its plaintive sounds in the way of *Iraq* note. (13) Sometimes when the player adjusted the adverse (*Mokhālif*) tone he became friendly although he sounded the *Mukhalif* note. (14) Sometimes with the full blow from the palate of the Ṇāi (lute or reedpipe) it gave complete peace and happiness to *Farghāna*. (15) The *Tezi-i-Rāast* note came straight like an arrow and struck the heart of the lover who was fit to be killed. (15) The lance-wielder of Chang who resembled *Tohamtan* (*Rustam*) ran his *Rukhsh* (Rustam's horse) from *Zabul* like *Zaal* (Rustam's father). (16) When the melodious music sent forth its fine, soft and deepest tones (*Zir-o-Bam*), it crossed from *Zir* to *Hussaini*. (17) The concert (Zamzama) of *Sāzgāri* (a soft musical air made up by Iraq and Isfahān note) in Iraq style was in accord with the Persian *Āhang* (modulation) of Iraq. (18) Everybody wanted Sāzgāri and its musical notes reached *Sipāhān*. (19) Wisdom became a traveller from this manufactory (Kargah) and began to traverse rapidly the road towards *Bākharz*. (20) It returned to *Qaul* (a kind of song) sung by the Qawwals, sometimes in *Rāast* (full or straight) tone and sometime in *Neem Rāast* (half tone). (21) The *Zanga* note produced in deep and soft sound by the plectrum became sometimes out of place and emitted the shrill sound of *Nafir* (brazen trumpet). (22) In the face of such a choice *Mantiq-i-Tair* (voice of birds) in *Fakhtah* (dove) in the garden could sing according to *Osul* (principles).

There are more than the twelve traditional melodic notes in the above, and yet some of the important melodic modes mentioned by Amir Khusrau himself in *Ijāz-i-Khusravi*, such as Rehāvi, Muhayyar (wrongly called Mujir and identified with Indian Todi), Chakāwak, **Shād-i-Rawān Marwārid, Arab, Ajam,**

Sometimes on account of dryness, it becomes very hot, and it will not emit fresh sounds (melodic notes) unless it receives water.

The Indian and Iranian, like the ancient Hebrew music, being melodic and not harmonic, musical modes or melodies called variously as Maqāmat, Parda-i-Sarod, Nawâ-i-Wa Lahne, Rāg or Swara are its outstanding features. The seven primary notes of Iran which were perhaps similar to the seven original Jāfis of the Indian musicians became twelve after the time of Khusrâu Perwez (590-628). The Arabs had also their national melodies and modes and their twelve 'Naghmas' stood for notes and modes. But the airs of different countries have some distinctiveness of their own, being a reflex of moods and feelings, and character and emotions of the people to which they belong, and they are sometime named after the places and provinces of their origin. The twelve Maqāms Parda-Rag had become a fixed number of notes and modes in the 13th and the 14th centuries. The famous Persian poet, Badr Chach of the Tughlaq period, who came just a little after Amir Khusrau, says that "the basic modes are none except ten and two" (Asl Parda Bajuz Dah-o-Do-neest) and he fixes each one of them to particular parts of the day and night. Amir Khusrau also speaks of four Usuls, twelve Pardas, six Abraishams. The list given by these two poets and those found in works of lexicons and musical works do not wholly tally. Let us see what Amir Khusrau says in *Qirān-us-Sāadain* about the "description of the musical modes (Parda) and skilled knowers thereof who with every one of their hands brings forth hundreds (immense variety) of notes".

(1) The players on stringed instrument (Rud Zanān) are all measurers of fine delicate sounds and practise diligently on the silken chords. (2) They make the silken chords their life-veins and bring out life from the veins at the harp. (3) This one (Chang) displays double colour, like the cock (produces different kinds of notes). Certainly it is cock (*Murgh*) but it is in the grip of the hawk (player). (4) When that one (Player) emits the note of *Nawa* he becomes *Kunjishk* (sparrow), but he brings down the flying bird from the *Hawa* (air). (5) When he wanted to produce certain melodious notes he swung from the left (*chap*) to the right (*rast*) path. (6) Sometimes when the instrumentalist plays the *Hussaini* note on his strings he displays that in a most beautiful (*Ḥasan*) manner.

(sweet voice) enchanting snake which becomes coquettish in the hands of others. (5) What a strange black thing has come out from Iraq! It has come but is heart-burnt on account of the pangs of separation. (6) It has no mouth till you make a speech, and it has no speech till you put a note in its mouth. (7) It lays down its head before you (submits) if you breathe or blow into it. It will not blow till you cut out its head. (8) When it feels disposed to produce sweet sounds, it banishes whatever is in its head (9) The musician has control over its breath and works magic. He splits its head and again joins it. (10) Sometimes its speech (note) becomes all tongue and for producing sound its mouth becomes brimful of sweet sounds (*Nawā*). (11) It opens its lips like an orator, but its tongue is in the control of the lips of others (12) With every touch of hand it produces fresh melodies; under every finger there are hundreds of skills. (13) It is like a wooden house with pillars in the middle; but for the passage of the wind inside, it is very niggardly. (14) Through the breath which the musician blows continuously, there is an incessant flow of wind in its head.

We may now consider the descriptive verses relating to *Daff* (small round tambourine), an instrument of vibrating membrane with metal plates. (1) The orbit of *Daff* has an enclosure made of wood and its area or plate is beaten by five fingers. (2) Through its circular motion the Venus comes out (of its orbit) to sing and its dome descends from the celestial globe. (3) It has ringing bells fastened here and there to its waist. Like the girdle of the firmament it displays so many grelots (*Jalājil*). (4) It is seated on the palm of the hand, sometimes being on the hand, and sometimes being under it. (5) It has four tongues, two being in the mouth. It is eloquent in speech, but there is duality in its tongue. (6) All the excellent speech that it makes before its beloved is made from behind the curtain and through the skin (privately and secretly). (7) Apparently it has got two faces (sides). But when it is beaten in the face the artist makes it one face. (8) It has a face both on this side and that, and it sings both from this and that side. (9) The palm of the minstrel, according to the fine principles of the modes and tones brings forth sometimes heavy (*Saqil*) sound and sometimes light (*Khafif*) sound. (10) Sometimes moisture (sweating or perspiring) makes its skin tremble, and sometimes the flame of the sun becomes its friend. (11)

First we get the description of stringed instruments called *Chang* (harp) "whose one leg is devoid of hair, while the hair of the other leg reaches the ground". (2) with its head cast down and also raised above the *Chang* it has its hair skilfully interwoven. (3) It is like a crescent with its head bent down. Thirty nights and thirty days are mixed up with it. (4) It is a half arch and has four bow strings (*Zeh*). The stroke of the plectrum breaks up the hearts. (5) It is a boat of parchment with the river flowing over it, but the parchment does not become wet with the water. (6) Many notes are given birth to by the plectrum but its belly is empty upto its bottom. (7) The cover is of silk and the chord is of hair. Sometimes it has silken strings and sometimes luminous hair.

This is followed by the description of another stringed or bowed instrument, the flat-chested *Rabāb* (Rebec or Lyre). (1) The soothing sound of the bowl-shaped *Rabāb* (Rebec) robs people of their heart and restores life in them. (2) The cup is empty, but it has many gifts or blessings. Many (beggerly) hands are stretched towards its bowl-like palm. (3) They feel its pulse, but it is not ill. They put a screen over it, but it is not veiled. (4) When the sharp plectrum is trimmed, it is the throat and not the sound which is scratched. (5) The strings (rud) from the ruling lines ('Mister') on the surface of its leaf, although melodic sounds ('Sarod') cannot be inscribed or written down. (6) When it draws its sound of high pitch the note of the instrument reaches the Venus. (7) And when it emits its plaintive note which is devoid of loud noise it cannot hear its own voice, although it has its ears. (8) Ass-like it is tied with the chain which is golden; what a wonder that the ass is dumb while the chord is speaking. (9) The ass usually runs away when it is pricked but this ass is sticking to its place although the lancet is running over it. (10) The silken-clad child (Rabāb) has four wires or strings, and out of these come two-six (twelve) notes (Pardas).

We next get the description of the wind instrument *Nāi* (reed pipe, flute or oboe). (1) Every moment when it is blown, the cheek of the minstrel is puffed up with air like a bag or purse. (2) Although the mouth of the *Nāi* is closed, it is very talkative. Don't say it is *Nāi* but call it a snake because of its charm or incantation. (3) The black cobra has made its way through holes. You see one snake, but the holes are ten. (4) It is a sugar-eating

Tumbuk player became its interpreter. (21) The *Ajab-i-rud*[20] (?) showed its teeth from behind the curtain. Its lips were like a *Nāi* and its mouth was all smile. (22) The Indian melodic note (Lahn-i-Hindwi) had caused the Venus to lose its senses and Mars had forgotten its language (of machination). (23) The miracle-working fairy-faced Indian minstrel opened the door of frenzy through her musical melody. (24) While she held the *Tal* (cymbal) in her hand like a cup she became intoxicated by her own singing and not through the use of wine. (25) with pleasant tunes emitting from their lips the beautiful ones moved round and looked up in quick succession, beating their legs on the ground. (26) Their fine ensnaring Deogiri apparel looked like a shadow which captured the figures (bodies) of the fairies. (27) Some were attired in silken garments and their faces were like fine painted silk. It seemed that the silk had entered the body like hair. (28) Merrily engaged in dancing, the beautiful ones were playing with the breeze. It seemed as if they were walking on the sounds.

What the author says about music and dancing that was in vogue in his time in the above poetical piece is well worth our attention. Amir Khusrau was certainly interested in, and was appreciative of, the indigenous art and culture but we have yet to discover the evidence in his own and other contemporary writings to justify the credit generally given to him for making a critical and constructive study of the Indian music, synthesising that with the Arabo-Persian system with which he was thoroughly familiar, and inventing and evolving new styles of singing and new instruments. There are meaningful and graphic descriptions of lovely cup-bearers, dancers, musical instruments, tones, notes, melodies in eight pages of Qirān-us-Sāadain. We may consider some of the verses. The experts who know the forms, structure, functions of music and also the airs or melodic modulations will perhaps be able to understand and assess the value of Amir Khusrau's achievements and contribution better if what has been locked up so far in Persian is placed before them in an English garb.[21]

20. Sometimes it means an instrument and some times musical sounds emitted by such instruments as Chang and Rabāb.

21. It would be interesting to compare the description given by a younger contemporary in Basatin-ul-Uns. (See my paper in J.B.R.S., Patna, 1960.

were brought down. (4) As on account of the sound produced by it the harp (*Chang*) is the king of all musical instruments, it fastened its chord (*Tār*) with hair at ten places. (5) In one of its legs the hair came down to the earth, while the other leg was without hair like the palm of the hand (6) The vein and hair were tied on both sides in such a way that you might say that the hair had grown out of its veins. (7) The whole of *Nāi* (flute) had become throat and windpipe. It was like an organ of Rum made by an Ethiopian. (8) It was black and yellow and a peculiar type of bough. A greenish thing had come out of an ebony wood. (9) The Tambourine (*Daff*) was like a strong fort because of its wall. The enclosure was of wood and its court-yard was made of parchments. (10) It was ever revolving between its handles. It was a peculiarly moving castle. (11) When the Daff player started playing on the instrument he effaced its surface with the stroke of his nails. (12) Look at the clear difference between the harp (Chang) and the barbaton (*Barbat*). One was swollen-headed and the other was meek and submissive. (13) When the string (*Rud*) of the Barbat sent out the sound, the duck-shaped flask was constantly weeping out blood (sounding plaintive notes). (14) The pandora (*Tumbur*) was heavy-headed (self-conceited) owing to its pumpkin. It was wallowing but was neither drunk nor intoxicated. (15) After the fashion of the Hindus a variety of melodic hymns (Mazāmir), assuming several forms, enraptured the souls through the lowest and the highest strings (Bam-o-Zir). (16) The veins (strings) of *Alāwan*[18] (?) were extended beyond its body. The gourd (Kadu) was at the back and the veins were without blood. (17) Mark the novelty that it had placed the gourd on itself but let out blood from the eyes of the audience. (18) There was another brass instrument named *Tāl* (a sort of cymbal with bell metal) handled by the fingers by fairy-faced damsels of ravishing charms. (19) The two brazen bell metals or heroes (*Ruin Tan*) facing each other on the fighting ground looked like the two sides of the scale in Persian Daff, beaten with strokes. (20) When the Hindi '*Tumbuk*'[19] emitted its plaintive notes the

18. The excess wire-strings kept within the instrument.

19. Abdur Razzāq, the Persian envoy of Shah Rukh in the court of Vijayanagar has mentioned some instruments in his book, *Matla-us-Sādain* and these include, Kamāncha, Nāi, Damdama, Kus, Naqqāra, and also *Tumbuk*. The last appears to have been a type of Persian Tambourine with a shell of body in the shape of oval cup.

ones (swift-paced ones) amongst them (ran fast) learnt it quickly. (5) To some extent they acquired it and thus they added something to their skill (6) Although coming within the boundary of India they stayed here for more than 30 or 40 years. (7) Yet they had not the capacity to warm themselves up (grapple with the principles thoroughly) by a single soft. sound (note) on account of their cool temperament. (8) The 9th argument is that the arrow-like swift soft sound strikes the heart of a wild antelope in such a way that it does not realise it. (10) As soon as the refreshing sound enters into the ears of the antelope, it is affected by it without being conscious of it. When it cannot overcome its unconsciousness, the arrow strikes it. (11) It becomes transfixed without the use of bow and arrow and that very moment it gives up its life on account of the musical stroke.

It is unfortunate that Amir Khusrau, despite his great appreciation of Indian Music, gives us little positive information about its nature and elements. Referring to the festivities held in the court of the young voluptuous grandson and successor of Balban, Sultan Qaiqobād, the historian Barani tells us that skilful musicians who were experts in the Persian and the Indian music (Pārsi Wa Hindavi) set their songs so as to be in accord with every melodic note (Parda) to provide tunes and sang the praises of the Sultan. Amir Khusrau refers to the 'Usul' or principles and to the 12 'Pardas' and 6 'Abraishams' (tones or notes or melody or bass string of a musical instrument), but he does not explain what he meant by the 'usul' and 'Furu' nor does he enumerate the 12 Pardas or their offshoots, and says nothing about their nature. But, we get much in his writings about the Arabo-Persian notes and instruments. In fact, we can have an idea of the nature, shape and structure of the musical instruments and the names of the prevalent Persian 'Pardas' or Maqāmāts' some of which may be taken to be analogous to the Indian Ragas, from his writings.

We may begin with some of the verses which occur in the Ashiqa (1) By every melodic note a man may die and may come back to life, for each one of them is capable of killing and restoring life. (2) Rhythmic melody sent forth its voice to the Venus as the *Nawā* (sound or musical note) is such as gives and takes away life. (3) The bass string of the instrument (Abraisham) dispersed *Nawā* (note) in the '*Hawā*' (air) and the birds flying in the air

meaningless and rotten. (9) In this sense the musician who requires sound and listening (Sama or audience) is in need of the verse-maker. (10) Look at the dancer who makes sound but has no speech, and therefore, he is dependent for his speech (singing) on somebody else. (11) Consider poetry to be like a bride and music as her ornaments. There is no blemish if the beautiful bride is without ornaments. (12) I would consider him as a real man who knows (appreciates) what is worthy and valuable and if he does not know this he should ask me about it. If he does not do that he is a donkey.'

Amir Khusrau's claim of proficiency and perfections in both poetry and music may not be questioned. That he wrote at least two other volumes of poetry afterwards gives us an idea[16] of the time, when he penned the above lines. Did he write a book on music and was it lost? Certainly he did not consider music as a 'Malāhi' or the forbidden pleasure as was laid down by the Islamic purists. He was a Sufi and a devoted disciple of Hazrat Nizāmuddin[17] Aulia, who was well known for his fondness for music. Amir Khusrau had very high notions about the attainments of the Indians, including their incomparable skill in music. Among the many points of superiority, enumerated by him in his Masnawi, Nuh Sipahr, which the Indians enjoyed over the people of rest of the world, one was music. He writes (1) The 8th argument is that our sweet melodies are like the fire which burns the hearts and the souls (mind) (2) Nothing in this world known to us is similar to this (music) and this is not hidden from anybody that there is no such thing in the whole world. (3) Many musicians came from every direction and they also brought with them their excellent styles. (4) All of them took up this fine art and the intelligent

16. Of his 5 Diwans, the first three Tuhfat-us-Sighar, Wast-ul-Hayat, Ghurrat-ul-Kamāl were compiled in or about 671, 683, and 693 respectively, while the remaining two, Baqiya Naqiya and Nihāyat-ul-Kamāl are dated in about 716 and 724.

17. Of course Music linked with wine and women was condemned by the orthodox Muslims as Malāhi or the forbidden triple pleasure. But the Chisti, Suhrawardi and Firdausi Sufis favoured '*Sama*' with conditions laid down about time, place, persons, contents and instruments. What to speak of *Mazdmir* (wood-wind instruments) the legality of even the *Dastak* (clapping of hands) was questioned in certain circles. See the quotation from Amir Khusrau's *Malfuz, Afzal-ul-Fawai*, given by Dr. Mirza in his book, p. 226.

sciences including music. Poetry and Music went hand in hand and both evoked emotions. People set poetry to music so as to produce the charming melodic notes and tones.[14] There are many Ghazals in *Qirān-us-Sāadain* and *Ashiqa*, which, according to the author's own statement, were given to minstrels who tuned their verses and sang. Let us see what he says about the two. He had reasons to give preference to poetry above music as we find in the following verses, incorporated in his Khulliāt. (1) The Musician said—'Oh Khusrau, the store-house of poetry'. The science of music is better than the poetic art. (2) For the subtleties of this science are too difficult to be brought within the ken of pen, whereas it is not difficult to put that (poetry) down on paper and in books. (3) I replied that I claim perfections in both, and have weighed and tested them in the scale as is due to them. (4) I have already written three volumes of poetry, and if you believe me, I can write three books on music, too. (5) I may tell you the difference between the two in a way which is reasonable and correct, and this can be justly appreciated by one who has expert acquaintance with both. (6) You should take it that poetry is complete in itself, and does not depend on listening (Samā) or on the voices of the minstrels. (7) If anyone can recite verses with fine soft sounds and have the deepest tone (Zir-o-Bam) it is permissible, for there would be no loss or deficiency either in the meaning or in words. (8) On the other hand, much as the singer may make use of "Haun Haun"[15] and "Hān Hān," as there is no poetic sense or eloquence in it, the whole of that would be

14. "Guft Hami Zahra-i-Barbat Zanash. In Ghazal-i-Tar Ze Zebān-i-Man Ash" (The venus like Barbat player recited the beautiful Ghazal composed by me)". In Ghazal Az Mutrib-i-Mauzun Osul—Yafta Dar Gosh-i-Humāyun Qabul etc.

15. In the preface of Ghurratul Kamāl we get this, among other things. "In order to display the beauty of the bride of poetry, twelve screens (Parda or Musical notes) have been stretched along (extracted from) the fine and thin silken chords fastened to the pegs of the Rabāb. If no trace of poetry is found in the woven structure of the silken chords of the Chang, no one will take it to be complete or perfect, as there will be nothing worth except a simple sound and modulation. How fine is the utility of poetry that the science of silken chord (Music), despite its fineness (intricies) is indescribable by pen, and with out being supplemented by it, it remains a mere melodic note (Lahn). Every song which is not adorned with meaning end significance by poetry is absurd and nothing but Hāan and Hāan, Hun and Hun.

sweet-voiced ones the pen of my master will help me to complete it. It would be quite appropriate if I wrote about all the attributes of (the people of) this region, and it would not be my fault if I display on paper the chief festivities through the ink."

But in his two other Masnawis, *Ishqia* (love episodes of Khizr Khan and Deval Devi) and *Qirān-us-Sāadain* (meeting of the propitious stars) all that we get is the Arabo-Persian descriptive terminology for musical instruments, modes and notes. The Sāz or Ālāt (instruments)[11] mentioned by him are Chang, Daff, Rabāb, Nāl, Tambur, Barbat, Rud, Ud, Tabāl, Tāsa, Nafir, Duhal, Karna, Shahnā,i etc. and the terms 'saut' (sund or verses set to music), 'Lahn' (modal melodies), 'Naghma' (melodic modes) 'Parda' (airs or tones) which he frequently makes use of give us an idea of the foreign culture-sources with which he was saturated. The Hindi term Tāl loses its meaning of time-measurement and becomes, in Amir Khusrau's Āshiqa, a Persian word meaning an instrument[12] which was a sort of cymbal with bell metals and played with a stick. What attracts us more in Ashiqa are a few Indian instruments and artists, but this also does not help us much. As regards the story of Amir Khusrau getting the coveted epithet of Nāyak after he outshone the celebrated Southern musical Wizard, Gopal Nāyak,[13] in a poetic competition held for a number of days in the court of Alauddin Khalji, there is no reliable record to support it. He writes in the Risā,il about musical contests between foreign (of Farghāna, Bākharz and Khorāsān) and Indian artists and hints at the superiority of the latter over the former, but he fights shy of all personal references in this connection.

Amir Khusrau was justly famous for his poetic talents and effusions. He was a man of versatile genius, aesthetic tastes, and many-sided activities. He was undoubtedly well-versed in liberal

11. Some more have been mentioned by Amir Khusrau in the Risā,il, but many of them fell into disuse. See Wahid Mirza's book p. 228, footnote. Hasan Nizami, the author of *Tāj-ul-Maāsir*, and the contemporary poets, Hasan Sijzi and Siraji Khorasani do not go beyond the usual list of the Arabo-Persian instruments nor do Mutahhar Karvi and Ikhtisān of the Tughlaq period help us much in this connection.

12. Digar Sāz-i-Beranjin Nāme-i-Āan Tāl, Bar-Anangushte Pari Ruyān-i. Qattāl, p. 156.

13. Vide two articles on Gopal Nayak in J.I.M.A., Madras.

Khayāl Qaul,[8] Qalbāna, Naqsh, Nigār, Sanam, Basit, Sāzgari, Tarāna, Ghanam, Zilaf, Gul, Ghārā, Aiman Suhaila, Sarparda, Mujir, Farodast etc., which late writers, especially Faqirullah, the author of *Rag Darpan*, attributed to him. Instead of referring even to a single ancient Indian theorist, his principles, practices, ideals and abiding legacies he makes mention of Bārbad and Nikisā, the celebrated court ministrels and composers of the Sāssanid King of Persia, Khusrau Parwez (590-628 A.D.), and there is also a casual reference in the Risā,il[9] to Safiuddin Abdul Momin (D. 692=1294), the famous theorist of the systematic school of Eastern Arabs. Abdul Momin's treatises, *Risālat-i-Sharafia* and *Kitāb-ul-Adwār* have served as their principal, authorities by the subsequent musicians.

Amir Khusrau's long discourse in *Risā,il-i-Ijāz-Khusravi* entitled *Inshiāb-i-Usul-o-Furu–i–Mausiqi*" (Ramifications of the musical modes or the roots or the fundamentals of the art of Music and their derivatives), has of course something about men, methods and things essentially Indian, as we shall see hereafter, and in his Masnawi, named *Nuh Sipihr*[10] (Nine spheres) he pours forth his eulogium on Indian music which he considered to be superior to that of the rest of the world In his fifth Diwān, *Nihāyat-ul-Kalām*, while eulogizing the Deogiri music, he writes "The other thing is the sweet song of *Sarod* for every stroke of the bow or the plectrum emits the pleasing, plaintive notes like those of the harp of the Venus. There is no wonder if by their music a dead man is brought back to life, for the musical expression in the heart of every melodic notes infuses new life. The songs emitted by the Arghanun (organ) come to the ears as if they are songs of separation. This (the song) resembles the melodic notes of the nightingale, while that (sound of organ) is like the (gurgling) noise produced by the throats of cups and goblets (Bat-o-Khād). If I propose to draw the picture of the

8. O. C. Gangoli in his book, *Ragas and Raganis* has ascribed many things to Amir Khusrau on the basis of Shibli's statement Usher-ul-Azam in which Raag Darpan has been quoted.

9. His father Abdul Momin bin Safiuddin (12th century) was also a great Arabian musical theorist.

10. Edited and published by Dr. Wahid Mirza. The Mirza's doctoral thesis entitled *Amir Khusrau, His life and works* gives the traditional view based on Rag Darpan.

also the musical scales increased at the hands of the musicians. The seven sounds or notes of the Saptak originating in the Vedic accents and called the Shudh were augmented with five Vikrat Svaras giving in all 12 Notes. There were also many semi-tones called Murchhanas[5] which were distributed over the various Ragas and were made use of as what is done at the present time with the Thāts, the source of the Rāgas. Then there was the relative position of the series of musical notes and the practice of combining sounds in different pitches, high and low, and sliding from notes to notes. We may also refer in passing to the four principal systems or Matas of music which Mirza Khan, the 17th Century author of *Tuhfat-ul-Hind*,[6] mentions, probably, on the authority of Somnāth who described them in his treatise, *Rāg Vivodha* or the Doctrines of the Musical Modes.

It is for the experts and the learned to say something about the nature, extent and prevalence of all these multifarious developments at the time of Amir Khusrau. We have to ransack his own writings to justify the assumptions about his awareness of the distinctive features of the classical system of Indian music and about his contributions to the composite growth of the Indian culture. Doubtlessly he gives ample proofs of his knowledge of, and infatuation for, the Arabo-Persian system of music, but he is completely silent about his own alleged innovations or assimilative efforts. He makes no mention of Sih-tār[7] (Sitār or the type of guitar with three strings) or Tabla (small tambourine) nor of the Modes and Airs of a composite character such as

5. See Popley's Glossary of Musical Words and Phrases.

6. Cap. C. R. Day: *Music and Musical Instruments*, p. 14. These were of Isvara of Bharata; of Hanuman or Pawan; of Callanath. By the way, he is not fair in his remarks about the responsibility of the Muslims for the deterioration and decay of "music like other arts." K. T. Shah would, however, have us believe that "the one art that the muslims did not destroy was music". (*The Splendour That Was Ind*).

7. On the other hand Nizāmi Ganjawi, the great Persian poet who died in 600 A.D., i.e., about a century and a quarter before his own death in (725) has made frequent use of this three stringed instrument which he calls Seh-ta or Se-ta or Sitar "Se-tā-i-Bārbad Āwāz Midād- Samā-i-Arghanu rā Sāaz Midād" (The Sitar of Bārbad sent out its melodic note. It kept itself in tune or harmony with the Arghanun or organ). "Nikisā Chun Ze Shah Ātash Barangekht- Setā-i-Bārbad Ābe Baro Rekht". Nikisā Chun Zad. In Taiyyār Bar Chang-Setā-i-Bārbad Bardāsht Āhang".

Indian music. Music was regarded by the ancient Hindus as sacred and of divine origin, religious and devotional rather than secular, profane and professional and a mere source of enjoyment which was the case with that of the Muslims and others. Public concert was scarce as the music of India has been essentially individualistic—a solo work. It has existed either as the devotional music of the temple or as music of the aristocratic circles and folk songs. The time-honoured legacy still persists, and we have many relics of the former times in the present system of Indian music, both vocal and instrumental. Sacred verses are still set to music and sung in cadence with beats of hands on cymbals or with plectrums or finger-strokes on other bowed and stringed instruments in temples or on sacred and ceremonial occasions, and in social festivities, functions and performances. One can still get echoes of the old grama, Murchana, Jāti system which evolved out into the Sargam (gamut) Saptak (the scale of 7 Notes), Ragas (melodic modes) Svara or Sur (Tones and Notes) with Tāl (beats and time-measurement), Dhun (tunes), Alāp (slow prelude to singing), Lay (symphonic or rhythmic modulations). Modifications and developments came with the march of time as a result of free and frank initiative enjoyed by the artists in their intellectual progress for melodic improvisations. There was no bar to the creation of new Ragas or melodic modes. The 'Jāti Gāen' of the ancient theorist and composer,[4] Bharat, was replaced by the Ragas of the times of Mātanga, Sārangdhar, Somnāth etc. The 18 Jātis or fundamental harmonies receded into the background and the original 6 Ragas, each with 5 or 6 Ragnis or Bharias, and 48 Putrs or Putris came in. These melodies were composed, fixed and classified according to particular seasons of the year and different periods of the day and night. Not only the melodic notes or Ragas which are a basic feature and an out-standing contribution of Indian music, but

4. The earliest detailed exposition of Indian Musical Theory is found in a Treatise called Natya Shastra, said to have been composed by the Sage Bharat. The date of the book is usually accepted as the early part of the 6th century. It contains a detailed exposition of svaras, Srutis, Grama, Murchana, Jatis, (*Popley's Music of India*, p. 12) Sarandhar the author of *Sangita Ratnakar*, lived in the former half of the 13th century (1210-1247). Matanga flourished in the 5th century A.D. and Somanath's work is dated 1609 A.D.

contemporary sources about the contributions of the early Muslims who are credited by many with having taken a liking for, adopting, patronising and popularising Indian Music. This should especially be the case with the 13th century Turkish noble and savant, Amir Khusrau, who being the son of an Indian mother, was so very eulogistic of men and things Indian and who spoke of himself as the "Parrot of Hind". He was not only "one of[3] the most prolific poets that the world has ever produced" but has also been regarded as the most noted musicologist of the court of Alauddin Khalji, and his immediate predecessors and successors and as one of the earliest and the greatest exponents of a common and mixed culture. A good deal of tradition has gathered round about his musicianship, both on the theoretical and practical sides. Are we justified in accepting at its face value all that the traditional account tells us about his innovations, modifications and contributions?

Let us realise the exact position and assess the extent and value of his achievements in respect of melodic and rhythmic notes, forms and instrumentation in the light of what we find in his own writings, both prose and poetical. To understand better the claims that have been put forward on his behalf for giving an Arabo-Persian orientation to the indigenous Indian system and helping the establishment of what has been called chief features, nature and elements of the classical system of Indo-Islamic music, it is worth-while to consider very briefly, the chief features, nature and elements of the classical system of India which Amir Khusrau is supposed to have influenced to some extent.

Few nations of the world can claim to have such hoary and continuous traditions about the taste for, and contribution to, the science of sweet sounds and the skilled knowledge of, and performance on, musical instruments, invented to enhance the vocal charms, as the Indian. The well-preserved traditions about the Vedic *slokas* chanted in sweet, sonorous, plaintive but dignified voices by the ancient Indians to the accompaniment of the sacred *Vina* which sent forth streams of rhapsodies tell us not only of the antiquity but also of the source and nature of early

3. Elliot and Dowson *History of India as told by its own Historians*, Vol. III.

Amir Khusrau and Music

Indian music has a brilliant history of its own, and is said to have had a continuous development since the Vedic times. But there have been many phases of this development, and Indian music seems to have had undergone many changes before reaching its present stage. What was at first one and the same developed into apparently two separate schools or systems of music known by the names of the Hindustani or Northern school and Karnataki or Southern school. Some say that the ancient or Sanskrit musical heritage has been better preserved in the Southern than in the Northern musical system, because the South was comparatively more immune from the exotic, that is, the Arabo-Persian system, which the Muslims brought with them to India. This is disputed by others and Mr. Alain Danielou goes to the length of questioning the eminence of the foreign culture and denying altogether the Persian influence on Northern Indian Music,[1] "The oft-repeated assumption that Northern music evolved under Persian influence is obviously meaningless for one can vainly search in Persia and the whole of the middle east for anything which could justify the possibility". Perhaps all will not agree with this bold assertion for H. G. Farmer has shown in his books[2] and articles how old and developed Arabo-Persian music was at the time when the foreign and indigenous cultures came into contact with each other. Cultural interchange is usually not one-way process, and it is futile to deny the force of reciprocal influences.

But we have to get down to concreate facts in dispute on the basis of first-hand, original and contemporary or near-

1. Journal of the Indian Music Academy Madras, Vol. XIX, p. 168.
2. Historical facts for the Arabian Musical Instrument, Music and Musical Instruments of the Arabs: the old Persian Musical modes J.R.A.S. 1925. History of Arabian Music; Studies in Oriental Musical Instruments. Papers published in J.R.A.S. London.

12. See Quraishi A.S.D., p. 59 for the office and its functions.

13. See Elliot Vol. II for the traditional account of this reputed Saint-Warrior whose tomb was visited by the Tuglaq Sultans and by Haji Ilyas of Bengal and is still an object of veneration and visitation by both Hindus and Muslims. The 14th century Sufi Saint of Bihar, H. Sharfuddin Yahya Maneri refers in his Malfuz to the myth that had gathered about him.

14. He is not to be confused with his namesake who was sent by Malik Kafur to blind Khizir Khan at Gwaliar about half a century later.

15. Kilokhari (Hisar-i-Nau) was situated at a distance of about 3 miles in the north east of old Delhi on the western bank of Jamuna. Qaiqubad who ascended the throne in 686 had built a place there. The site had existed before and was not founded by Qaiqubad as the author of *Asar-us-Sanadid* would have us believe.

16. See the writer's paper already referred to under 9.

17. Ghayasuddin Ahmad, Yaminuddin Mubarak, Nuruddin Taiyyab, Vol. IV.

18. All these except one or two have been noticed and explained by Quraishi.

19. Those who regard Amir Khusrau as the first and the sure type of Indo-Muslim culture and have read about the glorification of everything Indian in Nuhsipahr for which Mubarak Khalji, the admirer of the renegade Hindu, Khusru Khan, gave him an elephant weight of silver will be struck by such vilification as "*Dau Zakhi Zada Hindu Zada*" and other expressions elsewhere. One can understand the use of opprobrious epithets of "*Malayeen-i-Kaffar*" and "*Hinduwan-i-Palid*" when dealing with "*Hinduwan Sarkash*" (II-57-75) and also the author's ire at petty Hindu officials like Deochand, accountants, scribes, *Khuta*, merchants, shopkeepers, money-changers etc. who were corrupt and dishonest. He could write about "*Dil-i-Ahni-i-Hinduwan-i-Zangar Zirffta*" (I-21) for it was so difficult to make the Hindus, specially of high castes, shake off their old beliefs and creeds. "One may not object very much to such statements as the reverence shown like that of the Brahmins towards the cows and of the washermen to the ass" and also "rubbing the head of humility towards a heap of cow-dung like the Hindus" (E-131). He could make the sword retort against the claim of the pen by saying "Oh you juggling Hindu, you have been playing in the hands of the Hindus, and like Brahmins you have become immersed in the Baid (vedas) and as the idol-worshipper at Benaras you have been rubbing ashes on your body etc." (V-36) But one could not expect the favourite follower of the highly liberal and Indiannized mystic Sufi, H. Nizamuddin Aulia, to describe the stone (Idol) worshipped by the Hindus as '*Wa Jibul Istinja*' (IV-138).

20. Paper referred to under 4.

21. For the perverted tastes of the time see the sixth section of the 5th Risala entitled humour "indecent even to the extent of vulgurity"

22. For his views about women see his letter addressed to his daughter, Mastura, in *Matla-ul-Anwar*. Maqala 22.

others finds his head covered with dust. The carpenter's chisel does not work without its head being rubbed (sharpened), and the teeth of the saw works only when many of the fine and sharp points are handled by more than two. The satiety of the sieve is the result of the magnanimity of the grinding stone or handmill. The discourses (*Maqamat*) can be had from the book of Hamadani and not from the silken (*Hariri*) cloth. For a wise man restrained hand (economical habit) is better than a long turban (pride). For eyes redrose are worse than thorn as nail is better for pupils than thaw or web in the eye. When they asked the pomegranate why it laughed behind the curtain, the counter question came why with every thing was chewed with teeth they chewed all its own teeth (II 191-201).

REFERENCES

1. Vide writers's paper entitled Historical value of the Sufic Hagiographical works of the Sultanate period (170 typed pages; still unpublished).

2. Life and works of Amir Khusrau.

3. Life and conditions of the people of Hindustan.

4. (a) Betel chewing among early Muslim of India, based mainly on Risail ul-Ijaz-(Printed).

(b) Amir Khusrau on Music in *Risail-i-Ijaz-i. Khusravi* (All India Oriental Conference, Aligarh).

(c) Fragmentary information of historical interest from *Risail-ul-Ijaz* (un-published).

(d) Life and conditions as depicted by Amir Khusrau in *Risail-ul-Ijaz*. (All India History Congress, Mysore).

5. O.P.L. Ms.

6. The extent of land tilled by peasants with 10 ploughs and pair of oxen. Sadiq Khan, quoted by Dr. Irfan Habib (Agrarian system of Mughal India), refers to ancient practice of assessing revenue by counting the number of ploughs which prevailed in some parts of the Deccan till the 17th century (p. 195-226-27).

7. *Risail-ul-Iajz* (p. 5-13).

8. Also called *Ariz-ul-Mamlik* who was responsible for the recruitment, payment, and inspection of troops as well as transport and commissiariat (Quraishi's *Administration of the Sultanate of Delhi* (p. 1085-137).

9. See the writer's paper entitled 'Matters of historical interest in *Risail-i-Ijaz-Khusravi* (Ranchi Session of All India History Congress).

10. Alauddin Khalji is credited with the introduction of a systematic branding of the horse brought by the troopers. The system called '*Dagh*' really dates back to the Umayyads (Quraishi).

11. See Amir Ali : *History of the Saracens*.

One who sees himselt does not see God (The self-seeing and self-centred person cannot realise God). One should be afraid of him who has no fear of God. The earth is so complaisant as to kiss the palm of the Kings' feet in the same way as that of the beggar. Water is a great bestower for it wets or moistens whatever it comes in contact with. Whosoever is fiery-tempered lives a life without water (lustre or dignity). The head which does not sustain the burden of anyone becomes itself a burden on other's shoulder. They wash all kinds of dirt with water, but the dirt of the water itself cannot be washed off. One can live without bread but not without water. Harsh words break an impudent eye (unkind, ungrateful person) as the almond is broken by stone. One who is content with little remains alive and the goer (*Rawinda*) is one who has a good pace. In thirst thousands of pearls are not worth a drop of water. The fool is mindful of his beard and the wise man of his virtues. Good and beneficent actions brighten the face (lead to good name and celebrity). The adornment of the manly person lies in his face being reddenced in battle, while the woman becomes red-faced by the use of rouge. A man without character has no weight (esteem or reputation). The hands of a manly person itches for giving and those of a miser for taking. The shoemaker chews the smeared leather, but earns his honest food. The closed fist is the lock to paradise and the open finger is the key to Gods' mercy. The fingers of artisan or labourer are the key to his livelihood, while the palm of the unskilled one is like a beggar's bowl. A man who does not fill the belly of others is no better than an animal which looks to its own belly. The yarn-maker (weaver) goes forward, while the rope-maker moves backward. The dark-coloured blacksmith is responsible for the redness (quality) of the iron. The needle does not its work stealthily like a spy, while the sword is a trumpeter of the news. The needle covers the person and the thread is pierced (fitted into) its eye. Generosity should be learnt from the fine sieve which gives out the things swifted and holds back bran or course chaff. The weighing scale is miserly for it bends down as soon as it receives some thing. The bride who hides herself behind the sieve (anything perforated) needs no prying. To cut the arm is better than the arms being cut down (for theft) i.e. the executioner is better than the thief. One who digs the foundation of the houses of

(the boy) with pure and clean robe so as to have the two divine blessing—grace of God and the healing ointment for the wound ; and for the satisfaction of carrying out the behests of Mohammad who has shown the way of discharging the Divine Command, both obligatory and optional, I, Your well wishing friend, Musa, who always speak of with praise and details about circumcision, bend my head of service down to the feet and facilitate you on the circumcision of your dear son which is so pleasing to us and annoying to our enemies. I also perform the custom of offering sweets like an orthodox, and hope that he (the boy) will take his bath quite safely after the expiry of one week, and he will shine forth like a full moon under the resplendent auspices of his fathers' affection, and will put on his body a particular kind of dress which has been prepared with his good luck. You would not, however, consider him immune from the effects of the evil eye, and Dirham and Dinar should be given away in charity to serve as a shield against the sun in the sky. Verse : "even one Dirham given in charity acts as a shield against the arrows of calamities". You should also entertain the parties of your sincere friends by providing them with fiery drinks and fragrant wood of aloes so that the evil thinking enemies may be reduced to ashes, and the scar of the wound may disappear completely. I hope that from this virtuous son, on account of the observance of traditional ceremony, further supererogatory acts like circumcision may come to happen. One can bring out from the vast book many such fragmentary information about socio-religious life of the people as can give us an insight into the working of the author's mind, his mode of thinking, his personality, temperament, outlook and prejudices. In some places Amir Khusrau speaks in the first person and relates incidents which happened to him. But for lack of space all these may be left over for a separate paper. We may conclude this paper with a few of the maxims and pithy sayings picked up only from one piece in Volume II (192-201). These may not be quite like those embodying the saturated wisdom of centuries, but they are a reflection of the author's assessments of men and things, and the result of his rich worldly experiences, his association with all sorts of people, and his knowledge of human nature in all its aspects and varieties.

There are references to the way the Muslims of different classes and both sexes were dressed. The garments of women consisted of "*Niqab* (veil) hanging over the face", a distinctive mark of married women of upper classes, '*Chadar*' (scarf) Qasab (woman's head gear) '*Maqna*' (a veil of muslin over the head and reaching to the ground) *Pae, Cha* (drawer or trouser) '*Pairahan*' (loose or close-fitted shirt) '*Sarawil*', 'Izar' *Pancha-i-Shalwar*' (kinds of trouser worn by both women and men) '*Resha-ha-i-Damni*' (women's skirt mounted with fringes) '*Barani*' (an outer garment to keep off ains, used by both), '*Sangchi-i-Zanan*' (Sina-posh or breast-belt), '*Gulband*' (neck cloth). They used cosmetics like *Ghaza* '*Gulguna*', Sandal etc. and many other perfumes, had '*Gulala* (locks of hair hanging loose) '*J'ad*,' ringlets, or curly locks) and they parted the hair just in the middle of the head "*Rahaha Az Farq-i-rast rast karda*" I-21 i.e. track made straight in the centre of the head).

There were great rejoicings when a child, male or female, was born. But the birth of a son was welcomed for prolonging the pedigree of the family. A father was felicitated on the birth of his son who was given a name and a family surname, Shamsuddin Abubakar. Khwaja Ainuddin, the maternal uncle of a child quite in keeping with his high position, showered much gifts and presents '(*Rekhatani*)' with open hands on his subordinates. We also get a reference of some economic importance. Bibi Zubaida, the mother of the child, had very little milk in her breast. Her sister, Khadija, suckled the child for some days, and then had to stop. But she offered 10 silver Tankas in lieu of her milk, and with this she purchased kharida's wet nurse so that the child should get sufficient milk and be at ease (II 151-152).

The following piece is of some importance as it tell us of the ceremonies observed both before and after a boy is circumcised, and also refers to a common belief that the sun in the sky casts an evil influence on some persons down on earth to avert which some money has to be given away in charity :—"For the purification of the orthodox which is both obligatory and optional and ablution or physical wash which lead to the performance of circumcision : the pleasure of executing the duty, optional or necessary, of investing

faults of one or the other. One Najibuddin had married the fiery-tempered termagant daughter of Khwaja Saleh. Both father and daughter had made his life a hell. He was so much annoyed with the asperity and harsh words of his father-in-law that he decided to break his relations with his daughter. She went over to her uncle, Khwaja Amid, who took her under his care, neglecting his responsibilities towards his other near relations. Ultimately Bibi Barka Khatun and the saintly grandmother of the deserted one with telling beads in her hands intervened and tried to restore the relations between the daughter and her husband, the son-in-law. They told Khwaja, the father-in-law, that his son-in-law was like his son, it was not advisable that he should allow the separation of the and wife from husband to continue, for his son would be left alone and helpless. They hoped that he would give up his apathy and opposition and try to join her with her husband as was the case with Fatimah and Ali, and that he would abstain from causing disturbance like Abu-Jehl, and would not enkindle the fire of enmity like Bu Lahab (II-159).

The following piece shows that though it was permissible for a man to have more than one wife, and for women to be married more than once, yet people like our author perhaps disfavoured such practices. '*Kabin*' or the documentary settlement of marriage portion served as a check on the pronouncement of the Islamic formula "I divorce thee three times". A man having two purses or bags (married two women) is taken by a woman as a coin of double (counterfeit) stamp, and a woman who has contracted two marriages is, in the view of a man, deserving of three divorces. Even if a man is of fiery temperament or of good cool nature, in either case he is under the control of the woman, who with her documentary weapon (*Kabin*) with many rings in the chain (conditions) can get an upper hand over him. '*Mahri*' (bridal money) and '*Mehr*' (affection) are of one form, if there be no '*Zer*'(vowel point 'I'= sabdual) and '*Zabar*' (vowel point, short' a; =domineering) between them, for a woman '*Mehr*' (affection) for the man is better and more valuable than '*Mehr*' (marriage portion); but for a man '*Mehr*' (Infatuation) for woman is worse than the '*Mahr*' (bridal wealth). A man who wants to marry a woman who is sought after (for wealth) will become subjected to the wishes of the woman in this own house (I-1st).

her away to his house. The writer was prepared to disclose the details which might expose him thoroughly (II-158-60). Bibi Nusrat had a son name Hussam. His tongue enabled him to gain a mastery over both speech and writing, and he was very brave and intrepid. He had also asked for the hands of these girls. But he had become notorious for killing people. The writer says that when he came to know of his attitude he kept quiet. Had Hussam been like a mirror even then he would not look at his face. The writer made an alternative suggestion. There was an attendant of that Malik-Ariz named Jauhar, who had virtually adopted him as his son. He was a writer by profession, was himself free, and was born of a free and noble person. In the first place he was a free-born (*Ahrari*) man and, secondly, for ten years he had been in the service of wise and learned scholars and had been responsible for their correspondence. The writer suggested that the veiled one should be united in wedlock with him so that the couple might enjoy a happy married life. (II- 165).

A certain person while offering his felicitations on the happy nuptial of his friend, showering his blessings like bridal gifts and presents (*Raikhtani-i-Urusi*) on the couple and wishing happy prosperous life for them struck a note of warning. "Now that this veiled one, the choice of your heart, is by your side, you may devote yourself heart and soul to her; but you should not dissipate your youth by indulging in lust according to past practices. You should keep your palate confined to this ripe fruit (confine yourself to your wife) so that you may have the good fortune of children who will bring good name and fame for you. But you should take care not to surrender yourself completely to her will so that all the blissful comforts might not turn into troubles and grief. If some body becomes tied to the palm of the hands of the woman like the Henna (becomes hen-pecked), there would be nothing surprising if his hands would become stained with blood. Whenever the man agreed to listen to the Sermon of the woman and submitted himself to her lectures, the wife would become the husband. If the wife was allowed to lord it over you, you will become the wife and the wife would become the lord"

Sometimes conjugal relations became strained for the

Even if the son gives 30 cities to her for the 30 months of the lying-in and the milking period, he cannot discharge her debts. If he balles at the feet of the mother, he will deserve the adage "Paradise is at the feet of the Mother". Amir Khusrau also writes about the foster-mother who makes the son linked up to her through her milk, and the real mother who is tied to him by blood, and says "when I look at the things closely, I find the milk to be the stronger bond or link than the blood" (IV-50).

We get further glimpses into state of women, marriage, birth, and education of the young children. Polygamy was the prevalent social custom and in disregard of the Islamic Law which makes equal treatment of all the wives imperative upon the husband, partiality was shown to the '*Bibi*' as compared with the 'Jariya', allowing the former to tyrannize on the latter. The prevalent code of matrimony was not very different from what we find today. The parents were approached, sometimes directly by the suitors, for the hands of their daughters. Bakhtiyar Amjad of Delhi contacted the father of the prospective bride and informed him all about his antecedents and his own suitability for the match. He was of high lineage, his grand-father having being a member of the royal family of Kirman, whose excessive generosity had left the family destitute. He was himself highly educated and had become well versed in theology, grammar, and literature by sitting at the feet of masters of Arabic and Persian (II-314).

When proposals were made it was for the father or the guardian to give consent to the marriage. Great care was taken in making the selection and the father had to consult the other members of the family. When the highly virtuous and chaste Saman and Arghawan Khatun, the foster sisters of Wajih Suri, and treated as his own daughters by the good and generous-hearted Khwaja Ariz attained their marriagable age, many suitors came forward from all sides. Besides beauty and virtues they were possessed of some wealth and property. But Shama Gulabi was determined to have one of them, preferably Saman, for his wife. He really coveted their gold and silver. The writer was of opinion that on no account the hidden rose-bud should be tied with the string of the marriage with Gulabi and he should never be allowed to take

(II-164) : and at another "Masuma, the queen-mother, may God safeguard and promote her purity, abstinence and good health is always engaged in her religious duties, devotional exercises, and fit and proper prayers (III-67). Amir Khusrau's Fatimah, Khadija, Aisha, Mastura, Zainab and Zahra were models of noble virtues, piety, chastity etc. (I-89) Saman Khatun and Arghawan Khatun, daughters of Bibi Nabat, were so continent, pure, chaste, and secluded that even the wind had not success within their veiled sanctuary (II-89). Though a connoisseur of the art of music, our author looked askance at ladies' indulgence in sensual songs "such and such a daughter has never listened to *Bang-i-Sarod* or melodious music" (II-65). He writes appreciatingly about "the daughter who keeps herself concealed even from the eyes of the mother and father (II-165); the women who is fully amenable to her husband's wishes, may her husband continue to be tied to her by affection and by *Kabin* or marriage contract" (II-164); the father-in-law who is very friendly and affectionate towards his son-in-law for the sake of the peace and happiness of the daughter (II-169). He condemns the sharp tongued wife (*Salita*) and he heaves a sigh of relief at the liberation of her husband from her by his death (II-160).

Our author wanted that women should occupy their proper place in society and recognize, along with their husbands, that they had their rights as well as duties and responsibilities. He insisted upon filial affection and for having special regards and respects for the mother and proper adjustment of relations between husband and wife for a happy household life." The mother gives her milk and brings up the child. The son who rolls at the feet of the mother is one of paradise, and if he shows any warmth (anger and annoyance) he is sure to go to hell. If the son causes any grief and affliction to the parents his face will be blackened. Amir Khusrau quotes the Quranic varses "I have issued a mandate that they should do good to the parents". I pray to God to be kind to and have mercy and graciousness on my parents who have brought me up since childhood". The son has to pay "special regards to the mother who carried on his load with extreme trouble and gave birth to him after an extreme pain". "Even a particle of the pain and trouble she has undergone in giving birth to her son is enough to weigh down the scale in his favour on the judgement Day".

Nayaka had become well known in that region for her refined taste and her nose had made her much too self-conscious.

But we may leave out such things. We have already dealt with Turmati Khatun[20] who because she was highly skilled in music, both vocal and instrumental, had been introduced by the author to the court of the king and had very soon been put in charge of all Persian and Indian Musicians. Another which deserves a passing notice has been named Shamsa Khatun, the beautiful ministrel whose presence in his Tazkir (admonition) assembly was not tolerated by *Malik-ul-Muzakkarin* (the king of Sermonisers), Khwaja Afzal. His sermons drew all sorts of persons, learned, pious, free, and well-born, and also secluded women of the palace (*Mahal*). There were also Indian women or female slaves (*Jawariya-i-Hindiya*). These had separate places allotted to them so that the body of foolish ignorant persons who would like to be equated and seated with the learned and scholarly should keep themselves away from these veiled ones (*Mokhaddarat*). All such persons were made to occupy a place from where they could not interfere with the ladies. Shamsa Khatun, the *Mutriba*, (ministrel) was seen in the midst of these ladies of the Haram, *Malik-ul-Muzzakkarin* gave a hint by uttering alternately the words '*Haza*' (Masculine) and '*Hazehi*' (feminine gender) with the result that she was made to leave the assembly (V-245).

In an age when the general standard of morality was far from satisfactory, and social life was disfigured by many vices,[21] as indicated in the Risail, especially by excessive indulgence in carnal pleasures and too much proneness towards the trinity of joy, wine, women, and music, Amir Khusrau, despite his tendency to laugh at others and also at himself looks like a grave mouth-piece of a puritan,[22] moralizing and emphasizing the need of the suppression of the vices mentioned. He was a strong advocate of seclusion and separation and of all the rights and privileges accorded by Islam to women. Normally respectable ladies did not come out, but they were free to attend, in their veils, the learned discourses of preachers. There is a lack of evidence about female education. At one place we are told "although the mother of your well wisher was unlearned she had in her memory many prayers: my mother was possessed of many virtues which she had cultivated for the sake of God"

he has been bred and brought up to be of a good character he is like a beautiful rose flower of paradise, though he is born of a hellish Hindu. If he is addressed as *Tuba Lak* (what a sweet and delicious fruit of the *Tube* tree of the Paradise) this will remind him of the *Lac* or gum of the Bar tree. Where there is a moon-faced youthful slave there is always a Khwaja ready to purchase him. One slave with pierced ears (obedient) is better than 100 of free run-away ones. Although a youthful Hindu slave is like a make-weight of the scale, yet he is a stone which is worth having for gold. But can a slave remember (be grateful to) his master when he becomes proud of his prosperity? As soon as such a slave becomes sure of his heel, he would break the heads of men into pieces. Every vein and fibre of a Hindu slave makes him turn back towards his sacred thread. As compared with an old freely-moving slave the newly purchased ones must be closely kept in their places. The ill-natured low-born slave can never be of good conduct. The Khwaja who is enamoured of his slave whose body is as fair and white and as silver but who is gambler should not feel disgusted with him if he spends his money lavishly on the game of dice (II-168-69).

Further on we are told of two types of female slaves, one held dear and kept for pleasure and enjoyment, and the other virtually serving as a maid-servant doing rough domestic works like the drawing of water and grinding the corn. Amir Khusrau points out the difference between them and the *Bibi* (wedded wife) who treated them harshly and kept them half-starved and under her watchful eyes (I-170).

There is a long array of characteristic names of women largely Turkish and Muslim and also some Indians. There are satirical references to some southern women such as '*Didi*' of Deogiri who had made her black face white by coming out from the flour mill to cast glamorous side-glances on people, and 'Uchhaldi', the *Nayaka* (the mistress of a brothel), the typical representative of the *Nayakas* of Hind. The women followers of old *Nayaka* always look youthful amidst men. Her ears were like water-drawing bucket hanging in well and her lips were like raised sides of a reservoir. On one side of her nose a pearl was suspended from the nostril while on the other the snot having frozen on account of cold breeze looked like a hanging pearl superior and better than, pearls. This

and stature for they are worth more than the price demanded. But the best of the Turks and plenty of them come from Yamak. They are very grave and sedate. The moon-faced Turkish youth with fine down on their cheeks are iron-bodied. The Chinese are cat-eyed and dog-faced with wrinkles on their foreheads. The Mongols are dog-tongued and have lips like those of the Tartars. The Tibetans are narrow-eyed and their noses are lost in their faces.

As regards the female slaves, some of Turkish extraction who had been brought from Cathay were of very fair complexion, and the brokers readily offered the price demanded when the slave dealers exposed the reflections of their faces and necks through the Chinese mirror. The Chinese slave girls who had been brought by a Khotani had such a musk-scented hair that it may be said that hundreds of Chinese musk pods had been used in their curls. Although Indian and Turkish slave girls are black and white complexioned respectively, yet the blackness which is free from defects is better than whiteness which is full of them. When put under the saddle the Turkish slave girl is different from the Indian mare who has greater fire (passion). I saw a Turkish slave girl in the house of a certain Turk of Gharra tribe who had two moles which were out of place. If they could remove one the other would have enhanced her beauty all the more. The Turkish slave girl is delicate limbed and deserves purchasing, while the Indian slave girl who is like an enkindled fire should be disposed off. The original place of the Turkish is Aas (a place near Qibchaq) but a Hindu slave girl is *Aas* (hope, dependence, and trust) personified. She is a combination of fire and water. If you issue an order to a Turkish slave girl she will flare up like fire but becomes cool like water afterwards. But an Indian slave girl is by nature soft and cool and ready to draw water and perform difficult tasks. This is not the case with the Turkish slave girl, who is all fire when her blood is up. Although the Turkish female slaves are by nature white complexioned, some of them had rubbed their red-coloured face at the feet of black-faced ones thinking that this might be conducive to their honour and happiness. Auctually they became disgraced or black faced (V-165-67).

About the "Hindu slave boy" Amir Khusrau writes : "As

groups. We get descriptive references to such people as were the chief arms of the Turkish bureaucracy and ran the machinery of the government. There are many fictitious names which may be ignored, but the official titles[18] of, and functions performed by such peoples as *Wazir*, *Diwan*, *Qazi*, *Mufti*, *Sadar Jahan*, *Vakil-i-Dar*, *Sipahsalar*, *Amir-i-Hajib*, *Amir-i-Barbak*, *Dabir-i-Khas*, *Nadim*, *Kitab Khan*, *Dadbak*, or *Amir-i-Dad*, *Malik Ariz*, *Mir-i-Bahr*, *Mir-i-Shikar*, *Akhur Bak*, *Mustaufi-ul-Mumalik*, *Mushrif-ul-Mumalik*, *Mutasarrif*, *Muqti Mohtasib*, *Shahna*, *Kotwal*, *Khuta*, *Nazir-i-Mumalik*, *Sar Silahdar*, *Sar Jandar*, *Amir-i-Sadda* etc., cannot but attract our notice. We come across industrial artisans, including many Muslims, such as textile workers and handloom weavers, oil pressers, leather workers, tailers, needle-workers, embroiderers, goldsmith, goldbeaters, makers of swords and bows and arrows, brass and metal workers, blacksmith, carpenters. There are letters about grain merchants, shopkeepers, money-changers, peasants, cultivators, agricultural labourers, menials like barbers, washerman. The professional workers mentioned are cooks, bakers, confectioners, butchers, fishermen, distiller, wood-cutters, painters. Ministrels of both sexes, snake charmers, jugglers, jesters, harlots, old wenches also find a place in the volume. This artisans are both highly skilful and unskilled, good and bad. Men of sueh a large and varied occupational groups earned their livelihood by means fair and also corrupt and deceitful, There are also interesting descriptions of slaves of both sexes, of various ages, and of different races and nationalities, foreign and indigenous, and possessing some special characteristics of their own.

A *Farman* with the royal seal (*Tughra*), dated A.H. 709 and addressed to the merchants of Cambay refers to commodities, fine and of high value, and especially slaves imported in sea vessels from Arab lands, Habsha, Bahrain, Barbar, Maghrib, and Syria. These Abyssinian and Ethiopian slaves (Barda-i-Habshi wa ghulaman-i-Zang) were tall-statured stout and strong, swift-footed and ebony-coloured and had curly and twisted hair on their heads. The large-eyed female slaves of Habsh were of agreeably saltish black colour "The Turks imported from Cathay are very good shots with their arrows and so is the case with the Turkish slaves brought from Bala (Khurasan). Their value cannot be measured by their size

and analyse the contents; take out matter which is or some evidential value by clearing the grain from the husk, and piece together the scanty and scattered information on the life and conditions, progress or deterioration in moral and material sense, of the people of the 13th century, we can get an idea of some aspects of the contemporary society and of the socio-economic, and socio-religious conditions and institutions, despite the colouring given to it by the imaginative mind of the writer.

Amir Khusrau, the foremost creative artist of the age and an idealist of high understanding was also a learned scholar and a man of varied interests, namely, Quranic and scholastic sciences, commentary, traditions, jurisprudence, philosophy, astronomy, poetry, music, etc. and he had studied these subjects from various points (vide passim).

There is much of interest even for a lexicographical researcher in the rhetorical writings of the *Risail*. The book shows in many places the powers of close and acute observation possessed by the versatile author. Though a man of aristocratic birth and position, and one of the greatest intellectuals of the time, he did not keep himself isolated from the main currents of social life. He considered himself a man of the people and moved among the people, high and low, good and bad. His heart was brimming with sympathy for the downtrodden, poor and oppressed people, agriculturists, artisans and labourers. He was conscious of the dignity of labour and has frequently eulogized those who earned their livelihood by honest labour and who provided amenities of life to others by the pearl-like sweat or their brow. His letters to his three sons, especially to the eldest, Ghiyasuddin Ahmed, throw sufficient light on such things, and his advice to his[17] sons about the choice of profession and about the observance of all obligatory duties are also not devoid of interest (IV-256-320). There is nothing marvellous or miraculous in the *Risailul-i-Ijaz*, and its author does not deal with superhuman beings but mostly with men of normal social life.

Those who figure frequently in the various volumes are a variety of people such as *Ulama, Mashaikh*, officials of government and men of various functional and occupational

behave like breeze so as to collect all the leaves of this species, wherever they had been lying scattered in the treasury of the writer's book, into a bunch of rose buds and place the same as a bouquet in my hands". "These meaningful matters (*Maniwi-yat*) were arranged in a way which is a speciality of this writer. During the course of my writings I had penned down things, simple and compound, prefaces and premises, short and long examples, and big and small epistles and letters of charming significance. These were compiled with extreme pain and labour, physical and mental. I have been able to set all these subjects of thought and care in their proper places so that there should not remain angularities to put strain on men of refined taste. At the end he writes "If in the garden of elegant writing, my sincere friends may find some fanciful pictures, they should take them to have come out unintentionally, and because the gardener while cultivating the golden jasmine and yellow roses could not help breaking the monotony by bringing in some red tulips also. If they see a wrong writing like an ant in a mixture of rose water and syrup (*jullab*) and find a mistaken point like the head of a fly fallen in a cup of honey they should not abstain from it in the manner of Imam Shafi, but follow the way of Noman (Imam Abu Hanifa, Imam-i-Azam) for the two feathers are an antidote to the poison of one feather" (V-169-70).

The book rhapsodically described (V-167) by its author as "annals of the age and of countless dates" (*Tarikh-i-Rozgar wa Tarikh-i-Beshumar*) has its limitations. It was composed to display the authors skill in providing fine and ornate specimens of epistolary compositions for the instructions of the young learners, and was not written or meant for social historians. From such literary works one cannot expect to get a full and accurate picture of contemporary life, especially when the author frankly admits, at times, that his compositions included some fanciful pictures and letters coined or invented by his mind. The case of the letter of Badr Hajib is an instance in point (IV-144-56-18). Some of his references to certain things of domestic life and manners appear to have been deliberately left incomplete and hidden in rhetorical flourishes. The dates and facts mentioned in some of the documents vary from those found in standard historical works. But if we leave aside the rhetorical parts, critically examine

came in 659=1261. Amir Khusrau has confused him with al-Mustakfi Billah who flourished[11] between A.H. 700 and 740.

A short extract, though undated, refers to an incident that happened in A.H. 651-652 in the reign of Nasiruddin Mahmud which is the earliest mentioned in the *Risail* and it also shows the author's self-imposed restraint and profuse use of literary artistry when dealing with some historical personalities who were subjects of controversy. Imaaduddin Rayhan, the Wakil-i-Dar[12] of Sultan Mahmud had temporarily ousted and eclipsed Balban before his own dismissal and removal to Bahraich where he was done to death in 653. The Indian born noble had excited the jealousy of all the members of the Turkish party including the historian, Minhaj Siraj. It also tells us about the wide-spread fame of the martyr-saint[13] of Bahraich of the Ghaznavid period, Masood Salar Ghazi, who had become more of a legendary figure rather than a historical personality in the 13th country. "The fragrance of the aloes-wood of his mausoleum at Bahraich had made the whole of Hidustan aromatic". Sumbul Bihari[14], the addressee, who was having very good and enjoyable time, along with his friends and companions near the mausoleum, was advised to continue his stay there and give up the idea of going to Kala Khari[15] (Kile Khari) of Delhi, because Rayhan, the rebel, had gained great ascendancy there and had become proud and arrogant. He was openly saying that Sumbul Bihari had turned against him and he would soon issue orders to destroy him, root and branch. The addressee was advised to make no move out of the sacred place he was occupying if he considered his position to be strong and unshakeable (II 55-56).

It is interesting to see what Amir Khusrau says about his own composition. He writes that "the authors whose works give them an eternal life are learned theologians, wise philosophers and poets (IV 8-9). But the speculative writing of poets, in prose or poetry are fanciful premises, unlike the rules and principles of science and philosphy which are based on reason, are real and unalterable. The thoughts (things shaped by the mind) of my humble self are ingenious reflections which are capable of being changed, corrected and refuted (V-169). Elsewhere (IV-22) he writes, "As I am the Solomon of the realm of the speech, I have made my thoughts (reflections)

their weapons like the mouth of the snakes and their proneness to infidelity made them dart their arrows towards the chandelier of *Cibla* ; but fortune ultimately favoured the troops of Nasirul Mulk, as the enemies were burnt like moths in the fire of hell. Those who turned their face towards the house of God, recited the exalted formula, promised to assist the helpers of the faith in keeping the land of Islam burning and throwing the burning wicks in the temples, were spared from the wrath of the Haji. Those who did not do so were treated like the Mongols and had the chains put around their necks. It was a proof of the victory of the Solomon of the King that he had entrusted the task of breaking the idol of Deogiri and helping the cause of the Hanafi faith. The elephants of gigantic size were directed towards the camp of the Haji without much stir. The writer has learnt from the informers in camp about the number of temples of the Hindus which were burnt by that lamp of truth. They have also reported that when the troops of the Rai of Deogiri heard the bugles sounded from the victorious camp they were demoralised. Ramdeo and his followers of Deogir were ordered to take refuge with and find relief in the camp of Sirajul Haque (Khawaja Haji)".

As the noble virtues of the Haji, who is so much favoured by the helper of the commander of the faithful, are too many to be described it is better that I should confine myself only to a petition of mine which has been issued from the most respected caliph, al-Mustansir Billah, for the despatch of horses, and it is hoped that the lamp of truth would have communicated this matter with verbal warmth to Ziyauddaula, suggesting also and at the same time that on the occasion of the branding[10] of the horses in the Diwan of Ariz, he should help me, the writer, as far as he can. Such a help would be like the performance of the Haj. I, who am a neighbonr of the exalted Khawaja Haji expect much help from him and hope that my request would be fulfilled at the first instance and I may return to my humble house wlth an order for Ziya (Ziyaddaula) dated *Zilhijja*, 702. (II 56-60).

Apart from other things, the date and name of the Caliph are obviously wrong. The Abbasid caliph of this name was the last but one of the long line and he ruled from 623=1220 to 640=1242. There was a Cairo Caliph of this name but he

this is the only, though a literary form, of a land grant or *inam* of the 13th century available to us we cannot ignore it. It ends with the hope that the sky-high land might be of some help to the donee by providing for him (in future) a magnificent hall (*Rawaq*) and for the populousness of the edifices of his kingdom. This shows it to be a charitable grant.

Some of the dated entries such as that of 5th *Shawwal*, 680, of the *Fath Nama*[7], composed by our author who had accompained Balban's expedition to Lakhnauti (V5-14) are genuine and valuable, but this cannot be said about others. In some cases what we find in the *Risail* is nothing but mere conjecture about dates and facts and parts of the contents of some letters are definitely wide of the truth.

As an example we may reproduce here a letter in which fact and fiction go together, and the entry recorded does not indicate the correct date. It is addressed to "Nasirul Mulk Sirajuddin Haji Arizul[8] Juyush" and occurs on pp. 56-60 of the second *Risail.* Barani frequently refers to Khawaja Haji Naib (deputy) Ariz-i-Mumalik, who was sent always with Malik Kafur on the southern expedition to Deogiri, Warangal, Dhur Samander and Maabar in A.H. 708, 709 and 710 respectively. He says that the country of Deogiri was laid waste and Ramdeo was carried to Delhi with rich booty "Khwaja Haji was to attend to the administration of the army, the collection of supplies and for securing the elephants and spoils". Now let us see how Amir Khusrau describes the first expedition to Deogiri. Malik Kafur mentioned in another[9] letter, which is supposed to have been written by the Emperor to his son, Farid, containing certain instructions, does not figure in this letter and the whole credit for the campaign appears to have been given to Haji. We are told that the king entrusted from the first the task of mustering and looking after the affairs of the royal troops to him so that he may perform the adventitious, emergent and essential duties efficiently. None else was deemed so competent for the unique office and worthy of the title of Ariz (muster-master) and Nasirul Mulk, and it is this which made the victory inevitable. The infidels were killed in large numbers as camels are sacrificed on the occasion of Haj. The group of infidels put up a stiff fight to show their fortitude. They come forward to display

chronogram '*Zebi*' and '*Tarsil*' which yield the year A.H. 719. But in the preface of the Ghurratul[5] Kamal he gives his correct age which was 34 in A.H. 685. Thus he was born in 651 and was 68 and not 70 in A.H.719. His scribblings continued till two years before his death which happend in A.H. 725, for it comes out in the chronogram given in an epistle by adding the letters of '*Jau*' and '*Gandum*' to that of '*Sare Kha*', that is the letter '*Khe*'. The first is devoid of date, and the third Risala has only two dates A.H. 707 and 708, and of the dated pieces of the 5th Risala only one has A.H. 702 and the rest are between A.H. 684 and 687, indicating that they are the earliest of the whole lot. Only two of the 29 pieces of the second Risala are dated 690 and 697 and the remaining range between A.H. 700 and 716. As regards the 11 dated pieces of the 4th volume only that at the end, mistaken by Dr. Mirza as the date of the compilation of all the four volumes, has A.H. 682, and the rest except one (of A.H. 723) covers the period from A.H. 702 to 716.

This (exceptional) document of some importance and supposed to be a grant by way of *Inam* (gift or assignment of a rent free land) to a warrior chief, described also as "professional village husbandman" is as follows :—I have ordered all the cultivators who break the earth and put the seed therein that they, with the help of natural rains, should grow and produce pearl-like grains. They who are as numerous as the particles of sands, have been made to enjoy my favours and protection so that they can maintain cultivation in proper condition, and I nurse and encourage them in these respects. I have also decreed an Inam grant from the beginning of Rabi, 723, of as many as ten units of ploughable land (Dah-i-Juft[6] wanan)) in the environs of village Dhulkoot to Amir Sipahsalar, favourite of the king............Harisuddin Dahqan-i-Zamin-dawar...so that out of what he gets as proceeds from that barren (short) land he may devote something by way of charity (*Tasadduq*) to the sepulchres of those destitute but pious people whose dishevelled hairs are loaded with dust, who have only two sheets of cloth to cover their body, and who enjoy such high spiritual position that whatever they swear by God is made true by God" (IV 103-4). The *Risail* is replete with analogies, similies, puns and riddles, and in this piece all the words are connected with and derived from land. As

accomplishments. But it has to be admitted that tnough the literaity portraits cannot compete with handy manuals of factual information, yet in the field of social history, they are not absolutely negligible, for the ornate picture that emerges gives perhaps some new and more accurate delineation of certain aspects of social life than is found in official records and chronicles. Such works were not command performances and suffered from little or no inhibitions.

Dr. Wahid Mirza[2] was the first scholar to draw our attention to the "plenty of things scattered in the pages" of the ponderous volumes of *Risail-i-Ijaz-i-Khusravi* (5 in number) that" are both interesting and instructive". He found in them "some useful bits of information about the social conditions, the state of learning, the scholars, the sciences, and political atmosphere of the age." He also refers to some important items concerning the poet's biography. "The late Dr. Muhammad Ashraf went further in his appraisal of this vast work and in his utilization of matters relevant to the subject of his valuable book.[3] He wrote about its contents that "they yield interesting and instructive information of a varied character, besides many graphic descriptions of various social phenomena and references to manners and morals." One who has the patience to go through the book will agree with him that in it "the spirit of the author has a free and unfettered play." Some of the epistles and discourses of Amir Khusrau in the *Risail* have been already utilized by the present writer, and this paper and some others which may follow may be taken to be a supplement to the studies already offered to the readers.[4]

The problem of dating the book and documents and of the credibility of Amir Khusrau's information are not as easy as Dr. Mirza would have us believe. He has been misled by the dates given on pp. 342 and 167 of the 4th and 5th *Risalas* respectively. He writes that "this voluminous work had been completed in 710 A. H. when the author was nearly 70 years old", and also that "there are some genuine letters that bear dates". Khusrau writes at the end of the 5th volume, "the pen of the writer is like the swift-running Arabian stead of 70 years ; still there are two teeth left, but everyday there is a faster blackening of both". A little later he gives the

RISAIL-UL-IJAZ OF AMIR KHUSRAU AN APPRAISAL

S. H. ASKARI

Though the early period of Muslim rule in India is not destitute of historical books, these termed chronicles, are mostly records of political developments, dynastic changes, wars and conquests, and they contain but little about economic factors, civil government and administration, and especially concerning the life and conditions, progress and decadence in cultural patterns, of the people. Sometimes careful and painstaking gleanings from purely literary and non-historical works repay the labour and energy spent thereon, and prove helpful in historical investigations. The information gathered therefrom though scanty, incomplete, dis-connected, uneven and fragmentary, not unoften adds something to our existing knowledge and may provide corrective and corroborative evidence about men and matters of the past. A student interested in social history, a comprehensive and authentic work whereon is still a desideratum, cannot afford to ignore any source-material, and evidence, literary, religious, hagiological[1], numismatic, epigraphic or based on foreign accounts which throw side lights on social organisation and institutions, varied social elements ranging from the highest to the lowest, social usages, and ways of living, manners, customs, beliefs, cultural patterns and cultural performances.

It may be argued that the need of historical accuracy cannot be fulfilled by works written in a rhetorical, exaggerated, over-dramatised and highly flown style, and one needs unimpeachable evidence to reconstruct life in early medieval times in India. There is no denying the need of very cautious and critical approach and carefully weighed conclusions from isolated incidents and allusions to contemporary men and events found in works full of colourful literary devices and written apparently to demonstrate the author's literary abilities and

hundred pieces of Russian linen (*katan*) were offered for his master, Prince Khizr Khan, the addressee. He and Bahram Elchi expected to be back in the imperial capital by the last of Shawwal. (IV-144-156)

As compared with the above, most of the miscellaneous pieces of the *Risail* have emanated from the ingenuity of the versatile author, matters and names of places and persons having had no real existence. A few examples will do. Harisuddin Dihqan (peasant) 'Zamindavari' is said to have been granted by the king *inam* lands workable by ten *juftawanan* (ploughs) in the environs of village Dhulkot, since the beginning of Rabi crops, 723. Similar are the cases of the fictitious grant of *idrar* to Imam Ja'far Rudbari (p. 102, iv) and of the appointments of Sinanuddin Qiran to the post of *Ashbak-i-Matb'akh* (keeper of the kitchen) and of Amir Nasimuddin Qabul as *Shahna-i-bad* or the officer to watch the effects of wind and climate. The *talazma* of the primary elements, earth, water, fire and air have been used here. But an important thing in the book is to see the context in which such words and expression as were in use in administrative sphere have been brought in. The following terms, offices and designations, are not devoid of interest : *Wajuh-i-Amil, Dagh-i-Aspan, Yak aspa, do aspa, Amir-i-Sadda, Zamindar, Nepal Khut, Dad Begi, Bahr Begi, Malik-ul-Bahr, Amir Hajib, Khasadar, Muhtasib, Mustaufi, Mushrif, Shikar Bak, Nazir-i-Mamalik, Nazir-i-Diwan, Nazir-i-Moamilat, Diwan-i-Ariz, Arizul Mamalik, Sar Silahdar, Sipahdar, Sipahsalar, Shahna-i-Pech, Shahna-i-jauhariyan, Shahnagi-i-Runghanfaran, Wali, Muqti, Mutasarrif, Muhassil, Kitabdar, Chashngir, Shana-i-Nepala.*

performed their obeisance by bending their knees frequently on the ground. As the purport of the exalted *farman* was that they should be awakened to the reality of the situation by the recital of the *khutba* in the laudable name of Muhammad,[51] it was done and it proved efficacious in bringing back into the fold of obedience those who had broken the bonds of submission and loyalty in that region. The Musalmans of Ghazni who on account of the blows of those base-born fellows had concealed themselves in the mountains made their appearance and the whole region of Ghazni became illumined by the light of the faith. It was on Saturday that the good news of the *khutba* was announced to the *khatib* (preacher) of Ghazni. He felt so exceedingly glad as to wish that the five intervening days should elapse very soon and was eargerly expectant for the Friday. On the Adina (Friday) day the saints and scholars of Ghazni who had been looking for a long time with the eyes of expectations towards Delhi and the elders and younger people who had vied with one another in expressing their joy at the expected opportunity of hearing the Alai *khutba* assembled. I invested the preacher with the royal *tilsan* (mantle) which had been sent by the Caliph by putting it on his shoulder. The congregational mosque of Ghazni which had decayed and whose walls and doors had fallen down was set right and became an abode of prayer and worship again. Those who had forgotten the fragrance of Islam assembled there and the mosque began to resound with the chanting of God's name in the *azan* and on the *tashbih* (rosary). The *khatib* ascended the pulpit and began to recite the *khutba*. When the name of His Majesty was pronounced I carried the jewels and the gold which I had brought to the pulpit and from that threw them down on the ground. The people fell on them to pick up the precious things. Both the *tilsan* of the *khatib* and the gold plate in my hands were very attractive. The Mongols saw all this from above the walls of the mosque and like dogs were licking or passing their tongues over. By the blessings of this auspicious *khutba*, the coinage of Islam became so current in that region that many infidels sincerely embraced the faith and recited the *kalima* (the Muslim formula).

At the end of the letter Badr Hajib refers to the schism and quarrels that had occurred among the Mongols of Transoxiana and Khorasan and those who were at first one and united were split up into two warring sections. Feuds, wars and anarchy prevailed in their lands. The people in the regions between Ghazni and Sindh river had again fallen in a state of trepidations and the Afghans had fled to Sulaiman mountain and concealed themselves therein. Badr Hajib also refers to the arrival of envoys from Qibchaq (Tartary) to the hellish Ais Bugha and later says that on the eve of his departure he was accorded a special and respectable reception and one thousand Tartar horses, one thousand Turkish salve girls and five

51. Muhammad was the name of Sultan Alauddin Khalji.

will on everybody to such an extent that if the creatures of Manikpur region were to die of thirst he would not allow them a drop of the water from the Ganges. I, the slave, had been demanding from that band of ignorant fellows the surplus revenue but they were referring to me to that Hindu and indulging in derisive remarks. In short,[46] a few useless fellows are swallowing up the whole revenue of the region in partnership with the filthy Hindus. A hundred times I requested them to give me a sheet of white paper but they denied that to me. I wanted to prepare a paper-garment[47] of complaint from what had come out of their own hands for they have sent so many letters stealthily in pursuit of their fraud, and have not cared for destroying them or preventing them from remaining in my possession. They are very soft in the science of calculations but they are an expert in theft and embezzlement. An account of the black deeds of these pen-men (*qalam zanan*) must be brought to the notice of the king and his wazir so that they should be taken out from here with chains being put round their necks (II, 40-49).

We may conclude this paper with an undated letter of Badr Hajib to Prince Shamsuddin, better known as Khizr Khan, the eldest son of Sultan Alauddin entitled Alexander, the second, about the attempts to extend[48] the sway of the Khaljis to Ghazni. It says :- In accordance with the royal orders I embarked on my journey and passed through various stages, levelling the ground, high and low, and clearing the path of the mischievious people so that the royal cavalcade might easily make forward moves. In this way I reached the bank of the river (Indus) after covering the land[49] journey in about two months. I crossed the river on swift-moving boats fitted with nail hooks. It was winter when I arrived in the plains of Ghazni. The season was exceedingly cold. I saw the hellish Ais Bugha[50] in his shell and the other Mongols having heard the sound of the swords of the great Khan were alarmed and terror-stricken on the approach of the army of Islam. When the royal *farman* was read out to them they felt comforted and placed their faces on the ground and according to their customs

---

46. 'حاصل آن مشتی بی حاصل جملگی محصول ولایت را بشرکت آن هندوی پلید پاک می برند و می خورند'۔

47. "می خواهد که پیراهن کاغذین کند"

48. Elliot has noticed this document briefly in volume III (appendix) and says that the history is silent on the question of Alauddin's ascendency at Ghazni. Ferishta speaks olny of plundering expeditions into that and the neighbouring countries

49. 'دیدیم که همه آتش غلطان و دوان دو ماهه راه سوئی دریای محیط روی برزمین می نهاد و می رفت'۔

50. It has not been possible to identify this Turk from any other source.

the talk continued in this strain the master servant asked me as to how much silver-coloured things I demanded. When I mentioned thirty lakhs of *jital* he grinned and showed me his 32 teeth. I warmed up and said that if he suffered from constipation or looseness of bowels, I would draw out all the maladies from his stomach which he had stocked with things exacted from people by employing obnoxious methods and obstructive practices, he said: "Don't be non-sensical. You have not been sent by Khwaja Jahan".

A handful of powerful penholders patronise the ryots with their right hand and misappropriate revenue (*mahsul*) with the left, and if one *dirham* is asked of them they show their empty[45] hands. Although they were told that a hundred of thousand which was due to them would be exacted, they talked of paper and pen so as to cover their stealth. Unless the heads of the agents are thrown down, the revenue cannot be realised. They are a group of a people who acquire wealth by corrupt means. But this wealth is unlawful and has no durability. If the *Farman* is referred to, they say that this was not the *Farman* of the Solomon with the royal seal and symbol (*toughra*), but of the Diwan. If I say that they were opposing Khwaja Jahan who wielded supreme authority, they would bring in the name of the Sultan and make mention of his black canopy which was spread over all and was the symbol of the royal justice. But when the turn of action comes, they resort to lies. However much it was said to them that the letter of Khwaja Jahan should have weight with them, they poured ridicule over it and they gave nothing in accord with it. I had considered these clerks to be men of independence but actually they are a sort of people who throw chains round the necks of independent people. They did not take into the account my computations and pointed hundreds of flaws in it. They wished to involve me in bribery and then call me into severe accounts. I was between two fires and ran the risk of falling into their clutches here and was also, on the other hand, afraid of being put in chains by Khwaja Jahan.

At this time I laid my grievances before the Malik who listened to them but he referred my affairs to a Hindu named Deu Chand who had gathered his myrmidons around him and was sitting like a serpent on the sandal. He attached no importance to the *shahna* of the Diwani. He was a man of low origin of Kara. Low and behold this ingenious secretary (*dabir-i-Mudabbir*) who had thrown all the secretaries into the background led people into the dark well of his ink-pot. The Muqti who was the adorer of the Hindus gives preference to the inverted script (*Khatt-i-Bazguna*) over the Muslim alphabets and by putting the ink on the point of his pen set fire to the towns of the region, deceived all and imposed his

45. 'مشت را بعقد نود و سه می بندند و می گویند که نقش درم اگرچه
بسه می شود بر ما شکل صفر دارد'۔

We can have some idea of the prevalence of corruption in the sphere of public administration, the contours of the evil, the class of persons involved, and the hands of the subordinate Hindu officials in the affairs of big assigness of lands from an important despatch, dated II Rabi', 709, by an unnamed official, deputed to realise the surplus revenue from the Muqti of Manikpur. The latter being in league with the officials of the Financial Department defrauded the Government of their just due. The abstract of the document which forms an interesting reading is as follows :- "On this side through the grace of the king and the wazir every thing is being properly managed and is in order. But owing to the bad transactions of the Muqti of Manikpur and his followers fairness and justice have disappeared. When I, at the instance of *Mushir-i-Mamalik*[41] (chief councillor of the kingdom), went to his subordinates, met the Muqti of Manikpur, and stooped to kiss his hands within his jurisdiction, at village Tanhora,[42] that unmanly person, may God keep him off from His blessing!, though a spendthrift did not take me into account on the occasion. When the *Farman* was delivered to him and the surplus revenue was demanded of him, that assignee of these tracts showed me his sword and said: "What to speak of the ears of grain nothing can be had here even in the forms of loans without the sword. There is no army[43] left in this region to prevent havoc being done by the cattle. 'How can the men of the pen do this job? The produce (*hasil*) of these small towns is not so much as to suffice even for the lives of the bands of servants here". Then he folded and twisted the paper in his hands and handed it over to the Master servant (*katkhoda*)[44] of his house and hinted not to act according to the document in a business like manner. The Master servant took me to his house, treated me with due courtesy and asked me to stay there for the day. I said that this would not do; we had to talk of the business and think of the balance (*fazil*). The words of litterateurs which are pregnant with meanings are better than those of clerks which bring out nothing but cypers. When

41. It was the title of the Wazir who has been described as *Buzurgi-i-Mihr* of the age. Asaf-i-Sani Khatir-ul-Haq Waddin i.e. Khwaja Khatiruddin who had served under Balban and Jalaluddin and was the first Wazir of Alauddin Khalji. The wazirs were also entitled as *Nizamul Mulk*, *Muaiyyadul Mulk*, *Sadrul Mulk*, *Dastur-i-Dastur-i-Azamat*.

42. It is difficult to locate this village.

43. The meaning of this sentence is not quite cleer "*Dar Qita-i-Rah Lashkar Bashad wa hanoz Dar Qita-i-rah-i-Lushkeriyan wa Darin Wilayat Laskare Namand ke Muwwash ra Malish risanad*.

44. See Supra. The word also means Master of a family. As regards the Muqtis or Muqtas were officers in charge of the garrisons. Minhaj has referred to Wilayat-i-Kara and Manikpur. Later perhaps the larger unit was cut up into Iqtas and Manikpur was placed under a Muqti who, as the document suggests, was expected to be responsible to the *Diwan-i-Wizarat*.

A document of different content is a *mithal* (Royal command), dated 700 A.H. which says that a village, named Nasur[38] in the east (Delhi-i-Purb) which had fallen in ruins and had become depopulated, was assigned as '*inam*'[39] to Shaikh Shamsuddin who was directed to repopulate it and make it as shining as the light of the sun and the moon. The thatched houses of the inhabitants should no longer have fissures and holes. He was to extend his cherishing hands over the heads of the raiyyat so as to give them ease and comfort from the heat of distress under the shadow of his protection and enable them to pass their lives in happiness. He had to strive his utmost to increase the cultivation of the area and augment its production. The inhabitants of the village (*Qaria*) were called upon to treat the said Shaikh Shamsuddin as the *mutasarif* and pay to him their revenue (*mahisul*) of the 12 mionths of the year and obey him implicitly(II, 17-18).

A '*parwanah*' addressed to officials of *Ishtinara' mash'al khana*) issued on the 30th Rabi I, 709, says that Zia-ud-daula[40] Siraj-ud-din who was responsible for the light in the court was also appointed 'Shahna' (superintendent) incharge of the oil merchants and manufacturers of Delhi, the Imperial metropolis and the other regions who were countless in number, each one being more ingenious and evasive in payment of 'Kharaj' than the others. They had repeatedly duped the tax-gatherers (*Muhassil*). There should be no connivance at their activities, however much they might try their oily methods to make him soft and conciliatory so that their trade should continue to flourish. On the other hand, he was to punish them with severity. He was to be specially on his guard against Narain, the oil manufacturer, who was the lamp of the whole community and he should pay no heed to him when he adopted his usual methods. He was so skillful in his manipulation that if the oil distilled by him weighed one dang (six rattis) he so managed as to make it equal to one '*tanka*'. Siraj-ud-dowlah was to find out the evil ways and the nefarious methods of the fat manufacturers or oil-men (*charb karan*) and if they deviated from his orders, even to the extent of one grain sesame (*kunjad-til*), he should throw them into the oil-mill (Jawaz-Kolhu) and let them be squeezed therein and confiscate everything they possessed so that others might take a warning therefrom (II, 19-20).

---

38. It may be also read as 'دیه پرب قسور' or "Sur' which is preferable. Pure Hindi words are not wanting in the *Risail*. These and the Hindi sentence in it will be noticed in another paper.

39. Assignment of rent free land as a reward. *Idrar* meant recurring grant in cash to the learned and the pious persons.

40. The royal household had an officer who was incharge of lights or torches but there are so many similies and analogies drawn from light in the piece that one cannot but suspect the piece to be a mere figment of the author's mind.

he was the Wali[36] and the Qazi had no authority over him. When that man violated the law of the Prophet, how could the dignity of the *Shar i'at* be preserved ? It was hoped that if the tyranny and oppression of that ruler were brought to the notice of the just Sultan, the tyrannical person would be driven out from that place, with ropes tied round his shoulders like the cattle by the foot soldiers. He should be made to disgorge all that he had taken from, and was claimed by, the Muslims and the *Zimmis*, and then he should be hauled up before the house of chastisement (*Dar-us-Siyasat*) and put to death so that others might take warning and nobody in future should venture to impose his will on others (II,21-25).

This is followed by a list of good and bad qazis, furnished by one named Latif Mas'ud, appointed as *qari* (reciter) of the Quran by Shaikh-us-Islam, Rafi'ud-din, on whom he poured forth his eulogium. In this list which was prepared in 690 A.H , we get the names of Qazi 'Ain-ul-Quzzat Zia-ud-din, the pupil of the eye of *shari'a*; Qazi Zahir-ud-din, who was very strict in the administration of justice; Qazi Sadr-ud-din, the greatest of the Sadrs and the second Qazi, Muhammad Yusuf, Jalal-ud-din, the great Qazi 'Ain-ud-din who always followed the path of *shari'at*; Qazi Burhan-ud-din who always adduced proofs for whatever he observed; and Qazi Ahmad, the most trustworthy of the Qazis. There were also Qazis[37] such as Qazi Ja'far Khani, who had no honour and dignity; Qazi Imam-ud-din Razi who was expert in laying the foundation of tyranny; Qazi Kamalud-din who had become notorious for misappropriating the goods of others; Qazi Ya'qub, a man of abundance (May his head be cut off and may his wealth disappear); Qazi Wahid-ud-din who was a dualist; Qazi Razi-ud din who afflicted the hearts of people; Qazi Maudud who had already gone to hell; Qazi Bahai Suqi who had the disposition of the market people (*Qazari*) Qazi Khalid, a liar and a corrupt man who had perished (II,25-28).

---

36. *Walis* and *Muqt's* or holders of Wilayat and Iqtas into which the kingdom was divided were governors and military commanders respectively. Alauddin Khalji was the Muqti of Kara and Awadh. The Muqti was more than Iqtadar for he had to maintain a body of troops to keep law and order. He had to send the surplus revenue of the area in his charge after meeting the local expenses. He was liable to military service. In financial matters he was responsible to the *Diwan-i-Wizarat*. He had a secretariat headed by one called Dabir. He had also a confidential adviser called Kat Khuda translated here as Master servant of the house. See infra.

37. If Barani is to be believed Qazi Mughisuddin mentioned another such person in his talk with the Sultan "For the post of the Qazi of the realm thou hast appointed Hamid of Multan whose family from the time of his grandfather and father have lived on usury. Nor dost thou carefully enquire into the beliefs of other Qazis, and thou givest the laws of the Prophet into the hands of the covetious, and the avaricious and the worldly. Qazi Mughis referred to the Sultan's responsibility in respect of the ill-starred black-faced learned men sitting in the mosque interpreting, cheating and adopting the ways of swindling. This is not brought to my notice on account of the impious shameless Qazis who stand near the throne".

which came within the purview of the Qazi of Delhi who has been described here as Sadr-i-Sadur-i-Jahan Zia-ul Haq[31] waddin Abdur Rahman. The officials were enjoined upon to obey his orders in all such matters as fell within his jurisdiction. Utmost of reverence was to be shown to him.

An important document, described as a paper-case or robe whereby the oppressed ones (*jama-i-kaghzi-i-mazluman*)[32] laid their complaints against privileged people contains the despatch of the chief slave of Baha-i-Suqi, the 'Hakim'[33] of Khitta-i-Nagore, which was addressed on 30th Rabi' I, 709, at the instance of the Qazi of the place, to the Sadr-i-Jahan, Zia-ul-Haq waddin. It relates to the complaint brought in '*Diwan-ul-Mazalim*',[34] against the 'wali' who despite his Muslim name of Malik Islam, indulged in un-Islamic activities and had extended his hand wide for the ruination of a populous region of the realm of Islam. He had misappropriated a hundred thousand and had become proverbially parsimonious. Like many other agents of government (*'ummal*), he always had his eyes on the wealth of others and his stony heart served as the load-stone, drawing to itself the money of the people. Even the shirt (*pairahan*) on his body belonged to others. He had so many claimants at his door but he knew how to deny justice to all. He was not afraid of death. Although the Hanafi Law, which was administered, supported the case of the oppressed ones, he refused to consider the judgement of the Qazis as valid. By dishonest means he had made himself so rich as to leave even Jafar Dwaniqi[35] behind as a poor man. Opening his tongue of criticisms and derision, he contemptuously referred to the Qazi and said that the latter called himself a *faqih* (jurist) but was ignorant of literature and had to be taught manners. Every day a number of seekers of truth put forward before him the plea of *Sharia* but he ignored it and being puffed up and becoming violent, he uttered that

---

31. Perhaps he was Maulana Ziyauddin of Bayana who rose from the office of Qazi-i-lashkar to the highest judical offices of the realm and was called Sadr-i-Jahan This piece ends significantly with 'کتب بامر امیرالمومنین'

32. This reminds us of the old Persian custom which has been referred to by Ghalib.

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیراہن ہر پیکر تصویر کا

33. The celebrated 14th century sufi saint of Bihar, Sharafuddin Yaha Maneri has used the words Qazi and Hakim for one who administered justice. Ordinarily in Muslim countries judicial functions were exercised by Qazis and in small villages by Hakims.

34. In Muslim countries outside India (Baghdad, Cordova etc.) there was a special judge called *Sahib-ul-Mazalim* who was appointed by the superior ruler to hear the complaints of breach of privileges or offences committed by big public officials.

35. Abu Jafa'r Ali Mansur, the second Abbasid Caliph, and the creator of Baghdad who reigned for nearly 20 years was notorious for his stingency.

Muhammad). He was to confirm by evidence the rights of God's creature; revive and interpret the revealed command of God; discriminate between the subtleties of things lawful and unlawful; test by experience the conditions and situations of the gentry and the commonalty; make it incumbent upon himself to pay greater attention to the complaints of the oppressed ones; especially those who suffered from the violence and extortion of the official rulers; observe fairness and equality between two contending claimants, especially a rich and a poor person; and should discriminate between false and corrupt and trustworthy and truthful witnesses.

He had also to appoint such agents (*vakil*) in the departments of government as might not have a feeling of fear or fright. Such deputies (*nawwab*) should be appointed in the judicial department in cities (*madain*) in country-sides (*khitats*), towns (*qasbat*) as might follow him in their occupation and in the discharge of their judicial duties. They should be furnished with instruction and enjoined upon not to interfere in the ways (affairs) of government and not to blacken the pages of their papers by their wrong and false judicial decrees. Bribery and corruption had to be shunned and money accruing therefrom should be treated as insignificant and transient as the spider's web, rendering their existence useless. They should remain content with what they received from the State which was bound to shine like the arms of the flies, i.e., it would be lawful. In the Department of religion and judiciary,what is stated in the Quran "They are the tyrants who do not order according to what has been revealed", "Verily the tyrant would suffer from perpetual torment", is to be kept in view. A *qazi* should be guided by the Quranic text (*ayat*), public opinion (*rai akhbar*), discretion (*darayat*), honesty and integrity (*taday yun*).

The king wished that ocean of learning should become so boisterous that the waves of the straight path of Command and Prohibitions should flow like that which was witnessed in the time of the Prophet and therefore he had established *madrasas* and embellished them with learning and not with the stone walls and made them charitable institutions for students seeking knowledge. The Qazi should permit the preachers to deliver their sermons. He should appoint *qaris* (readers of the Quran) who preserve the eternal tablets (*Lauhi Mahfuz*) in their breasts. One of his duties was to appoint such custodians of the endowed properties as might fulfil the conditions of knowledge and honesty. They should not be such as to transgress the laws of Waqf. He should make enquiries and investigations into the conditions of the mosques and the *madrasas*, assemblies, nuptials. All the matters pertaining to judiciary should be regulated in such a manner that might not be the least deviation from the *shari'at*. The king had made some grants of the assignments of land (*iqta'at*), rewards or gifts (*inamat*) mostly from Northern India to some people corresponnding to their pos tion and status and the regulation of these was taken to be a religious duty

'The traders of the port of Kambhayet, who are so opulent and active on the sea, have brought some precious things (*nafais*) by sea for the imperial treasury and they should give their delivery to the *Mutasarrifs* (revenue officers) of Naharwala. They constantly ply their vessels on the waters of those directions and the rarities of Maghrib and Sham (Syria) reach continuously and in succession to this side. They should take their vessels to Jerusalem (*Bait-ul-Muqaddas*) and bring them back. The other merchandise, carried in their vessels from Ethopia and Barbari, include the black slaves of Abyssinia whose services are utilised in guarding the harem and as soldiers. Their salty black colour is attractive in its own way. The negro slaves of Zanjbar (Zanzibar) and Darya (?) are of gigantic size and very swift-footed. They were all recipients of royal favours.

Some idea of the working of the judicial department and the attributes, duties and functions of a *qazi* can be had from a *farman*, dated 716 A.H., conferring the office of the Chief Qazi of Delhi, the imperial metropolis, on Shamsul-'ulama-il-Mujtahidin (the sun of the scholars and of theological doctors) Ziya-ul-Haq waddin Abdur Rahman Usman Ashraf (II, 4-17). The introductory portion deals with the might and majesty of the king ; the suppression of the turbulent and refractory people of Hind, Khata, and Tatar; reduction and submission of the great 'Rais' of the Hindus; protection of the weak against the strong; establishment of peace and tranquillity throughout the realm; adoption of the mo.. "Reverence to God and compassion on His creatures"; consciousness o. the need of carrying out the Quranic behests, "Verily God enjoins upon you to be just and benevolent"; and of administering fair and impartial justice to all, especially to the *zimmis*, (protected non-Muslim subjects) and of *dihqans* (village peasants). He was determined to carry out the *fatwas* (command) of *shari'at* (canon law) that when a king should take up the work of regulating the affairs of the kingdom, he should appoint *qazis* who are possessed of the virtues of justice, purity, piety and sound knowledge of theology so that the weak and the helpless ones and the indigent people who have no support, should remain immune from injury and the learned divines should not suffer from the darkness of oppression and the insignificant should not be trampled under the feet of the elephant.

'The king says that being on the look out for a man, possessed of the requisite attributes, he cast his eyes far and wide, from the extremity of Transoxiana to the shores of the Black Sea and a man of deep scholarship, thoroughly honest and strict follower of the *shari'at* law was not easily available. At last, such a person was found in Maulana Abdur Rahman Usman Ashraf who had the truth of (Abu Bakr) Siddiq. justice of 'Umar, modesty of 'Usman and scholarship of 'Ali. In knowledge of tradition and in the use of discretion he was the second Sharih (the qazi who was appointed by and represented 'Ali, the 4th Caliph) and the third Sahibain (Imam-i-Azam Abu Hanifa had two special pupils, qazi Abu Yusuf and Imam

derveshes on whom rest the foundations of the faith and the Sayids, both Alawis[28] and Fatamis, should be the object of reverence and benediction. They are the pillars serving as the prop of power and authority, kingdom and empires. When the tentpole is damaged, the tent itself falls down.

The independent rulers should be won over by conciliatory methods and favours. The sincere and pious people over there should so behave as to extort respect and admiration for their dignity. When the royal coinage had been made current in that region, the abundance of gold and silver in the shape of satanic[29] coins like '*Achchu*' (yellow gold), '*Padma*' (white silver) and '*Qatam*' (small black coin) should be an object of anxiety and the treasury should be so flooded with royal coinage as to obviate the necessity of other metals. Countless cavalry and infantry should be collected and kept ready to bring under control the distant regions of land and sea. The peasants and the cultivators who pin their hopes on water for irrigation and on their cattle and calves, should receive help and encouragement so that they might bring out increased production. As regards the assessement of the cultivable lands, settlement should be made on a half and half basis. Religion should be the guide in every transaction. The inhabitants of the coastal regions, islands and harbours should be made to acknowledge the imperial suzerainty and if they hesitated to do so, force should be used against them. It was hoped that the Hindu Paiks (foot-soldiers) would give up their mischievous activities and when the demand was made for *kharaj* and *jiziya*, they should be humble and submissive When they accepted such a position of obedience and submission, they should be assured of their safety and security. Strangely enough, this document addressed to the King's son, concludes with the mention of the names and the pompous[30] titles of "-Khwaja Jahan Dastur-i-Sadr Nashin....Naib Mubarak Barbak Kafur as Sultani......".

The next piece is a *Farman Tughra* (with royal titles prefixed), dated 13th Safar, 709 A.H., which was addressed to the merchants of the sea and the ports, regarding the transportation of the gifts and goods of Arabia, Habsha (Ethopia), Bahrain, Barbar, Maghrib and Syria. It is of some significance, showing as it does, the interest taken by Alauddin Khalji in foreign trade and shipping. Unfortunately, it does not specify the articles of import and export and is much too short to provide us with some much-needed information. Its substance is as follows :-

28. The direct descendents of Hazrat Ali by wives other than by Fatima, the daughter of the Prophet, are called Alawis.

29. This reference to the monetary system obtaining in the south is interesting but the coins mentioned require identification and elucidation in respect of their nature, weights and measures.

30. The concluding portion begins with an Arabic text "*Katab-al amir al ghalib ala ghalib Reqab-us-Salatin.*"

nued to ply on the ocean upto Kish and Harmuz (islands on the mouth of the Persian Gulf) and the whole of the coastal region was to be brought under control and possession. The neighbouring islands in the ocean which had been a source of trouble and the coastal regions should be brought under control by means of sword and the idolatrous practices of those areas should be substituted by the laudable customs and obligatory duties of Islam. Whosoever agreed to accept the position of a *Zimmi*, had to be condoned and pardoned.

Although the princely recipient of the *Farman* had enough good sense and foresight to require detailed instructions, the affection of the father dictated the need of showing him light so that he should pursue the straight path and regulate the affairs in such a way as to make all his subjects and the common people enjoy peace and comfort. He should mete out justice to all like Naushirvan. Everyone was to be provided with some work and occupation. Cruelty and oppression on common creatures had to be sternly suppressed. The prince should not allow himself to be defrauded by writers and accountants and collectors of *Zakat*, "whose entry of hundred maunds of gold yielded no cash but only a paper". He had to guard himself against the counterfeiting of coins and discriminate between those who were false and faultless. The Hindu scribes who with their inverted[27] script (*Khatt-i-Bazguma*) sent the affairs of Mussalmans up and down (disturbed and confused) should not be allowed such latitude as to continue plying their pen more swiftly and prove prejudicial to the interests of those who were firm in faith and were virtuous. He had to remain awake about the affairs of his territory and the *Iqta's* so as to avert mischiefs and calamities. He should depute spies and informants in the east and the west so that they might move about constantly from dawn till darkness in the midst of the poor and the destitute, the rich and the wealthy, so that into no retreat and corner oppression and tyranny might find their way. He should regard the lamentations of the oppressed ones to be the clarion call of the Judgement Day and not the musical note, emanating from the Turkish guitar (*tambur*). If a loaf of bread would serve as a shield for the life of an indigent person, that should not be withheld from him. The religious mendicants in the dark narrow retreats and streets, who passed their days in hunger and lived only on restricted diet, should also not be ignored. Punishment should be tempered with mercy and when an oppressive enemy sought mercy and refuge, one should go to the utmost limit to accomodate him and spare the sword. But as regards "the enemies of the country in whose case the pen of *Shari'a* writes the *Fatwa* (judgement) with blood", they should not be spared. The scholars whose occupations dispelled darkness, who lit thousands of lamps of learning for the followers of (Imam) Abu Hanifa and the saintly Sufi

27. Tha is written from left to right.

end, the hot-blooded inhabitants of the tract of Multan[22] were specially assured of fairness and justice and generous treatment. They were asked to give up their designs of war, their fear and fright, their hatred and antagonism, and also their impossible demands, and to pray for the success of the newly established regime".

This is followed (vol. IV pp. 119-141) by a *Tauqi'* (mandate), conferring on the boy prince Farid Khan,[23] the government of the *iqta'* of Ma'abar[24] and Sawahil (coastal regions). After offering his thanks givings to God for having blessed him with many capable sons and hoping that they would prove to be the aid and support of the community and the country, the Emperor says that it was his duty to survey the affairs of the world ; to see where there was darkness of perverseness and rebellion ; to appoint one of his sons to that part of the country which was devoid of worthy people and he should be capable enough to chastise those who evaded payment of the fixed money. The coastal regions of Ma'abar and the whole tract upto the shores of Malabar, which were equal to Ma'abar in area were conferred on Farid Khan, "the dearest and the happiest son and the pearl of the crown of the kingdom" so that he might take possession of and establish his control over both land and sea on that side. His deputies and *diwans* were ordered to prepare and put down on paper detailed incomes, accruing from sea and land, since Rabi 712 A.H.[25]; to demolish the foundations of idolatory ; to take proper measures against the erring and the rebellious ones and crush the refractory and the seditious people of the frontier regions. Deserving men of sword and the pen and workers, learned and of practical experience, were to be appointed to the post suited to them. They should see that the boats and the ships[26] conti-

22. Multan had become the rendezvous of Jalali princes and nobles headed by Arkali Khan. But they were disposed off, despite the recommendation of the Suhrawardi saint, Shaikh Ruknuddin and the region was brought under control by Qutlugh Khan and Zafar Khan after about a couple of month's investment.

23. Of the numerous sons of Alauddin, Khizr, Shadi, Farid, Shihabuddin and Mubarak Shah, are better known. Others were Abu Bakar, Ali, Baha and Usman. They all suffered blinding and murder at the hands of either Malik Kafur Mubarak, or Khusrau Khan-Khizr and Shadi were murdered by their own step brother Mubarak.Nobody has mentioned the incumbency of Farid referred to here, though there is nothing improbable about the boy-prince being nominally put in charge of the area and being deputized by Malik Kafur.

24. According to Wassaf's *Taj ziat-ul-Amtar* Maabar extended in length from Kulam to Nilawar (Nellor) nearly three hundred farsangs (each about 3 miles) along the sea coast.

25. 'از استقبال ربیع تاریخے همایون تر' The last two words form the chronogram yielding the year 712. But *Khazain-ul-Futuh* which is more reliable says that Malik Kafur set out towards Maabar on 24th Jamadi, 710.

26. This and other such references to the interest taken in sea-borne trade and foreign commerce by the Khalji Sultan is of some importance.

have devoured others". It behoves one who sits on the cushion of the state to water the garden of sovereignty from the spring of *Shari'at*; to prevent calamities and dangers from mankind and genii throughout his dominion; to extend his justice and equity far and wide; to root out all mischiefs and tumults; and to so crush the refractory and the blood-thirsty ones as to ensure complete peace and comfort for all.

This is followed by what gives us a clue to the ambitious designs of 'Alauddin to attain the throne by any means, fair or foul, which had been harboured since long. Alauddin appears to have been in league with the discontented Jalali nobles who were anxious and ready to welcome him as a king. "As the kingdom-bestowing exalted and sacred Lord had given the joyful tidings of the dawn of good fortune to the eternal Cradle of the Child of my destiny and had prepared the robe of the attributes, referred to above, so as to fit my sky-like size and stature, the eyes of the stars were on the look-out for the dawn of that day and for that time when the orbit of my black canopy would be witnessed. And the fixed stars by making friends with the angels (*aql-i-kul*) had arranged the affairs and had done what was expedient so that the throne of the empyrean should cast the shadow of my sovereignty and the jealous and the malicious ones should be prevented from creating mischiefs. They were restless to witness the manifestation of my war-like activities and were ready with their gifts to welcome my victory and success. Praise be to God that their expectations did not remain unfulfilled".

The document next refers to the issuance of the new coinage and the reading of the new *Khutba*; to appointments made; to measures adopted for ensuring justice and protection ot the loyal[20] zimmis; to the intended policy of making wars of conquest and expansion, of establishing peace and security, doing justice to all, promoting the welfare of the subjects, rooting out marauders on the roads and highways so that "people with gold and silver[20] in their palm could enjoy a sound sleep in the world"; devising a sound system of intelligence and espionage; befriending peasants, tradesmen and workers, "the sweat of whose eyebrows falling on the ground become pearls"; cheapening things, especially grain; mitigating[21] the severity of the *Kharaj*; helping the indigent and the wayfarers out of the royal exchequer; patronising the saintly mystics and the pious ascetics, and the great scholars, teachers and earnest students. The motto adopted and stressed upon was: "To honour the command of God and to be clement and compassionate towards the creatures of God". In the

---

20. که سیم و زر چو بکف کرده در جهان خسپند

21. سبک کنند و برگ کلیش باز آرند

became[17] lightened. In mtaters of justice and welfare of his subjects his enlightened nature had devised such laws as could not have been reflected on the mirror of Alexander or in the cup of Jamshed. For cheapening the grains, which is the leaven of life's existence, his sound and balanced judgement had made such regulations that even when the clouds do not send the rains and the wind and the sun do not help the soil to yield green crops, he can keep the common multitude supplied with food from the royal stores.[18] As regards the other requirements of the people, whether rich or poor, things have been made cheaper and more easily accessible. Money which is the elixir of desires and the most wanted and cherised object has been made so cheap, on account of the considerable gifts and abundant charities of the king that no one feels the dearth and dearness[19] of provisions and consequently ease and prosperity prevails all over the kingdom. All the people are leading happy and contented lives, like the sparrows in the gardens, full of ears of corns. There is peace and security every where in the world on account of the efficient management of affairs by the great Sultan. Roads and highways have been made bright, plain and safe for all including veiled women and babes in mother's laps. Robbers have fled away from the shadow of the wealth and household goods and furniture, as shadows flee from the sun, and justice is busy in uprooting tyranny as the lamp dispels darkness. The gigantic elephants cannot trample under their feet the insignificant ants and the hungry lions have not the courage to laugh at the unsteady movement of a lame deer (vol. I pp. 15-22).

Now let us consider the first *Farman*, proclaiming Alauddin's accession to the throne (vol. IV pp. 104-119). The initial passage is not devoid of significance. "Praise be to God who had elevated the position of the king for the exaltation of the faith of Muhammad; made him the lord of a lasting world ; chosen him to sit on the throne to enforce the common law which is valid for ever ; distinguished him with special eminence and excellenc ; given directly from Himself and not through fate (*Falak*); and enabled him to attain a kingdom for which others after him might not be so worthy and deserving. God grants greatness only to those whom He favours. He next goes on to say something about his black standard, his swift-moving armies, his goods and treasures, and also about the utility, duty and qualities of kings. "Had there been no king some people might

---

17. One may take the author's exaggerations for what they are worth. Alauddin had fleeced both Hindus and Muslims, though he was eminently successful in ensuring peace and also plenty of the consumers' goods.

18. "انبار خاصه"

19. *Khairul Majalis* and *Maktubat-i-Muzaffar Shams Balkhi* of Bihar contain corroborative references. People in the early years of Firuz Tughluq spoke about the comparatively greater peace and plenty that prevailed in Alauddin's time and they even paid reverence to his tomb.

meant the subordination and subjection of all the crown-wearers of the time, including all the refractory infidel chiefs. Many a time he deputed the Rustams of his victorious army to humiliate the Afrasiyabs of Turkistan. The iron chains of afflictions which the headless Mongols used to bring each year from Timur Qiq[15] for the neck of the faithfuls to carry them as prisoners, turned into swords which cut them down and sent them to hell. Some who were spared by the swords or who were put in chains or liberated but tried to raise mischiefs and tumult and break their fetters were ordered to be thrown down from the battlements of the fortress into the river, while the rain of blood was made to pour on the earth from the necks of others and their berry-coloured bodies buried in the ground served as seeds from which sprouted shoots of ruddy-coloured odoriferous basils of Tartary. Thereafter towers[16] were built with the heads of those dogs, inauspicious as red Mars. The towers with many white girdles containing thousands of heads of those red-complexioned ones became lofty as the sky. Similar lofty towers were erected in other regions of the country. The towns and cities which on account of the frequent raids and assaults of the Mongols had become desolate and ruined like deserts became populous again at the expansive hands of the king. The blood-shedding Mongols on the other side of Ghazni were no longer able to cross the Sindh river and the ferocious Tartars from the side of the Jaxartes were not given any quarter or repose. The carpet of peace and tranquility was so admirably spread that from the fortification of Delhi to the territories of Khorasan all disorders and tumults subsided and the mischievous Mongols rolled down on the ground. On one side, the huge hordes of Chingiz Khan had been blown off beyond the oxus by the violent wind of the dread and awe inspired by the king and, on the other side, the powerful Rais of India who with thousand elephants used to trample the ranks of the Turks had no alternative but to offer elephants and treasures and those who dared to offer resistence were crushed. Some of them who placed their heads before the columns of the royal threshold became recipients of royal favours.

The gifts and gratuities of His Majesty were so common that even without written deeds and commands, the houses of the rich and the poor

---

15. Tamar or Timur in Turki language means iron and Qiq implies a mountain surrounding the world. Mangu Timur, father of Pulad, was one of the direct descendents of the renowned Chingiz Knan, through his son Tuji, father of Batu (the other more famous sons of Chingiz being Chaghtai, Oaktai *and* Tuli)

16. Barani, Badauni and Ferishta have mentioned some of the prominent raids of the Mongol chiefs, that occured from the second year of the reign up to 706. They were defeated at each time, Barani says that once when they invaded Delhi many were slain and others who were captured were trampled to death by elephants and of their heads they formed huge platform (*chabutra*) or made turrets of the Mongol skulls. Again, he says that in Badaun a tower of the their heads was raised before the city gate which "the town people look at to the present day".

sed at this, sent 50 elephants with treasures, jewels and choicest goods as a token of his submission and loyalty, and on the following day he came himself to the presence and was assured of the safety of his life and property. A review was taken of his goods and chattels. What he offered was taken and his demands and requests were acceded to. By agreement, he entered into the fold of '*Zimmis*'—those, protected by, and subject to, the Muslim government. When all the affairs of the region were satisfactorily settled, the Emperor returned to the metropolis on the 5th of Shawwal, 680 A.H. (vol. V, pp. 5-13. Nawal Kishore Edition, Lucknow)

The next document that attracts our notice is the brief allusion of the meeting between father and son, Bughra Khan and Kaiqubad, on the banks of the Sarju river in Awadh, a subject dealt with at length in *Qir'an-us-Sa'adain*. In a letter, dated Rajab 1, 687 A.H., wherein all the figures of speech have been derived from the planetary system and which was addressed to Najmul millat waddin Shams (Najmuddin Hasan[13] Sijzi), Amir Khusrau refers to his reunion with his old friends, Shamsuddin Dabir (Balban's Secretary who drafted the Emperor's memorandum for his son Bughra Khan) and Qazi Asiruddin Muhammad, and he also makes mention of his patron (Makhdum), Malik-ush-Sharq Ikhtiyaruddin Ali Beg Sultani (Khan Jahan Hatim Khan) who was appointed governor of Awadh. The Sultan of the East, Nasiruddin Mahmud (Bughra), arrived on the bank of the Saru (Sarju) and from the other side came Muizzuddunya waddin Kaiqubad. On the first day, they remained encamped on either side of the river and on the next day the meeting took place. Amir Khusrau bewails his lot that he could not return with the royal army to his home and was obliged to stay in Awadh. The royal cavalcade was marching on but his patron, the incomparable Malik, turned him back and he had to leave the company of his friends in the royal army and travel back to the darkness of Hindustan (eastern provinces), the realm of Saturn. It was the season of rains, lightning and hails, in the midst of which he had to wend his way back, his eyes raining tears on the parting of his friends.

The other dated epistles and documents belong to the early years of Alauddin Khalji,[14] whose achievements in manifold spheres have been summarized in his own inimitable style in a long Introduction to his first volume. The relevant extracts wherein the Sultan has been eulogized for his wars and conquests, his stern and effective chastisement of the Mongols and the erection of turrets of their heads, his justice and generosity, promotion of the material prosperity and welfare of his subjects, and establishment of peace and security are as follows: His very accession to the throne

---

13. The celebrated poet, a friend of Amir Khusrau, and the author of *Fawaid-ul-Fuad*.
14. The introductory portion contains the names and profuse eulogium on Mubarak Shah, the despicable son and successor of Alauddin Khalji. Could he be described as *Nasib-ul-Wilayat-il-Abbasiya* (1, 28-39)

Barbek Beglar[7] Bek, one of the most trusted officers of the court and deservedly famed for his martial virtues, to reduce the realm of 'Jajnagar and Awadh'[8]. These regions, bordering on the deep ocean, on account of the distance and abundance of elephants, cavalry and infantry had remained immune from the hands of those fighting the 'holy wars.' That valiant officer who had been authorised to do all that was necessary, marched quickly to that side, traversing high and low lands, and when he arrived in the vicinity of that realm, the people became nervous and panicky. But Naldeo[9], the chief 'Rai' of Jajnagar and a big 'zamindar' of that frontier, advanced with 50 elephants, 5,000 cavalry, and 10,000 *paik* swordsmen to oppose the imperialists. The lion-like soldiers, thirsty for the blood of the despised wretched fellows, gained an upper hand over them and in the very first attack killed many of them. As they had been instructed to capture as many of the Deccani elephants as they could, they at first desisted from shooting their hill-penetrating arrows but had at last to use them, making four of the elephants look like porcupine. A number of the 'infidels' were put to the sword and as many as 60 elephants were captured.

After this, the victorious army proceeded towards Jahanbar[10] which was the headquarters of the 'Rai'. A blockade was laid around the strong fort of Hargaon,[11] the top of which had been provided with ballistas (*manjaniq*) and many small magazines for throwing heavy stones (*Arrada*), arrows and lances. With a view to capturing the fort, orders were issued to the soldiers to ascend the summit of the fort with the help of ladders and strong ropes. They rushed up and got on the top and took possession of one side of the fort. They were about to raise the whole of it to the dust when Rai Birajit Man,[12] who was distinguished among the Hindus for his foresight and wisdom, realising the impending loss of all the resources of his zamindari to be followed by his overthrow and chastisement, sent some eloquent men to sue for peace. When the imperialists saw that the leader of the enemies, despite his immense resources and previous refractoriness and refusal to pay the *Kharaj* (tribute), had become humble and submissive they accepted his gifts and presents and sent back his men with assurances about his "residence and integrity". The 'Rai' being plea-

7. He is 'Malik Ikhtiyaruddin Barbak Bikrus Sultani' of Barani (pp. 24, 88) who was sent by Balban ahead of him in the direction of Jajnagar in pursuit of Tughril.

8. The manuscript copy of O.P.L., Patna, has given the correct word "Jajnagar Odessa".

9. Can this "Rana-i-Samin" "رانه سامین" be identified with Raja Fa. entitled Manick of Tipperah who was a great friend and supporter of Tughril? Some scholars are inclined to identify Jajnagar with Tipperah.

10. The Patna Ms. has "Sawad-i-Maha Banares".

11. We get 'Hisar-i-Sargaon" or Sarkano in Patna Ms.

12. The Patna Ms. corrects it as Mall. Barani has mentioned one, Danuj Rai of Sonargaon, who had entered into an agreement with Balban. But Berajit could not be Danauj.

and difficult work but it is worth while to extract from it some matters of political and cultural interest. The length of the *farmans*, *tauqi*, *hukumnamas*, etc. and their highly ornate and verbose style would justly raise doubts about their genuineness. But the substance of their contents, the dates and names of persons and places which are not all fictitious and the sequence of events, as also the fact that Amir Khusrau was a witness of, and a participator in, the affairs and occurrences mentioned, will suggest the importance of their main themes. Perhaps none could give a better idea of the political atmosphere of the age in which he lived than Amir Khusrau. More important is the glimpse we get in it of the social and cultural conditions of northern India at the end of the 13th and the first-quarter of the 14th century. This aspect will form the subject of a separate paper.

The first thing in chronological order is the *Fathnama*[6] or the letter of victory, sent to Delhi by Ghiyasuddin Balban after the conquest of Lakhnauti. Amir Khusrau had accompanied Bughra Khan in his expedition against the rebel, Tughril, who being puffed up with the successful onslaughts on Jajnagar, had assumed the title of Mughisuddin and had caused the *Khutba* to be read and coins to be issued in his name. He had repelled the attacks of the imperialists, led by the ill-fated Amin Khan and Shihabuddin or Bahadur, Governor of Awadh, and invited the wrath and invasion of Bengal by the emperor himself. On the approach of the imperial army, he fled to Jajnagar and for a time eluded the grasp but was eventually overtaken and killed there.

Strangely enough, the *Fathnama* makes no mention of Tughril and is mainly concerned with the activities of the imperialists against the Hindus of Jajnagar and the neighbouring region, bordering on the ocean, whose identity has to be established. The *Fathnama*, composed in 680 A.H., when Amir Khusrau was 31 years of age, opens with the praise of God who had placed the 'rightful king" in a position to exercise power and authority, regulate the affairs of the kingdom, promote the interests of the faith, punish the mischievous and the refractory ones, and effect the conquests of forts and realms. Then it says that the king sent Malik-ush-Sharq Ikhtiyaruddin

---

6. Dr. Habibullah, in his book, '*Foundation of Muslim rule in India*' has briefly noticed it in a footnote on p. 167. Prof. Khaliq Nizami has published the text of this *Fathnama*, in an appendix of his work, '*Some aspects of Religion and Politics in the 13th Century* but he has taken it to be a private essay rather than an official document on the ground that Barani has referred to the official despatch of the victory by Dabir Qamruddin and Amir Khusrau was too young at the time to be entrusted with such a responsible task. The subject of the Risail is the 'Science of Epistle-writing' and, therefore, one has to judge the historical value of its various pieces by seeing whether, shorn of their verbosity and literary jugglery, they contain anything which is contrary to, or contradictory of, the established facts of history.

MATERIAL OF HISTORICAL INTEREST IN I'jAZ-I-KHUSRAVI

In a paper[1] published a few years back, the present writer had tried to draw the attention of scholars to the need of gleaning material of historical interest from contemporary literature of professedly non-political character. *Belles lettres*, epistolary[2] compositions containing sometimes copies of official documents, poetic pieces[3], dealing sometimes with historical events, mystic literature and biographical works containing minute details of every-day life of Sufi saints and even books of romance, written in very ornate style, yield fruitful results to a painstaking student of history. That a book of tales and a collection of ancedotes can unexpectedly bring to light something which may serve as a source of political and social history was illustrated by a paper on *Basatin-ul-Uns* contributed to the Poona Session of the Indian History Congress, and may be further shown by a fairly big paper which is shortly to come out on *Jawami-ul-Hikayat wa Lawami-ur-Riwayat* of Muhammad al-Awfi, a contemporary of Qubacha and Iltutmish.

The historical works, including the *masnavis*, of Amir Khusrau, who witnessed the reigns of, and wrote about, several kings from Balban to Muhammad bin Tughluq, have been utilized by many scholars who have found some of his prose works also to be of great historical value for a student of early medieval history of India. But one of his voluminous works on epistography, named *I'jaz-i-Khusravi*,[4] completed in 719 A.H. four of the five parts whereof had been completed in 682 A.H., have scared all except those who are interested in highly ornate style, literary skill and artifices, verbal jugglery and intellectual gymnastics. The style is so stiff, involved and complicated and the few matters of undoubted value for social and political history that are found in it are so wrapped up in puzzles and puns that nobody except the learned author of "The Life and Works of Amir Khusrau",[5] has cared to notice its contents. This is a voluminous

---

1. *Sidelights on Firuz Shah Tughlak and his times* (mainly from literary and religious sources), *P.U. Journal*, XIII-1959.

2. Many such collections like *Dastur-ul-Insha* (letters of Raja Ram Narain), *Dastur-ul-Imla*, *Riyaz-ul-Insha*, *Madan-ul-Insha* etc. have already formed the subject of separate papers by the present writer.

3. Versified accounts in Persian of Islam Shah's campaigns in Assam. (*Current studies*, Patna College)

4. The chronogram "زیبی در ترسیل" yields 719 (V.p. 167). The author was at this time about 70 years old "هفتاد ساله شد" (V-157).

5. Dr. Wahid Mirza also edited and published the valuable *masnavi*, "*Nuh Sipihr* .

Tanka (a denomination of silver money) at its end just as the drop of the oil which trickles down as a pound of the size of the *Dāng* (Damri) as it expands and spreads and becomes as big as a *Tanka* (i. e. he makes the little appear to be much). The ways of the greazy vicious oilmen of the time are peculiar. They believe that they can make Serajuddaula a kind exponent and champion of their cause if they make their conditions manifest piece by piece (Kunjad ba kunjad), and even if there be a mole through out their body, they would not conceal it lest, if they deviate even to a point of the Sesame seed-their wheat, (Swarthy) coloured body may be cut into pieces with the sword like Sesame leaves. Instead of the Sesame seed they should themselves be thrown into the oil mill (Jawāz) and squeezed to death. Every thing that belongs to them should be confiscated so that confidence should be restored to the people of the time. The Sesame seed should become so bitter in their mouth that they may take it to be a poison.

host of people towards a dark well (pit) which is his inkpot. In the black and cold water of the ink-pot he dips his pen. The Hindu-patronising Governor (Muqti-i-Hindu Parast) prefers his script, written in the reverse way (Khatta-i-Bāzguna), over (Arabic) alphabet of the Musalmans, and this fellow is setting fire to all the towns of this region by bringing out smoke from the top of his reed-pipe (taking ink on the top of the pen" (II-46-47).

There is an interesting passage relating to an important industrial class—oilmen—who ran the time-honoured oil Press at Delhi and defrauded the Government and their customers. Ziaul-Mulk Sirajuddaula, (supposed to be) the chief of the department of lightning or illumination, was also put incharge as *Shahna* (Superintendent) of the oil pressers (Raughandārān) i. e. Telligar of Delhi and its environs so that he might bring about a change in the habits and nature of the band of those vicious oily people who are more numerous than the particles of sands, and by penetrating like water into sands he was to bring out oil therefrom (do the impossible). As regards the leaders of those people, each one excels the other in flattering and practising deception upon the *Shahna*, and every one appears to be unique of his time in manupulating the affairs. Many a time they have imposed upon and deceived the collectors (*Muhassilān*) of oil tax with trifles like lees or dregs that remain after squeezing (i. e. Khalli or oil cakes) and they do not let them see to the game, just as they do with bullock by fastening and closing their eyes, and making them go round and round the oil mills. He should not allow them to persist (in their nefarious activities). Although they would try to make an offer of small quantity of oil for his lamp and wish to use him as a wick of cotton and burn him (bribe and exploit him to serve their selfish purposes), he should anticipate them and reduce their bones to cotton by striking them with his wooden stick just as the carder does in the case of the cotton with his comber. After giving them a thorough rubbing he should pour that very oil on their heads which must be placed against the lamp for being burnt so that to every one their real condition may be clearly exposed. This should be specially the case with Narain Raughanagar (oil manufaturer) who is the lamp or light of their race (Duda). If he brings any thing like a rose it should not be touched with the fingers for that flower is like the snuff of the candle made of fire and flame. His way is such that to whomsoever he gives a *Dāng* (a weight, equal to 6 Rattis or fourth part of Drachm) he puts the impression of a

propriated might be recovered. The Hindu scribes who played havoc upon the Muslims with their inverted script (khatt-i-Bāzguna) should not be given so much salary as to make them wear good shoes, for if the blistered skin of their heels stops emitting blood they would use their legs in kicking all the resolute men of faith. They would take out their shoes (to strike them), and their sharp-edged pen which resembles the cobbler's awl would be made use of on the skin of the faithful one's (IV-131)".

There is a small passage (IV-65) which shows that the accounts of the produce were kept by the Hindus who were not very honest in making the entries of the produce of grains brought by the peasants. They used to keep a good portion to themselves by omitting the entries in the register. Their sharp tongues were like scythes in easily disposing of the complaints. The relevant extracts is as follows—"A particular Hindu scribe (Nawisindah) who supervises and keeps an account of the produce of the grain plies his pen which is two-faced, and what it writes is as important as the corn itself, for it splits asunder the disposition of the poor cultivators, just as the plough tears the fields into pieces. His tongue is like the corn-reaping scythe which tears into pieces whatever litters of things come in the way cf man".

In a section containing letters relating to the officials of the revenue department there is an interesting report, dated 709 A. H. of an auditor, detailing his amazing experiences of the notorious writer class. An extracts is, worth consideration "At this stage when my complaint reached the Malik (Muqti of Manikpur), he decided to redress my grievances. But they had left my affairs in the hands of a Hindu named Deochand who had collected around him a few devils (Deos) whom he maintained and patronised. He had acquired a great hold on the Malik just as the *Deo* commands the *Chandals* and the serpent sits tight on the Sandal wood. All persons, big and small, found themselves encircled by these devils. He does not take into account or mind the action of the '*Shahna-i-Diwāni*' (sperintendent of Revenue Department). The people who claim the power to arrest these devils (*Dewāns*) flee from their shadows (dare not approach them). Really this fellow is a man of low origin from Kara, where he used to live in dire adversity in his early life. On account of his proficiency as a writer he managed to acquire great influence over the whole population of Kara. He is such a clever and skilful administrator (Dabir-i-Mudabbir) as to overwhelm all other secretaries, but he is also a such mischievous writer that he leads a whole

own juice, and it is certain that he would try to take the plantation non-contract or lease from the accountant or writer (*Girah Burān*). That scribe or accountant should be thrown into his own sugar mills (Jawāz) before he squeezes us. The police Superintendent (Majlis-i-Shahna) would earn our appreciative sweets if he firmly squeezes him and realises the tax on the sweet juice so as to make a stream of sugar juice flow in the village wherein that most ignoble sordid fellow should be drowned to serve as a warning for other parfidious people. If he happens to get an inkling of this affair he will give sweets (bribe) to every body so as to keep their lips sealed. Till the talk of the sweet (bribe) reaches and becomes bitter (jarring) to the ears of others and the mouth of the bribe-taker are embittered by the delivery of the sweet, this wine seller who lives on the wages of iniquity, should be compelled to taste the bitterness of punishment from the department of censor of Morals, and sweet juice of sugar has to be taken out of the root of his teeth before it goes down his throats" (II-247-49). [*Note* there is a hint here that sugar was used for manufacture of wine. A certain extract metaphorically written clearly shows that wine was made out of grapes and of sugar "The heart of Khusrau resembles grapes, and his pen is like a sugar cane from the juice whereof pure wine is manufactured.] (IV-247-49).

Sultan Alauddin, a keen judge of men and matters, seems to have had a low opinion of certain classes of petty officials. He is supposed to have warned his son, Prince Farid, against "deceitful words and counterfeit activities of those sycophant records-keepers who knew how to polish their writings by using the silvery leaves. Their base silver was nothing but copper. If they wrote about revenue of hundred mounds of gold that would mean a vanishing thing and nothing in the shape of cash could be had except on mere paper. Even if their allies and relations were as pure as gold they should not be let off and the coins of their deeds should be tested for 12 Months on the touch stone. If they were suspected to be dishonest they should be beaten like gold, so that all the gold that they had taken in their belly might come out of it. Even if they came out unscathed they should have to face the financial courts, just as the use of silver is allowed in canon law. As regards the false and fraudulent agents they should be made to have the taste of iron so that they might emit the embezzeled silver as red ruby (blood). If all of them are rice-eating Hindus they should be intimidated and made to tremble with fear so that the capital amount which they had misap-

of a month that the mouths of the horses of the writer are sealed in respect of barley corn (Jaw)......A handful of barley had come from village Barhana, but it was soon eaten up and now barley is not available in the bazar and one has to suffer kicks for trying to get it......There is the pretence of keeping stocks of grains against scarcity (*ambardāri*) but there exists everywhere plenty of cereals like *Mung* (pulse black grain) and *Māash* (vetch or kidney bean) which are not drawn together (do not get mixed up). They have imitated the ways of the jews. Is there nobody to throw them (hoarders) in the pit in place of grains ?" (V-65).

The agents of big stockists interferred with and tried to exploit honest grain dealers to fulfil their own ultimate ends. "Mohsin Galla Farosh" complained to his master, "Khawaja Ra,īs", that the latter's agents had virtually "lifted him up by the hair like the handle of the seale" and were compelling him "to keep the wheat of the (Government) stock in his custody". He prayed that "before this dirty practice (of higher prices) which was a reminder of the episode of Adam's fall filled up the measure of his age" (ruined him) the addressee should intervene (and get at the true facts) and see that the whea' flour was transferred to the other carriers of burthen, leaving him behind scathless just as it happened in the episode of the thief of fine cloth and thus earn his share of rewards for the store house of Dooms day (IV-334-35).

One of the cash crops of the time was sugar cane. The ripe sugar canes were pressed and crushed in sugar mills, called in the Risāil 'Gharkh' and 'Jawāz', and revenue accrued to the Government from the tax on its juice (*Wajh-i-asri*). The village Hindu official or agent called "Khuta", was expected to help the Government in assessment and realisation of revenue. Maimun Sharābi, the tax gatherer, (Shahna) of village Nepala wrote to Shihab Sumarqandi that "a lady, Shakkar Khatun, had a very rich sugar plantation in village Naisāna on the river side and Neipal Khuta was exceedingly desirous of getting that sugar plantation for himself." Sometimes he says that "such sugar has not been available under the revolving sky, and sometimes giving way to his meanness, he reports that although the time of the seasonal showers has come, the sugar fields have turned into a place where cane reeds grow, and sugar plants are depending on their own moisture. There is no doubt, however, that such kind of sugar plants as we have are not grown anywhere even in tracts within the jurisdiction of Misr (Egypt). This planator Hindu, who is more inauspicous than saturn, goes up every day to bask under the sun shine of sugar crushing wheel and sits tight stewing in his

Alauddin to promote the well being of the state and the people, corruption was rife in all classes of society, particularly among the business people and the revenue officials, judges, scribes, tax-gatherers and accountants etc. There are interesting passages in the Risāil about their nefarious practices and the corrupt activities of such people.

A short extract with the heading "control of market chiefs" is of some significance even from historical point of view, for it gives us the author's view and reflections on the fraudulent ways and dishonest behaviour of the shop-keepers and other business men. Here is the relevant passage. "Whenever the market man comes across the chief or the supervisor he begins to whine and lament; and when the question of rules and principles of honesty or integrity crops up, and he has to deal with the faithful believers, he shows his vexation, anger and annoyance. The wicked (corrupt) trader has no ultimate gain except his black face (disgrace). The cloth merchant should learn to be straight (honest) from his straight measuring rod, and the grocer (grain merchant) should learn to be upright from the horizontal beam of the balance which is never crooked (does not lean on one side) as the pair of the scales. The money-changer who is always busy in improving or purifying impure coins is incapable of purifying his own heart (making it good and worthy). The dealers in the market or worldly traders make a profit of one out of ten (i.e. take ten percent annual interest) while the traders of the next world (Darweshes) make ten out of one (will be rewarded 10 times for one good deed). Although a gold-smith weighs gold on his brass scale and the grain hoarder or profiteer (Muhtakir) weighs the rice (birinj) on his golden balance (makes its dear and high priced). If you closely examine the affairs of both you will find that there is no gain or prosperity in the weighing scale of either. A jeweller should not be equated with the grain merchant. Pure gold is not weighed on a balance made out of skin or leather. The weaver (Jolāha) and the man at the shuttle (Taninda) do the same work, and yet one is different from the other, for while one does his work sitting all the while, the other is constantly moving to and from (I-174).

Amir Khusrau exposes contemporary practices of hoarders and profiteers and of corrupt petty local officials and agents such as tax-gatherers and scribes who were Hindus. At times certain essential cereals became scarce in the market; but enough was kept up in pits or *Khattas* by usual methods with a view of enhancing the price. "Today it is about the end

thrown on the problem of the medium of exchange, and many types of coins, current in the country both in the north and south have been referred to. The *Jital*, *Dam*, and the *Dāng* were the lowest units, mostly of copper; the *Dirham* (*Sharai* and *Rikābi*) and *Sikka-i-Nuqra* were silver coins; *Dinār Surkh* (red) and *Tanka-i-Zard* or *Zar*, were gold coins. There is a reference to *Sikha-i-Adali* (*II-32I*). All these could be called "*Sikka-i-Sultani*", as distinguished from some of the Tamil coins described in a *Farman* (*IV*-136) as "*Sikka-i-Shailāni*", such as *Acchu* (really accu i.e. yellow gold) *Padam* (white or silver) and *Qatam* (black like fals, small copper coins). Towns and villages, had their own cottage and small scale industries. Some of the main industries produced plenty of textile, goods, leather, sugar, oil, iron, wood, food etc. Various kinds of fine and superfinecloths of cotton, silken and wool were produced, both in the north and south, and some also came from outside such as Katān-i-Rusi, (Russian linen) Jāma-i-Darāz-i-Walāyati (long cloth imported from outside) Lebīcha-i-Tabrizi (an apparel of fine cloths made in Tabriz), Yakta-i-Zabadi (a garment of flowered sheet without a lining, produced in the town of Zabad). We get references to fine painted (Munaqqash) or embroidered (Zarkār) garments. Kirpās (long cloth) Khaz (course kind of silk cloth), Debā (brcade) Atlas (satin), Qāqam (fine kind of ermin), Nasij (garments of fine silken texture), Qimāt-i-Hariri (very thin silken cloth). Among other cloths worth mentioning are Yaktā-i-Chambharatali (a kind of very thin cloth), Yakta-i-Parniān (kind of fine silken painted silk), Yaktā-i-Awadhi, Jāma-i-Deogiri, Yaktā-i-Narma Latifi (a kind of fine cloth of delicate texture), Jerma, Mauji (a fine piece of cloth), Yaktā-i-Bahraman (red coloured silken cloth), "*Behāri* or *Katān-i*-Bihar" (long cloth, and Rupīk-i-Bihari=towels of embroidered cloths with gold threads).

Amir Khusrau's observations in the book would have us believe that Alauddin's rule was neither wasteful nor oppressive but benevolent considerate and conducive to the good and the welfare of the people. "The royal characteristics", he writes on page 39 V.I. "are in accord with the canons of wisdom; his anger is like the essence of fire which is good for cooking but does not burn; his forgiveness is like the breeze which blows freely or uninterruptedly but raises not dust; his nature (disposition) is like water that is the source of pleasure but does not drown; and his generosity is like a mine of earth which yields the treasures of livelihood but does not carry it deep down (in the earth)".

But despite the strong rule and stern measures and sincere desire of

sapphires and corals. Upon the whole, all the workers or the artisans had made the saying "contentment is sovereignty" as the Friday oration of their pleasure, and had stamped the inscription of the text "the wage earner is Friend of God." On the coins of their honour; their lives become pure by the labours they put in to earn their wages and just like the lives of the abstemious ones they find pleasure in their works. (IV-172-174).

In the bazars there is so much over-crowding that people rub their chest against one another like their much-folded turbans. Some of them are so adept in the rules and principles of sales and purchases that they have every thing on the tip of their tongues. They higgle and haggle like the disputant religious divines or scholars. Goods and chatteles and all kinds of household furnitures are so cheap that four sets of bridal gifts can be arranged for ten Dirhams. The surging river of the slave-market (*Nakhkhās*) abounds in slave-girls so much so that a well equipped moon-faced slave girl with attendant porter can be had for embracing for ten Tankas or double the amount for 12 months (i.e.$10 \times 2 \times 12 = 240$ Tankas). The wearing apparels are exceedingly cheap. Long cotton cloth (Kirpas) was so fine and delicate that if a turban wearer wrapped his head with the turban of 100 yards his hair from under its fold would be visible from the side like the writing of the letters of the alphabet which come out from inside of the silken paper, and the price of *Khaz* silk would wear the complainant's dress (*Jama-i-Kāghazin)* out of envy and spite against that *Kirpās*. A tray-full of such coarse (*Rikabi*) cloth could be purchased for two Dirhams. One can estimate the cost of other cloths on this line for a hundred types of turbans. The fruits which are eaten as food and those which are cooked and whatever is required for eating and cooking, and in fact, all other necessities of life such as the books for the students and the prayer carpets for the mystic saints, are well stocked in shops and in the market town and are cheaper and easily available (IV-173-74).

From the fragmentary information in the Risāil we learn that Ala-uddin's empire was stable and well governed as a result of which the general economic condition of the country was one of peace, plenty and prosperity. Agriculture, trade and industry flourished. Agriculture was the main profession of the people, specially in the rural areas. There are references to both internal and external trade, coastal sea-borne commerce, and movements of Caravans of merchants with their goods. There is little about means of communication and transport but some light is

such an extent and in such a way that he might not have to approach any one else.

In this letter which he terms a long one he prays that what was to be granted should be given without delay so that he might not have to write about it again directly or indirectly. Playing upon the words, sword and pen, he next exhorts the addressee to use his pen quite judiciously so that nothing written by it might be questioned. He further says that the addressee having in view the dictates of expendiency should issue proper written orders so that the conditions of the recipients might be straight-end like the stationary position of the fluent pen, and he would go to the utmost extent in favouring them with oral instructions, and if need be, he might resort to the use of sword also so that with the strength of the chief of the sword and of the pen the revenue of the territory of his jurisdiction might be obtained (regularly) from the hot headed (Saifi) subjects and the recipient might lead a secure and comfortable life like a sword resting in the scabbard. He should always utilise the gratitude of the low-placed people for the gifts granted to them and he might employ them against the mighty powerful ones. He concludes the letter by referring to the addressee as the planet Utărid (mercury) the light whereof emanated from the sun (i.e.king). In the end the writer offers his grateful thanks to "the luminous personality who was near Bihar and was like the sun in the east." He wished for him in his morning prayer a position of glory and elevation higher than what he was already enjoying (338-382).

Turning from matters, political and administrative, to those of economic interests, we first come upon a short passase from which we may have some idea of Amir Khusrau's estimate of the earnest and honest wage earners and of his appraisal of the cheapness and abundance of goods of various kinds in the markets. Relating to lawful occupations (Muhtarifa-i-Halăl Khwră) he writes "some make the golden flowers blossom through the thorns of their needles; some dig out (split up) the the stones and bring out gold; some provide for themselves their lawful morsel by using the hair of the pigs in a way that not even a hair-brea of unlawfulness is involved in that morsel; and some by their labour at bricks and stones drop lustrous gems from the sweat of their brow, and accept two Dirhams as the wages thereof. Although those gems are valueless in the eyes of the common people, yet in the market of the judgment Day, they are as precious as the pearls hidden in the oysters, for every drop of the pearly sweats resembles an ornament studded with rubies,

Although the robe of justice that has been bestowed upon you by the just king provides sufficient coverings for the lapses in this world, yet the writer is fully confident that there is nothing but the garb of forgiveness which would be decidedly given to you from the treasure of one who hideth things with the veil of forgiveness and mercy. Oh ! the one who is above all faults will make him wear the garb of mercy on the day when all persons will be devoid of all clothing" (II-303-306).

There is an interesting letter of recommendation of Amir Khusrau to a high official of the Government who was probably connected with the revenue Department and was vested with authority to grant land and gifts to men of learning and of genuine-piety. The addressee, Sharfuddaulah, was regarded as a great personality to whom the writer offered his countless salutations and described himself as one of his followers...."After expressing the desire to meet him, he begins to eulogize in highly flown language his spiritual chief" Maulana, the sea of excellences, Nizamul-Millat-Waddin, the wearer of the garland of the jewels of meaningful thoughts, whose pearly (scholarly) utterances and compositions, specially in the field of *Fiqh* had dessiminated knowledge far and wide, particularly, in Delhi, situated on the river of Jamuna, which had eclipsed the rivers Tigres of Baghdad and the Nile of Egypt. Many people had derived extensive benefits from the saintly scholar in theological learning. The writer introduces himself also as a man of learning largely because of his associations with him and says that despite his lofty position in learning and piety he had included him amongst his true followers and he had gained perfection in disposition through him.

Then he reverts to the addressee and comes to the main purport of the letter relating to the raiyat and villages. He expresses his hopes at the outset that the addressee would pay due attention to the expectations and aspirations of all classes of human beings (Insān Az Har Nau) and suggests that if any one wanted a town or village (Deh) to earn his lawful bread which was without any suspicion or taint of unlawfulness it should be granted to him and that such a person should be also granted protection by him so that he might remain immune from the oppression of the petty officials of the caliphate and might become free like animals and birds within the precincts of the sacred enclosure. He further says that if any one sought favour in the form of *Idrār* (regularly recurring grant in cash to the learned and the pious) it should be sanctioned to

already gone a long way, and everyone of the oppressed people has become helpless, being neither dead nor alive, under the darkness of their tyranny like the lamp of widowed women. If by your burning flame you illumine them through a little of the warmth of your tongue they would be at once extinguished by the cold breath. The tyrannical people have become so puffed up with pride and recklessness that if they see a lamp burning in the house of a widow, they try to put it out at once.

Praise be to God that the king has appointed such a man of profound learning as *Shahna* (representative) and made him in charge of the Department of canon law. He would let the stream of justice flow without any hindrance and to the fullest extent, and he would wash off the earth and make it clean of all contaminations of oppression. The hail-stricken victims of tyranny who were crying at the top of their voices for divine wrath against the tyrannical ones, who are so numerous, and for help and protection of those who were oppressed, would now remain under the protection of the department of justice without any fear of injury or onslaughts of the tyrannical ones". Verses : "Let not any oppressed person shed tears from his eyes like rains after this, and let not any tyrannical person have a bright smile on his face like lightening hereafter."

The story of tyranny and oppression of the strong-armed and long-handed ones is so long as to defy detailed description, and the scale of the sufferings of the oppressed ones is too heavy to be matched in terms of words on the scale of justice, verses : "The hearts of the creatures of God have been broken to pieces by excesses committed against them, in the same way as the glasses are split asunder by stones which fall upon them. Now that the reins of justice which means the rope of God have been placed in the hands of the most just one of the nobles (*Āadal-ul-Umara*), the oppressive hands of the powerful ones should be held fast and bound so as to make their strong clutches too feeble and useless to do any and to be incapable of holding anything in the unlawful grip harm and practising unauthorised severity. Verses : "When they scratch the hearts of God's creatures by their nails the blood trickles out from their nails".

The carpet of your threshold is much-too high for the tapestry advice that your humble well wisher offers but the carpet of the discourse has been spread only because of the long and old association with you, and it is hoped that you would not take it otherwise and will excuse it.

We may also consider the passages which throw some light on the prevalent condition of the judiciary which was far from satisfactory, and on the corruption and injustice which needed effective check and eradication in the following piece. This is a letter which is supposed to have been addressed by a subordinate official to a newly-appointed chief of the court of *Mazālim*, called here *Dād Begi*, really *Amir-i-Dād*, who was above the Qāzi, "Your sincere servant, Hasan Naqib, who is one of your followers offers his felicitations to you and thanks-givings to God, the just, on your well-deserved appointment to the post of *Dād Begi*, and hopes that you would always be mindful in administering justice in such a way that those who are oppressed might not have any complaint against you. Everybody knows that all that exists is liable to change except *Dād* (justice) which will be the same even in the reverse order. Since it is so, you should always be very particular in doing justice. When the sense of justice takes firm root in your heart you would adorn the position of the chief of the court of complaints (*Sadrul-Mazālim*', and for that reason you would not deviate from the path of the men of justice. From every side fissures of disturbances would be opened upon you and you would have to exercise your heavy responsibility and weighty integrity and shut all avenues of bribery and corruption so that those who stealthily cause mischiefs to creep in might not have an occasion for meddling. If the Qāzi opens the door you should set up a wall in your front and deliberately keep yourself aloof so that the foundation of goodness and virtue which would be strengthened afresh by your clean and pure disposition might not be affected by hollow and useless argumentation Since the Qāzis are generally hard-hearted (not amenable to reason), they would start from basis of hostilities. You know that those who build up magnificent gates through bribery would have to see them topple down in deep abyss. If one having known the door to Hell does not turn away from it, he is sure to fall in the lowest depth. And when they make recommendations which are not in accord with the canon law you should turn a deaf ear to them by reason of the light of integrity that is in you, and in telling truth you should be frank and bitter with your words which may be jarring to the ears so that anyone who is mischievous might not extend his scheme (get a long rope) and become firmly entrenched with it.

It may be made clear to you that the oppressions practised by the dark-hearted wealthy persons on the Darweshes of enlightened mind have

was a person who was not very unlike a certified advocate of the present time, though we have got no other evidence in support of this view Another thing which attracts one's notice is that the sun and not a watch or a clock helped the faithful to offer their prayers at the right time. The proverbial un-reliability of witnesses in the court and the pleader's persistent efforts to support a weak or a false case have also been referred to. We are told on page 203 Vol. IV, that the whereever the aforesaid Vakil went he made a great impression because his firy tongue which resembled the shooting stars, put the case he had taken up in the court of the Sadr named Badrul Millat Waddin or the office of the Qāzi with vehemence arguings orally and discussing the claims of different kinds, sorts, and colours, on the strength of case-precedents and complete or incomplete and even undated legal documents (Qabāla-i-Sharayee) of which his heart was full. He made use of whatever mischiefs he was capable of. It seems that he did not know that all complaints (Mudda-yiān) were liers. At any rate, all wisemen knew that it was the characteristic of the complainants to speak lies. The writer says that at first the extent of the knowledge possessed by Maulana Najmuddin was not clearly known to him and was not aware of the height attained by the sun of his learning. It was just like a cloudy day for him which sometimes misled one in ascertaining the prayer times. But when the cloud had been cleared of the wind of his pride, he was exposed and every body came to know the real truth about him that his knowledge was nothing but dregso. The writer tried to impress upon Maulana Badruddin that it was the demand of experiency and justice that the hollowness of the man should be exposed just like the heavy but empty turbans of the sermonisers, by using some appreciative words, so that having received such honour he might rub his proud forehead on the dust. When the man of bad nature was humbled and reduced to dust by such show of leniency and apparant kindness, the opportunity would come to rub his head on polluted earth which comes under the shoes. On no account, however, the aforesaid Maulana was inclined to listen to the suggestion. All the members of the Badr (Qāzi or Judge) were quite at one in the decision on the point that Najim should be brought down from his exalted position of knowledge by means of legal reasons (Hujaj-i-Sharai). They decided to accuse him of the knowledge of astronomy or astrology which is prohibited in matters religious and thus to disgrace him before the students. He must not be allowed to have the courage to impart lessons in a cool atmosphere on this subject.

comes before him. Howsoever much he is asked to have a favourable view of the complaints on the basis of Noamāni (Hanafi) interpretations he does not mind it. He does not accept as correct the judgement of the Qāzi on the subject and always runs after the Malik-Dinar (king of gold). By amassing money, piece by piece, he has become so rich as to consider Jāfar Dawāniqi (Abbasid Caliph) to be a pauper. He opens and rolls his shameless eyes at the time of arguments and wordy disputations, and makes unexplainable matters the basis of his preamble.

This well wishing writer accepts from his *Ādāb-ul-Maluk* (courtsey of the rulers, also the name of a book) but he talks of *Ādāb-ul-Qāzi*. He opens his tongue of satire and sarcasm and says "our Qāzi is a *Faqih* (a theologian lawyer) and is ignorant of the Qāzi's etiquete (adaptability), and therefore he should be taught *Adab* (punched). Every day a number of people demanding right and justice go to him with proper interpretation of religious law (Shara), but he ignores that and takes recourse to mischiefs (Shar). Sometimes he uses force, and sometimes takes recourse to deceit and falsehood. He proudly asserts "I am the *Wāli* (Governor) and the Qāzi has no authority (Walāyat) over me. I have acquired vast knowledge by burning midnight candle, and yet he calls me user of unlawful (hellish) things (i.e. bribe taker). It is unfortunate that the Qāzi with all the greatness of his turban is fated to exercise his judicial functions on this earth and to go to the doors of the tyrant.

The writer has put in a few things before the wisest of the earth in the hope that he would administer justice as Sadr-i-Jahān, would not tolerate such contemptuous attitude with regard to the religious law, and would place every thing before the most just king. First, the aggrieved Qāzi should be given what is justly due to him; then the distressed afflicted people, who have suffered and relied on the Government, should be rendered help because of his strong sense of justice. All this should be fully expiained before the king with the result that the tyrant would be removed from his place with ropes thrown round his neck and he would be carried and paraded like cattle and animals of chase. The rights over Hindus and Muslims which had been infringed upon or misused should be taken away from such people and he should be placed in the *Dārus-Siyāsat* (court of punishment) where blood would be made to flow from his jugular veins so that it may serve as a lesson to all the refractory people and no body would dare to misuse his power in such a manner (II-22—25).

There is an interesting piece which refers to one Maulana Najmuddin who is styled as a Vakil. Perhaps in the 13th century there

vise and investigate into the affairs of the colleges and mosques, congregational assemblies and nuptial ceremony, and every thing appertaining to the administration of justice in such way as not to deviate in the least from the path of Shariat which leads to the meadow of rectitude instead of to the quadrangle of sins. Learned scholars, Saiyids, Shaikhs, Chiefs and nobles, all people, big and small, have to obey the orders of Sadr-i-Jahān Ziaul-Haq-Waddin Abdur Rahman, the sun of learning and administration. He would be the resort of all the oppressed people and decide and settle disputes, simplify and amplify all matters concerning the administration of Justce (II-11-17)

Next to the king, who was the highest court of appeal, there was the chief justice of the empire at Delhi called *Sadr-i-Jahān* who selected and supervised the Qāzis and Sadrs of different parts. Besides his other duties of multifarious nature the Sadr-i-Jahān presided over a special class of criminal court called ***Diwān-ul-Mazālim*** (court of complaint) which heard the cases against the highest functionaries of the state. Such a court had existed in Baghdad and Cordova, Egypt and Persia, and one can presume its existence even in India of the Sultanate period, though there is no evidence of it. In this connection a letter dated 30th Rabi I, 709, supposed to have been written by "Bahār Suqi", the "*Hakim* of the Khitta of Nagore" to "Sadr-i-Jahān (Ziaul-Haqu Waddin Abdur Rahman bin Usmān) says, among other things, the following. "Some oppressed people who had suffered from the tyranny of the unjust people of the empire have put in an application of complaint in ***Diwan-ul-Mazālim***, presided over by "the resplendant light of the faith, ventilating their grievances and explaining the oppressions practised upon them. The un-Islamic (irreligious) ***Wāli*** (Governor) of this region whom they miscall Malik-Islam;—May God stop his mischiefs in the realm of Islami has extended his hands of ruin and desolation to this populous region. Having misappropriated large amount of money and made it frozen he says that the close fisted (stingy) person is worth lakhs, but we say that the fist is not worth even a *Dāng* (Damri) when it is clinched. He has appointed his stony-hearted agents to serve as magnet for drawing the wealth of the people towards their sides and he draws to himself whatever and wherever particles of gold and silver are found, though he knows that the things belong to others, yet he manages to misappropriate them to himself. He finds so many people at his door to place their complaints and their grievances but he never tries to remove or redress them. He is not afraid of death. With strange narrow mindedness he overlooks whatever

says that the essential and most approved of the things in a Qāzi are that he has certain knowledge of the rights of the people; discriminates between lawful wealth and that gained illegally; has the closest view or experience of the conditions of the people, high and low; looks into the grievances of the oppressed ones, and gives support and protection to the ruled against the tyranny of the ruler. He has to observe the judicial impartiality and mete out equal treatment to the rich and poor. If there is a callaboration between false witnesses and monied or influential men like the letters of the word *'Sīm'* he should try to sift the matters and separate the truth from false hood like the letters of *Zar*, and if he should find the smallest amount of money to be due from the defendant, he would have to compel him to hand it over to the complainant. He should appoint such agents or representatives (*Wukala*) to the tribunals of the dominion as are not afraid of the orders of Government, and they should not be such as to make things difficult which are easy and simple. He should support and strengthen the position of his substitutes or deputies (*Nuwwāb*)in the courts of the capital (Hazrat) çities, (Madāian), country-side (Khitat), and small town (Qasabāat) in carrying out the provisions of law and orders of the judicial departments. They should instruct and emphatically enjoin upon them not to allow deceit and fraud of the satanic people to interfere with the administrative affairs and blacken the faces of the pages of papers by issuing false decrees. They should not summarily deal with such matters and give such orders as may clearly distinguish truth from falsehood. They should realise that the *Tankas* (Money) gained by bribery will make their existence feeble and futile like the spider's web, and they should have no concern with those the doors of whose houses appear to be white with their transient wealth. They should remain content with their own lawful acquisitions and adhere strictly to all the rules of the faith and of justice so that they might have a place among the Qāzis in paradise and not those in hell......The foundations of college (*Madāris*) should be decorated with gems of knowledge and not with mere stone walls, and such students should be admitted in those free institutions as are heartily and passionately fond of learning, quite unlike those on whose minds lectures and lessons fall flat. Such preachers should be allowed opportunities to deliver sermons as are capable of reciting and repeating the things of the eternal or preserved tablate (*Lawh-i-Mahfuz*) and not those who know nothing about it. Such trustees should be put in charge of the endowed property as are thoroughly acquainted with, and abide by, the conditions of justice and integrity. The Qāzi should super-

hooks why should the washermen shout 'Si Si' at the demand of half of that. They said that they had forsaken the river side for a long time and there was little to be obtained therefrom. The people had no *Dāng* in their purse for having their clothes to be washed with soaps at the bathing place on the river side. Where they used to wash their *Katān*, linen clothes, lots of fine species of linen were lying heaped up like leather straps uncared for and discarded; and where there was at first fine silvery water, nothing was found but froth and foam. Where they used to wash the winding turbans and fine cotton clothes resembling serpents in coils, there was nothing but green scum on the surface of the stagnant pool and outer-skin of snakes. When I saw that they wore clothes of others and practised deceit and deception in respect of their garbs I moved among them incognito (in every kind of dress) and what had been kept in my heart was brought out to mete out ignominious treatment to them and expose them. They began to tremble like the Kitān (which is said to be rent by exposure to moon-light) clothes and at last admitted that they used the habits of others. I washed the washermen who wash the clothes of every body with the help of the (disguising) clothes that I wore. In brief, I put all those occupational groups who were like worms of water to the greatest strain so as to fulfil the impossible task of taking out the oil from sands and fish oil from water and sands. In short, so much wealth accrued from the treasures of the river that the income which the whole of the public ferry yielded in two years was obtained before the close of one month. *Maḷikul Bahr* (Mir Bahr or the collector of port duty) sent the report of all this affair to him who adorned the cushion of justice. The king sent for me and favoured me with ten desc-like trays of the current coins along with the award of a village of fertile land in the Doab by way of my wages. I had been languishing beyond measure because I was without work and worth; but the great provider of daily subsistence made the Sultan favourable towards me. May God keep Qāzi Jāfar always in the path of canon law, for he has been responsible for providing me with bread and water (II-101-113).

An essential obligation of the ruler—God's agent on earth—was protection of God's creatures through strict administration of justice. He and those to whom he delegated his judicial powers did what was just and right in the sight of God. In a *Misāl* or letter of appointment of the chief judge of Delhi Alauddin is supposed to have specified some essential needs and the extent of his jurisdiction, defined his duties and functions, and enjoined upon all to recognise him and comply with his orders. It

conversant with, such affairs. He also opened his lips in admiration. At first he praised the works, ability and capacity of Khizr and afterwards made some encouraging observations about me, Ilyās, his old protege. He said that although Khizr was a man of auspicious nature for where-ever he went things flourished and there was abundant growth of vegitation and enough of irrigational facilities, yet his brother, Ilyās, had also been always a river agent (*Ghumashta-i-Bahr*) and he had much practical knowledge of the matter and for many years he had remained engrossed in such activities. If the king of the world, the Lord of the land and sea, deputed him to look after the river passages and ferries of Jamuna and the Ganges he would perform this work efficiently. The king sent for me, Ilyās, and made me deputy manager of the fleet of the river boats (*Nayabat-i-Bahr-i-Begi*).

Being so favoured by the court I became busily engaged in the execution of the work associated with the water passages and the crossing of rivers. The boats which had all been assembled in one river were despatched elsewhere to be plied in different rivers and the excessive latitude which had been enjoyed by the boatmen was ended and they were properly controlled. Though there were some complications, they were got over, and the refractory boatmen were suspended and their work was entrusted to others. I made each of them responsible for his work by catching hold of his jugular veins. The fishermen who gathered many Dirhams by catching and selling fishes and exacted money even for the skin of the fishes gave with great difficulty, after making many excuses, out of their entire capital earning, only that much which amounted to the income of two months and kept the balance earned during the 12 months to themselves in their own store (i.e. they gave only two twelve of their earning to the state). So long as there was no one to look after the realization of the water tax, they continued to catch fishes in the rivers and sold them for themselves. They were a set of strange crocodiles who drank away the whole river and made it dry and their own the preserve. They would have wished me, Ilyās, to have come out of the river thirsty, but I was myself very cautious, and I took them unawares and overwhelmed them by throwing them in whirlpool.

After disposing of the affairs of the fish-catchers I turned towards the washermen and found that every one of them amassed 100 Dirhams every week and yet complained shouting, "Si, Si", I asked them when the fish catchers paid some thing more than 60 by applying their fishing

had nourished the life of the soldiers became stale. The roads became more safe and straight like the straight lines on the top of the head of the women where hair is parted (Māng). The veils of chastity were widely worn by virtuous ladies The districts became free from anxieties like children contented in the lap of their affectionate mothers. Robbers fled away from the shadow of wealth as shadow flees from behind the sun. The gigantic elephants have not the courage to tread haughtily in the path of the little ants and the mouth-tied lions have not the spirit to laugh at the unsteady frolic of the lame deer. Night and day he (Sultan) has no other work than to provide comforts to the children of Adam (I-20-22).

In view of the extremely rare or meagre data about the methods employed in the 13th century to improve the productive quality of land by providing irrigational facilities and about the sources of revenue other than the usual ones, the followfng description, though fictitious, despite the date given, I Jamadi 1,712, is not devoid of significance for a student of history. It tells us about the digging of wells, tanks, reservoirs, streams, and use of water wheels and the designation of persons employed to look after such works and to collect duties on river side from fisherman and washermen. The state share of fisheries is said to have amounted to 1/6th of the earning of the fish-catchers and the washermen were made to pay half of that, i. e. 1/12th. One, Ilyās, the *Ābdār* (keeper of water) says "I have been busy these days in digging the earth and excavating reservoir, from where water flows like silver, and in every place, and on every roads, and near every mausolium, wells and ponds have been made for the use of travellers My brother, Khizr, had been honoured as Malik *Sharabdar* and was orderd to take the works of constructing gardens, and running streams in lands which had become denuded of water on account of natural calamities so that people might make use of them and enable others to derive enjoyment from their verdure, shade and produce, and also that every day heaps of fruits and flowers might be sent to the elevated court. The king has also bestowed special favours on him and has appointed him to look after and supervise the works of the gardeners and well-keepers so that the works of digging of wells and streams and utilising the wheels for drawing water (*Dulab*) might be managed efficiently and every seeker would have a cup of water very easily". It is good that a brief account of this irrigational work has been sent to the royal court and has evoked the pleasure and appreciation of Alexander II. It so happens that one day some hints of this state of things was dropped to Qāzi Jāfar who is himself well versed in and fully

"In matters relating to diffusion of justice and welfare of the subjects, he has, by his illuminated intellect, formulated rules and ordinances the like of which could not be reflected in the mirror of Alexander's imagination, and could not be seen in the cup of Jamshed. To ensure the cheapness of foodgrains which are the leaven of life's sustenance he had, by his own balanced judgement, devised a kind of scale of regulations (i. e. fixed standard of measurement and price rates) because of which, if for years the clouds wandering round the sun do not pour the sweats of their brow (it does not rain), the hot tempered wind does not wave or move its fan, the red-faced soil does not grow any green verdure, and the fire-kindling sun fails to ripen the crops, even then the common multitude would still get ready (fresh) food from special royal granery (i. e. he had laid down the rules that a certain proportion of the yield of the crop should be kept in reserve stocks for the emergent situation). As regards the other essentials of life of the common people, even if they be the red sulpher or white ruby they were made both cheaper and more easily and abundantly available than the yellow amber and insignificant berries. Moreover, wealth which is the elixir of desires (Ultimate objective) and the treasure-house of cherished aspirations, has been gathered out of the elephant-loads of gifts and the abundant charities, and there is no difficulty felt by any body in making purchases. As a result of this convenience and comfort and prosperity have become quite visible in the country. The poor people are living happy life as sparrows which get their share of grains from every garden" (I-19-20).

This is followed by a short account concerning "sovereignty, safety and security." The Divine Ordination wrote the mandate, "I have made you my vicegerent on earth" and decreed that "you should be the ruler and adjuster of affairs, and I selected you to administer justice", and according to another Quranic expression "Verily God gives you order to govern with justice and benevolence" the good fortune, felicity and prosperity of the subjects made them exceedingly happy and contented with his administration of justice. On account of their excessive joy they kept nocturnal vigils. Owing to general peace and security that prevailed all the weapons of war were lying idle. The skilled archers washed their bands off their arrows and the overzealous warriors of the faith have closed the aqueducts to the flow of blood from their daggers. The swords of the faithful which were cleaner than the hearts of the orthodox Sunnis have become rusted like the rusted iron hearts of the Hindus. The sweet provision of the Turks (Tatar Chai-Turkana—a kind of sweet-meat) which

erected up to the sky. Those cities which had been levelled down by the assaults of the Mongols and which had been deprived of securty and comfort and had become completely bereft of elegance and gaiety became so populated again through the helping hand of the caliph of many borders that if they raised and pointed their fingers towards any place they would not but find mansions, galleries or balconies. (I-14-17).

Relating to 'peace and victory' he writes further "Lo and behold the spreading of the carpet of peace and security over the whole dominion. From the fort of Dehli to the courtyard (area) of Khorasan a carpet of ruby-coloured satin has been laid with the blood of the red-faced Chinese and, consequently, all tumults have subsided, mischiefs and disturbances have ended, and the mischief-mongers have been made to roll down. In that direction the mountain-like armies of Chinghese have been driven beyond the oxus river by the stormy wind of His Majesty's dread, and, on this side, the powerful Rāis of India who, with their thousand elephants used to trample down the ranks of the Turks have not only been forced to surrender thier elephants and wealth, but some of them who had still held their heads high have been crushed in such a way as to throw thier heads like oil cans under the elephant's feet. And with the oil of those cans the stiffness and roughness of the elephant's feet has been removed by being greazed. Some who had laid thier heads low before the columns of the state threshold received the privilege of being favoured and trained for riding on the elephants (I-18-19)

We next come upon a very important observation indicative of food and tariff policy of the Sultan. Emphais has been laid in it on three things of which the food grain was the first. The Sultan devised a plan to lay by every year the produce of the land in the royal stores as a safe-guard against the occurrence of famine and drought. Secondly, he made rules by which essential goods and even costly commodities were made easily and abundantly available at cheaper rates to the people. By his planned regulation consumer's goods were controlled. Thirdly, he managed to keep the exchequer filled up by getting money from the different sources of income, including charities and voluntary gifts. The necessary consequence of all this was that every one in the state was in a position to a confortable life. The short relevant extract which may be compatible with the detailed description of such measures as have been given by the historian, Barni, opens with the heading "Care taking of the common people"

their treasure gradually and little by little, sometimes to ward off the evils and calamities from them, and sometimes to gain glory by following the dictum of the Quran "give Zakāt" in order to protect their planets of existence from the burning onsloughts of the Divine warning." Their foreheads and sides will be branded by them (gold and silver). If the wicked saturny people (high way-men) have an eye on their annually earned wealth and want to snatch it away from their powerful hands they are put in chains by our pleiades-studded swords. As regards the poor people and way-farers of different directions who travel a long distance on their foot and injure their feet in the hope of getting my favours, I help them sufficiently from the treasure of my munificence so that the palm of their hands may acquire a red hue by holding the jewels in their hands (IV-115)

This is followed by similar observations regarding the grants of favours and encouragements to saintly and pious personages, teachers of deep and sound scholarship, and students who dissolved the marrow of their brains and the tallow of their pupils, and in enkindling the lamp of learning, burn out the candle of their lives (IV-116-117).

Amir Khusrau has given his own estimate of the achievments of Alauddin Khalji under various headings. After bestowing many grandiloquent titles on "Alauddunia Waddin Sultan Muhammad" such as "the sun of caliphs and the Sultans", "the shadow of God on the two worlds", "the defender of the community of Muhammad", the commander of the faithful etc. and praising his "black parazol", he writes about the chastisement of the Mongols. The clipped-headed ones who every year brought the chains from Tamar Qiq to take away captives from India were themselves either cut down by the sword or were sent in chains to the hell. Some escaped the sword by being enchained and their lives were spared. Although continuous enchaintment meant their virtual liberation, some dare devils being puffed up with their power and strength, broke their chains and raised uproar and disturbances. The command was issued that some of the Tamans (who commanded ten thousand) be thrown from the battlements of the fort down into the river and drowned, and the rains of blood were made to pour on the ground from the necks of the other Tamans, and their berry-coloured bodies were buried in the earth so that from these seeds red-hued men and Tatari sweet basils may sprout up. Afterwards, out of the heads of those dogs of Mars towers were built up. In other distant parts of the kingdom similar towers were

Next, Amir Khusrau makes the Sultan express his attitude towards the general public and some special classes of people "I fasten tight the five fingers of the ever-mighty people, who twist the necks of the subjects with the thin-most (nicest) hair of justice so that the bad blood which has accumulated and is running in their veins by eating the blood and flesh of the oppressed people should coze out of the tips of their nails. (IV-112) I have deputed ardent and zealous informants and agents and sympathetic scouts and spies to enlighten me about the afflctions and misfortunes of those destitute and unprovided people in whose dark cells there is neither fire in the day nor lamp of light in the night so that I may issue parwana (command) for burning the flame of (infusing) hopes in their hearts by firecoloured gold and extinguish the fire of their stomach with the water of favours. The iron hands of the industrious artisans and professional workers are key to the doors of their livelihood. My thoughts are always rivetted on opening them in order to seize the first opportunity to get access to them. Every drop of sweat that falls from their brow becomes a pearl for the saying "one who earns is a friend of God" (is the inscripition on the Dirham earned by the sweats of their brow). Gathering a few pieces of coppers around them they turn them out with the help of those silvery Dirhams (sweats) into wonder-drug (Kimia) of livelihood in the from of golden breads and bronze cakes (girda) and they place these in their clay plates and wooden bowls. I send sympathetic chiefs towards them so that if the fixed tax or duty levied upon them comes up to one Dirham annually it should be made light and collected as lightly as the petals of flowers. The hopeful cultivators dig the earth and saturate it with the drops of their sweats rather than those of the rains and sow pearls on the ground with every drop from their brow. They come out in the form of fruits and produces. As in the sowing ground (corn fields) of the world the reeping of the corns is better than other good deeds, so in estimating the share of the state for the official granary (Khirmān-i-Takhsis) I make the wooden beam of the pair of scale from *Alif* Insiaf (justice) and *Nun* of the sides (palla) of the weighing balance serves the purpose of my equity, and I take the legal share from the place of the cultivated produce and fill it up in the store house of the judgment day so that it may serve as my provision in the future world (IV-114-115).

Each one of the world-roving merchants whose desires are laid bare of their coverings by the heat of the sun, plies his trade from the first to last of the month so that the empty purse may be filleu up in due course by the help of their skilful hands. They use whatever they collect for

ing none of my victorious army must tread and trample the cultivated fields of the village peasants with the hoofs of the horses nor must any of the grass suppliers take even a blade of grass and straw from the thatched roof of any villager (II-7).

For the 'Ashāb-i-Zimma' (protected non-Muslims) who have tied their necks of submission with the strong string of the religious law and have entrusted themselves to our charge and care I have stretched very far (given full lattitude) the strings of the subsistance (regarding avenues of earnning their livelihood) in such a way that they should not be involved in agonies by entering into competition (Kashā Kash) with their rivals (Munāziān) (IV-112).

If the rigidity of their views, indicative of the sense of the text "We follow the path if our fore-father's", is so deeply imprinted on their souls and serves as an amulet in the veins of their neck and can in no way be removed from their crooked nature, but they are prepared to bear the burden of responsibilities on their shoulders (i.e. if they pefer to be Zimmis to the abjuration of their ancestral faith) you should allow them to enter the circle of (guarantee) their safety and security. They must be submissive and should not show any sign of hostility and antagonism. (They know) that if they do not do so they will severely be dealt with by the sword and thoroughly punished....The aforesaid group of people know that their welfare lies in abstaining form all kinds of mischiefs and shunning all such acts as may tend to mischiefs and disturbances. They should be like those virtuous people who, what to speak of committing sin, even avoid all occasions of association with the sinners. At the time of the demand of Khirāj and Jizya (tribute and poll-tax) they should show such aubmissiveness that if they demand the water of their eyes they are prepared to part with the greeze of their pupils, and they are readily responsive to the system to such an extent that if their big men (leaders) be ordered to get into the rat's hole they would run towards it and creep into it (IV-139-140). This is followed by the advice given to Prince Farid to give complete protection and safety from the sword to the people of south when they surrendered the reins of their loyalty and submission to his hand. The views expressed here and by Barni in his history though reflecting the attitude of the contemporary Muslim Divines can hardly be said to be in complete conformity with the Quranic injunctions, for any thing taken or done in excess of that which is laid down is forbidden.

and given him superiority due to his own inherent qualities and not because of accident or freak of fortune; and enabled him to attain a kingdom for which others after him might not be as worthy or deserving".... When my dignified personality attained this sublime rank or station, the fortune of forethought made me sit, knee to knee, with others in the way of counsel and consultations so as to see what real picture of happy issues regarding regulation of the affairs of the world and amassing of treasures for the store house of the future world becomes clearly visible by placing two mirrors face to face (for thoroughly understanding of one another).. Then it became quite apparent to me that whosoever occupies the throne, it becomes incumbent upon him to irrigate the garden of sovereignty with the water of the stream of religion; to draw all around the dominion a circle so that the demons and devils of evils and mischiefs may not have access within the ring of Solomon and their shadow does not fall on human beings or genii involving them in calamities and dangers; to spread the sheet of the parasol of God's shadow so far and wide as to bring all those who are stricken with the sun of misfortune under Divine shade; to enforce his command in such a way as to put iron (strong) reins in the mouth of the oppressive man-eaters so that the nerves and limbs of the common man may be saved from their tearing rending teeth, just as the saying is "if there be no Sultan the people will devour one another"; to spread the carpet of justice over the whole of his large kingdom in such a way as to make all the mischief makers go to sleep for ever leading to the cessasion of all uproars and tumults; and to level down the steepy pointed hills, murderous glens and passes and thorny brambles and bushes for the march of the huge army in such a way that all the ups and downs in the expansive kingdom are put right and made easy and comfortable, and the face of the earth becomes plain and free from all mean minded, refractory and undesirable persons (IV-104-107).

Here are some ext.acts regrading the protected non-Muslim subjects "As regards those who have come under my care and protection (Zimma), I reagard each and every direction of the holy book which says "verily God commands you to be fair and just and benevolent taowrds those who come under your protection to be the best and the most advisable for the faith and the state, and I follow scrupulously every letter of the Divine ordinance "Be loyal to the behest of Allah and be kind to the creatures of God", and I consider this as the preamble of the book of government and administration. My definite order is that while march-

popular tradition that "Had there been no Sultan some people would have devoured others", meaning thereby that there would be fight and faction and no peace in the absence of a binding force among the people in the shape of a strong ruler. He attributes the way and methods of consultations and deliberation (Tariq-i-Mushāwarat) to the contemporary Sultan and tells us about the rights, duties and responsibilities of the ruler. There are some striking features. There is nothing to show that Alauddin or others thought that religion had nothing to do with politics. Emphasis is laid on carrying out the behest of God in regard to different classes of people—hard working peasants and artisans, merchants and wayfarers, scholars, teachers, students, pious and saintly personages etc. and above all the "Ashāb-o-Zimma" or non-Muslim protected subjects. The reference to matters concerning the livelihood (Maīs shat) of the Zimmis and assurance of protection against open competition with their rivals is worth noticing. But elsewhere (IV-140) what he writes to his son about the Zimmis recalls to our mind the relevant dialogue between Qāzi Mughis and Alauddin. Another thing which attracts our notice, in view of the age in which the book was compiled, is that the Sultan placed himself before the public for testing and examining him regarding the government and administration. "Tā Jāyeza Ulul-Amr-i-Minkum Az Farmān-i-Man Hadiya-i-Lauh-i-Paishāni-i-Tābian-i-omur-i-Mulk-Dāri Gardad" (so that the examination of my claim to be the person meant by the expression "those who are in authority amongst you" may be found writ large on the forehead of the subjects of the State (IV-102). He had to abide by the law of God. But there is no reference anywhere through out the book as to what would or should happen in case he failed to do so. Allowing the need for some discreet concealment on the one hand and exaggerated laudation on the other, it is probable that Amir Khusrau had his own misgivings about the ways of the reigning kings. Among the counsels to one of his sons he says "one should not rely on the caressing (favours) of the kings for they are like the sun which gives lustre and takes it away——Beware ! verily, a man of sound sense does not rely on water and fire and on one who commands" (i. e. the king) (IV-265).

The relevant extracts from a supposed Farman of Alauddin are as follows:— "Praise be to God who has given this elevated position to the states for the exaltation of the faith of Muhammad; has made it a special privilege of the Sultan to rule over the lasting kingdom, and has made him occupy the well-laid seat of honour of the canon law which is valid for ever; has distinguished him with the special eminence and excellency

among themselves). There is no conception of kingship or autocracy or any acquisition of Divine sanction in the Islamic scriptures, and Islam does not recognise any sacerdotal or ordained hereditory priesthood, any ecclesiastics or theologian who was appointed by a divine or superior authority and whose interpretation of the canon law was infallible. Any body who is well-versed in the Quran and Hadis can interpret the Divine ordinances as laid therein and assist the ruler in enforcing them. Neither the ruler is a Devaputra nor those who perform the priestly functions are different from ordinary human beings. It is not fair to suspect a theocracy in Islamic sovereignty because there is no direct intervention of God in the affairs of the Government and society and the Shariat and Zawābit law are not quite like those of the ancient jewish community. Obedience to the Amir or head of the state is mandatory, but a safeguard against autocracy has been provided for by the necessity of consulting in the transaction of all political business. Obedience to God and to Prophet is incumbent on the rulers as on any man. Those rulers who do not obey God and the prophet will forfeit the right of being obeyed. Though all ultimate authority rests in God and not in the people, His agent upon earth is not utterly irresponsible for, while acting according to His revealed will, he has to consult "men of the sword" and the "men of the pen" who are the chosen of the community, and he is never authorised to set aside or go beyond the injunctions of the Shariat law and ignore certain established usages and conventions. Explaining the Quranic words "if ye differ in any thing among yourselves refer it to God and His Apostle, if ye do believe in God and the Last Day", a modern translator and commentator says "where, in actual fact, there is sharp division between law and morality, between secular and religious matters, Islam still expects secular authority to be exercised in righteousness and on that condition enjoins obedience to such authority. Righteousness as an essential principle or qualification of a ruler has been stressed in the Quranic command". "To do virtuous deeds and to refrain from forbidden acts". (Yusuf Ali's translation of the Quran).

Amir Khusrau quotes the Quranic verse "obey God, obey the Apostle, and those who are in authority from amongst you. "He is conscious of the change that had come with the changing times. It was the historical reality in his time and country that the centre of authority holding actual power in the state was the majestic personality of the Sultan rather than of the caliph of theoritical speculation. He realised the need of a strong and effective ruler and quoted more than once the

POLITICAL AND ECONOMIC FRAGMENTS FROM RISĀIL-UL-IJAZ OF AMIR KHUSRAU

In a paper read at the Ranchi Session of the Indian History Congress an attempt was made to glean from Amir Khusrau's Risāil-ul Ijāz some matters of political and historical interest. There is, however, much in this voluminous prose work of the 13th century versatile writer about his thoughts and feelings, views and impressions of the pervading atmosphere which is well worth the attention of those who are interested in the political and administrative history and want to know something about economic aspects and social behaviour of the people of that distant age. Literary glimpses of life and conditions, political, social, economic and religious have got their limitations, and this is especially the case not only with the factual inadequacy and narrow political approach but also because of the luxuriant verbiage, verbal nicities, and pompous complicated phraseology of Amir Khusrau's style. They can not serve as a safe basis for historical deductions, but we may take them as reflecting the spirit of the age, and at any rate, the way of thinking of one who was himself a writer of historical Masanavis and a notable historical personality.

We may begin with what Amir Khusrau says and puts forward on behalf of the greatest of the Khalji Sultans about the principles of State, policy or methods of government, and his claims and achievements to ensure peace, justice and prosperity in his widely-flung realm. It would be interesting, however, to know how far what Amir Khusrau writes about the system of state-craft was in accord with the political thoughts of orthodox Islam of the medieval age. According to the ideal envisaged by Islam real sovereingnty belongs to God from whom all authority flows to man who is the vicegerant (Khalifa) of God on earth, and is capable of executing the will or command of God in the form of Divine or canon law called Shara. Islam requires that the ruler should be just and merciful, the ruled should obey, and there should be counsel and consultation between the two for there is the principle enunciated in the revealed dictum "Amrahum Shura Baynahum" (Their business is to consult

Wa Saktah Az Ahano-Sang" (It was a realm and not a mere fortress, and was full of manly valiant people. It was sky high and built in the air and was-made out of iron and stone) In Chunin Qila-i-Mahmud Jahandar Giraft-Ba dilairi was Shujaat Na Ba makr-O-Nairang. (Such a fort was captured by Mahmud, the world-possesser, because of his intrepidity and valour and not through subterfuge or unfair manoeuvring) "Girda-i Yu Baisha-O Koh-i-Kishan O Sabz Chunank-Guzare Bad O Rah-i Mar Daro Na Khush-o-Tang (Round the fort was dense forest and chain of hill like mounds full of green vegetation. The density was so great that neither the gust of wind nor even a snake could creep through it). We need not consider here the problem or theories of the origin and derivation of the name of this ancient locality.

for some notice. Cloves could be had from the south and east and taken to the west; but saffron, if grown, as now, only in Kashmir, could have been taken from the north west to the eastern regions and not vice versa. If Cámbodia, Indo-China and the islands of the Indian archipilego had saffron producing tracts there was the possibility of saffron being brought to Bihar from there and conveyed thence to Agra.

Should we take the whole thing as a figment of the author's imagination ? But this can not be said about the reference to Agra which is said to have owed its importance, if not its existence, to Sikandar Lodi of the 15th century. The earliest Persian chronicles of the 13th and 14th centuries are completely silent about it, but it was already a place of considerable importance and had a great fortress in the time of the Ghaznawads of Multan, Lahor and Jalandhar.

Note :—The earliest reference to Agra in Persian literature is found in the Diwan of Masud Saad Salman (D. 515-1121), a courtier and panegyrist of Prince Saifuddaula Mahmud, a great grand-son of his celebrated name-sake, Mahmud of Ghazna. He obtained the Indian viceroyalty from his father, Sultan Ibrahim bin Masud (1058—1099 A. D), in 469=1079. His *Qasidas* contain some new information of historical value We are told that soon after his appointment he marched at the head of 40 thousand troops from Ghazni and embarked on a career of conquests in Hindustan. King Jaipal's strong fort of Agra which had never felt the weight of Muslim arms and was described as "Doshiza" (virgin) was undated.

Jaipal described as "Amir-i-Agra" had a frightful dream and offered to surrender and pay a huge amount of 'Tankas', but he was not spared and the fort was taken after two day's stiff resistance on Nauroz day (New years' day). There is an interesting line in one of the Qasidas which shows that the Lahor-born poet was familiar with the Indian or the Hindavi tongue "Cho Raad az Abr Bagharrid Kos-i-Mahmudi-Baramad Az Pasay Diwar-i-Hisn *Mara Maar*" (p. 265) i. e The drum of Mahmud roared like thunder from the cloud and from behind the walls of the fort the cry arose 'Mara Maar'. Some of the verses give an idea of the region and the site of the fort "Mah-i-Nauroz Digar Bar Ba ma Roo-way Namud-Qila-i-Agra Daravurd Malik Zada Ba chang" (The Nauroz festivity has again shown itself to us,—the fort of Agra has been captured by the king's son). "Qishwar-i-Bud Na Qila Hama Pur Mard-i-Dilair—Bar Hawa Bar Shuda

addressee, worthy of respect attention, would make the impossible possible so as to lead to the recovery of the lost money, and no amount of pretext would stand in the way. A small sum of a few *Tankas* is being sent to meet the expenses of the road-watching officials (Shaghl-i-Rasad). Although the attainment of the object appears at present to be doubtful, there are hundreds of people, in the headquarter of the addressee, who can advance some money. At the expiry of the current year, and within one month after, that a small sum in instalments having been collected might be deposited in the *Baitulmal* (State Treasury) For the humble slave, Hasan, this amount may be taken as a loan of magnanimity (*Qarz-i-Hasana* i. e. lent without interest and repaid at the pleasure of the borrower) and the whole matter may be treated in such a way that there is no noise or publicity about it (II-318-23)

References to trade by land and sea, some imports and exports, are not wanting, but there is no clear information about the organisation of commerce and means and modes of locomotion and transport. We are told about a class of wandering merchants who travelled in Caravans, for the sake of safety, conveying their merchandise from one place to another. But they could not escape the onslaughts of robbers and high-way men who infested the roads and routes and waited in ambush to pounce upon the Caravans at opportune moments. A Caravan of Tambulis, carrying loads of betel leaves, was proceeding from Gujrat towards Delhi. To escape from the obligation of paying the usual tax or duty (Baj) on their goods, they had changed their routes and were passing through a thick jungle. When they had reached a place which had two old and deserted wells they were suddenly waylaid by a band of *Rawat* horsemen of *Jalor* who killed and wounded all those who resisted the plunder of their goods (II-249-50)

No less interesting is the case of a Caravan which was proceeding from Bihar towards Agra, and was carrying cloves and saffron leaves (Qaranful Wa Shakh-i-Zafran) in their bags. When they had passed through the mango orchards of Ambi and had come near the forest of Chandrnath (which was infested by robbers), the aroma of the precious commodities had spread and saturated the atmosphere. Getting the scent the robbers quickly rushed to the place like cold boisterous winds of autumn and stripped them off everything leaving them like the withered trees of the autumn season (I-156). Two things in this small piece call

gold flowed they might go to China and Cathay and blacken those regions by their nefarious deeds. They pretended to be on terms of friendship with the people, big and small, but ruined the foundation of their prosperity. Resembling them was a Hindu named Khanna Abegi who dealt in chips and rubbish and allowed himself to be led wherever they wanted [to push up their business. They sold lettuces at the rate of cloves, and the people with wide open eye were so blind as to fall into the pit (pit of perfidy). When they entered the city they encamped near the mint place (Darul-Zarb) The writer exchanged greetings with them not yet knowing that they had perfidious hearts. They poured silver like water and overwhelmed their new acquaintances with favours They were more critical judge of men than the writer,for looking slyly at his face theealised that they could exploit him to their advantage. One day they represented that they had some jewels in their possession which they were afraid to bring out lest they might be robbed of them. They said that they were in need of one thousand Tankas, which they would invest in business, and when their business prospered they would return the whole amount. Falling a prey to their deception he gave them all that he had accumulated by undergoing many pains and facing many difficulties. The sharp (Arabic speaking) tongued people posed that they had taken the money on credit and they promised to return the same after a month. But even after the expiry of 6 months they failed to discharge the debts.

If an appeal is made or recourse had to the religious tribunal (Diwan-i-Shara) they would negotiate and fill the ears of the *Qazi* with the jingling sounds of gold *Tankas* so as to prevent him from hearing the evidential words, and they would so seal the mouth of *Amir-i-Dad* with *Adali* coins as to make him unable to speak out the truth. In power and resources they are like hills and our words with them are like winds (having no weight with them). But for the support of a *Farman* from a powerful authority which can make the mines yield jewels hidden in stones, it was not possible to bring out the (misappropriated) money from them. As in all matters pertaining to the broken-hearted weak ones, nothing can be done by way of allaying and soothing them without the help of the big and strong ones, it is earnestly requested that the cause of tyranny may be treated with firm authority so that whatever was the stock of comfort of the writer and has gone into the grips of those powerful ones might be brought out of their hands intact. Although their grip is hard and strong like iron a severe action would break it, and the *Farman* of the august

essentially legal provisions for four brides. There is an over flow in the market. Well-decked and well equipped slave girls with carriers of burden and other paraphernalia can be had either for ten Tankas or for twice of twelve. The garments and clothes are also very cheap. One can purchase at the rate of one yard for two 'Diram-i-Rikabi' cotton of such fine thin and delicate texture that if the turban-wearer wraps his head with a hundred yards thereof his hair will be visible from under it You can guess the cost of other clothes. Fruits, food, and vegetables and the other essential commodities for cooking and eating are as plentiful and easily available in the shops and streets of the market places as books of the students and the Musalla of the mystical people (IV-173-4).

Whenever any market man finds a chief or leader (Rais) he cries and cringes and when he has to deal honestly with the Musalmans he becomes indifferent. The merchants of black deeds have no capital except that of their black faces (or interest). The cloth merchant should be made to learn the straight procedure (dealings) from his straight measuring yard, and the grain merchant from the perpendicular shaft of his balance which never bends and is never curved. The money changers who make bad coins good can never make their hearts good. There is a difference between marklist-dealers or traders who make a profit of one out of ten and contented traders of the ultimate end (Ma, al) who make a profit of ten out of one. Although the dealer in gold weighs it on the balance made of brass and the monopoliser of grains (Muhtakiran or regrator) weighs the brass on a golden scale, if you look at things closely you will find the absence of 'barkat' on the scales (pallas) of both. The jeweller should not be compared with the grain merchants, and pure gold should not be weighed on scales made with the help of skins. The weaver and the makers of gauze fabric are co-professionals, and one is the copy of the other.

The profiteering and unscrupulous character of a set of foreign merchants has been exposed in a fairly long passage the substance of which is as follows : "Hasan Mazarib (a factor or manager) who was a citizen of Delhi wrote a petition to a high administrative official whom he addressed as Malik-ut-Tujjar (prince of merchant). He sought his intervention for the recovery of the amount from a group of deceitful foreign merchants, who had travelled widely on land and sea, and having visited Syria, Euthopia, Zanzibar, Egypt, and Madain had come to Delhi, the flourishing capital, so that after a clean sweep of this city of Mint through which streams of

Dirams. Although in the eyes of the people such a pearl was of no value yet on the day of Resurrection it would be of no less in worth and value than the real pearl. On the whole, all these artisans are content with their small wages, but they contribute to the well-being of the state and put the seal of the saying "the labourer is a friend of God on the coin of their honour."

The picture presented of the poor cultivators (Kashawarzan-i-Miskin) is not different from what we find today. With sweats trickling down from his fore-head, he tears open the field with his plough (juftawan); waters the dry and parched soil; sows the seeds which sprout, one into thousand; removes the rubbish, roots and grass; plies his sickie (Badas) for cutting the ready corn, say of shali paddy or wheat etc; removes the grains from the straw; makes them ready for the handmills for grinding, and thus provides food for many 'other' people.

That the state was not quite oblivious of its duty towards the painstaking peasants and professional workers (Peshwaran-i-Ranjkash) is indicated from an extract in the alleged letter of Sultan Alauddin, written in the year of his accession." I have deputed smart and kind informants and secret agents to enlighten me about those poor industrious people who live in dark corners without much provisions, with no fire in the day and lamp in the night. I have issued the Parwanas so that with fire-coloured money they may inflame hopes in their hearts and extinguish the fire raging in their stomach with the waters of favours. ...Their iron hands are keys to the doors of their daily portion ...The cultivators dig the earth and saturate it with drops of sweats instead of those of the rains, as a result of which they get the produce ...As regards the harvest reaped and piled up in barns, in estimating the share (of the state) I shall make the post of the balance from Alif of Insaaf (halves) and from Noon of the scale of justice; according to this measure, the legal share will be taken by me from the place of the cultivated produce; and I shall store it in the, granary for the Judgement day.(IV-114-5).

We get interesting references to trade, internal and external, to markets and cheapness of commodities, and also about the dishonest ways of the shop keepers and dealers in trade and craft. "In the market place people, on account of over-crowding, jostle against one another.... and higgle and haggle like the disputing, turbaned theologians. Goods and chattles are very cheap, so much so that ten Dirams will suffice for

to them. A method of achieving this purpose was that one should put the crown of superiority off one's head and follow in the foot-steps of manly people. He invokes the blessings of God on the hands of those tradesmen and artisans (Kasiban), who earned their bread by lawful means. He refers to the leather workers and says that they picked up with their teeth of wisdom the salt-saturated leather for making shoes and stocking and by their actions they contributed to the good and comfort of the people, and at the same time earned their bread lawfully and without adopting any inadmissible methods. Verses : The biting of leather for the sake of lawful bread is better than eating the mutton of sheep (Dumba). The tailoring profession is commendable in the eyes of far-sighted persons because the worker spends his life in sewing garments which cover the bodies of men. The wages that the workers get is well-earned provided the linen supplied or portion thereof was not misappropriated. By cutting away portions of cloth he cut the curtain away from himself and exposed himself to his fault finders. The shoe maker's bread was more lawfully earned than that of the dishonest tailor The Kafsh doz (boot-maker) tears his leather to provide foot-wear to people but nobody tears his own skin. While the Khaiyyat or Darzi with his double tongued scissors tears the cloth of others and obtains a patch for himself from the cloth he cuts. Therefore one who wants that on account of one's ill-gotten money one may not have to rub one's hands of grief on the day of Resurrection (IV 272-273)

References to many other professional workers such as cooks (Tabbakhan), bakers (Khabbazan), confectioners, (halwaiyan), potters (kuzagaran), carders (rismantab), butchers (Qassaban) carpenters, (Najjar) fishermen (Mahigiran), snake charmers (Margir), jugglers (Mushabbad), painters (Naqqashan), grainmerchants (Ghalla Faroshan), woodcutters (Hezum Kashan), goldbeaters (Zarkoban), distilars (Kalal), cultivators (Muzarian and Kushawarzan), though not devoid of interests, may be passed over. But it is difficult to ignore what our author says elsewhere again on 'Muhtarifa' (IV-172). "The Artisans who earn their livelihood by lawful means, include some who, by means of their needles, make blossoming flowers; some who by digging into quarries bring out gold; some who earn their lawful bread through the use of pig's hair in which however, there is no trace of illegal earning; and some who while labouring at bricks and stone drop shiping gems (of sweats) from their fore-heads and get in return for those shining pearls only a couple of

in making bows from the glues of the fish. A certain embroiderer employed his needles so nicely as to make flowers of gold blossom. One of the tailors was so expert with his scissor that he could split a hair into two and could stitch with his needles two hairs into one, and another old one whose white flowing beard resembled fringe of a woman's scarf was so skilful that when called upon to repair a rent, split or fissure in the garment he could produce an embroidered quilt out of it. There was yet another who besides the wages that he got for sewing has for himself a portion of the cloth and out of the misappropriated piece he could make a kneepan (Miyan-i-Izar) and a breast cover (Sangatu) for his wife. As regards the cap makers, some were made so light that they could be blown off the head by the sweet breeze, while others were made so heavy and were so awkward looking that they had better be thrown down on the ground. There were fine looking eyes-staggering boots and shoes, and also those whose bad soles made the feet swollen. Some were so bad that the proper place for them was not the feet of the customer but the head of the maker. The goldsmith was a master of manipulation and was expert in taking out a portion of the gold by heating it and using borax. While the wages of the 'Baqqal', 'Sarraf', 'Bazzaz,' have been exposed, those of the weaver (Jolaha), as a whole, have been favourably commented upon. They make fine fabrics out of the yarn spun by them. Their honest labour at their looms and the implements and materials they made use of have been referred to in many places (IV-57-6).

Though a member of the upper order and one who moved in highest circles, Amir Khusrau was ever-conscious of the dignity of labour and he has shown in unmistakable terms his sympathy for the common wage earners, peasants and labourers. He has commended the professional artisans who earned their livelihood by lawful means but has not spared those given to corrupt methods. He says that the trade and professions were the magnetic means of livelihood, and slackness and indolence led to the uplifting of hands for begging. To pour the quick silver (sweats) from the silvery fore-head is to attain the alchemy of lawful gold. He has shown his dislike for such professions as the manufacturing of the weapons of wars which though a lawful means of earning livelihood was related to power and authority of kings and nobles who were intent on wounding and killing. The professions not approved of by Islam should be avoided, and such professions should be chosen as might conduce to the comfort of the common people and not mean harm and injury

on fine silk. A man of piety is one who has no ego and Darwaish is like the sun which spreads its light over the whole world. (IV-33-35).

As regards the Ulamas our author distinguishes an Alim-i-Rabbani (Godly) from an Alim-i-Muzawwir (Knave and cheat), the former being likened to sun and the lamp and the latter to the glow worm visible only in night and looking like a lamp, The big twisted turban on the head of an Alim has been likened to the coil of the dragon sitting on a treasure. The turban-wearing ignorant fellow has been compared with the donkey of the washerman and the ox of cloth merchants. One who is an expert in plausible explanations of things has, says our author, a serpent hidden in his vest. A useful Alim (teacher) is like a water which is pure in itself and purifies others. The learned man who is given to practice more than precept is like a treasure keeper who constantly adds to the treasury. And one who knows but does not act is like a box full of books and a wall full of carved engravings. The learned man who hunkers after unlawful food and is accustomed to plausible and deceiteful explanations has been condemned as one who burns the Mushaf (Quran) and cooks the flesh of of the hog

Amir Khusrau then proceeds to tell us of three types of people, commonman, those who take to reading and writing, and those who actually produce written works, The first is like a river from which the thirst is not quenched. The second is like an earthen mug (Kuza) full of water or an ewer (Sabu) or a jar (Khum) or a pool (Hauz). Whatever lies in all these will ultimately come out and every drop of water being finished they would all become empty. But those who write and produce books on whatever subject they have specialised in are like a shining stream which is not exhausted by drawing and expending therefrom (IV 35-37).

In a section entitled 'Muhtarafa' (artisan's profession) we find a similar emphasising or exhibition of differences between things and artisans, good and bad, skilful or otherwise. There are references to various classes of professional workers such as cap-makers, shoe-makers, tailors, weavers, balcksmiths, goldsmiths, needle workers and embroiderers, makers of bows and arrows, cloth-merchants, shop-keepers, money--changers. Khawaja Daud Ahangar was an expert and industrious blacksmith. He made very fine springy and flexible swords. He used the fire to convert iron into water, but he every day blackened his face by manufacturing implements used for inflicting wounds. Sayeed Kamangar took great pains in his profession as a result of which he had attained perfections

were wide open. When I went upstairs on the roof my head began to reel and heard the voice, of angels. When I looked down on the ground I had a panoramic view of the whole tract from Siri to the Jamuna for the moment. I lost my thirst and hunger but ultimately gave myself up to comfort and easeloving. Next day I wanted to pay the rent of 12 months to the special slave girl who was incharge of the house but she refused to take it saying that she would accept it if her master allowed her to do so. Some days passed and when they saw my sufistic disposition a small group of wickedly mad people including the son of Tamar Khan who had occupied the house and who had never spent a day without wine and women to which I had been a witness began to torment me by pelting stones at me. I sought the protection of the wall and lending my ears to the hole behind a wall I played the evesdropper. From whatever door he wanted to enter he found it difficult to carry his accomplices along with him. His neighbours were with him and always sided with him. They incited him to reduce me to extremities, but I connived at the misdeeds of the vultures(V-87-39).

A striking feature of Amir Khusrau's treatment is the juxtaposition, or comparison by contrast, of men and things, placing them one against the other. Various social classes, Muslims and Hindus, Turks, Mangols, Afghans, Sayyads, Mashaikh or Sufi mystics, Ulamas, or theologians, Jurists, nobles, officials, peasants, wage-earners, artisans, craftsmen and slaves have all come in within the colourful picture of the literary artist. About the saintly personages he says that the Hazar mekhi khirqa (the religious mendicants habit made up of numerous patches) of the Darwaish is a sacred threshold for the descent of the angelic spirits. The sufistic cap is the goblet of divine love or the mendicant's bowl of the low spirited ones. The man of sanctity and piety taking his rest with a mat under his head is like a river which thrown up all sorts of rubbish and the engraving of mat on the back of the Darwaish looked like the calligraphic display of the saying,"My poverty is my pride" The holes in the patched and tattered garment of the Darwaish served as the window for having the spectacle of the other world. The cap of the Darwaish is very much superior to the turban of the Ulamas. The attachment to wealth by the Sufis is as incompatible as a golden bow string, and the association of the Mashaikh with kings is as misfitting or improper as a blanket on the golden royal chair. The Darwaish who is associated with men of affluence is as displeasing for the eyes as the stitches of course wool

holes appeared in the ceiling that I thought that the covering of the cloud would suffice. When the vaulted hall (Sulfa-i-Taq) became a pool of water I sallied out towards the basin of the house (Hauz Khana) which had become like a privy (Abkhana). I withdrew towards the outer bigger hall which was becoming smaller and clung to the threshold or portico (Dahliz) which itself had been overwhelmed with holes. I went upstairs but the roof had become a vast expanse for the watery horse-men (bubbles). I proceeded further and looked around to put down my legs which slipped and I fell headlong on the ground. I stood up and with utter difficulty got down from the first story. When I reached the courtyard the large stone-walls began to roll down. The damped wall gave away and came down. When I looked at the houses which had become a mass of bricks (perhaps unbaked) my body made of water and clay melted down. From the house I went into the street and entrusted myself to my horse. Horses resembled boats on the sea. The street was narrow and the walls of the quarter occupied by the paper manufacturers were very lofty. Whenever I raised my head above I was apprehensive of bricks and timber falling on and striking me. At the end of the street I saw a lofty buildling which was bending down on its back. When I advanced further I saw the balcony or the portico (Rawaq) toppling down along with the roof. Then I ran towards the house of my uncle, Sipahsalar Iftakharuddin, my horse which reluctantly moved out of the house jumped from house to house, being extremely terrified by the sounds of the tumbling houses. The horses which had been the resort and rendezvous of men had come down to the ground, when I arrived at the house of my uncle I found its owner sitting under a canopy of straw which was also leaking. He asked me about my house and its inmates and I quoted the Arabic expression "they were encircled by the waves and both were submerged."(V-57-61.

Elsewhere he says that he was staying in the house of one Majduddaula for which the last 2-1/2 months rent had been pre-paid, leaving not a berry (habba) or barley (Jaw) as due. When I first set my foot in it I saw a garden like that of paradise. The lofty hall and walls and twelve-arches vied with the sky and with the 12 towers of the Zodiac with this difference that they were not upside down. The tank or the reservoir of the house (Hauz Khana) was so large as to eclipse the citadel of Shaddad and its water could be compared with that of Kausar. The library (Kitab Khana) was fully equipped and decorated with calligraphic inscriptions. The pillars of the house were high, straight and fine and its high doorways

craftsmen, skilled and unskilled etc. An outstanding feature of the book is the valuable information that it furnishes us with about the state of learning and education in subjects like Fiqha (Jurisprudence), Mantiq (logic), Falsafa (philosopy), Ilm-i-Tib (medicine) and Sarf-o-Nahv (Grammar, Etymology and Syntax).

A fairly large number of books on various subjects appear to have been in use in intellectual circles, some of them being probably included in the prevalent course of instructions as text books. Panj Ganj, Mizan, Kafia, and books of Masadir, Tasrif and Nahv, referred to, are still in use and we also find mention being made of Misbaah Zubdah, Lataif-i-Zamaskhari, Zariri Aslub-i-Jawahir-i-Azhari, in the Risail. Some of the widely used works referred to are Maqamat-i-Hariri, Kalila Dimna, as translated by Bahai-i-Baghdadi, Mukhtasar (Al-maani) Qasida-i-Shatibia, Mutawwal, Adab-ul-Quazi, Sharaf-i-Adab (rhetoric and literature), Baizawi, Kashshaf of Zamaskhari, Mashariq-ul-Anwar, Masabih (Us-Sunnah), Tafsir-i-Zahid, Madarik (traditions and commentary), Hidaya, Faraiz-i-Husami, Manar (Ul-Anwar) Muhit, Mabsut, Manzum, Kanz, Tariqa-i-Nasafi, Fatawai-i-Seraji, Fatawa-i-Khani, Sharai (Ul-Islam), Jama-i-Saghir, Jama-i-Kabir, Bazdawi (Book of Imam), Hawi (Jurisprudence and principles of Islamic Law), Maqamat-i-Hamidi of Hamadani, Kashafu-ul-Mahjub, Suluk-ul-Muridin (being version of Ghazzalis, Ihaya-ul-Ulum by Majduddin Jarjami) Asrar-i-(Fakhrudin Razi, Bahrul Manni (philosophy and mysticism), Miftah-ul-Ulum (Logic), Qanun, Kitab-us-Snafa, Mujaz (Medicine). Other books referred to are Kitab-ul-Ghayats, Akhbar-un-Nayyarain, Zakhira (I, 53, 55, 114, 119, 140; II 97, 196; IV 185, 195, 222, 242, 281, 284, 309, 317, 318, 321, V)

That the State had some thing to do in encouraging and patronizing education is evident from the instructions issued to the Qazi of the metropolis. The foundation of the Madrasas should be laid on gems and jewels of knowledge rather than stony walls, and students should be settled and sheltered so that they may do good deeds and become greedy of sciences (Ulum) instead of being apathetic towards learning and lessons (II-15). The ceremony of conferring academic distinction has been described as Shamla "bandi for which we have got the term Dastar Bandi" in Mulfu-literature (IV—195).

We get ... lea about the dwelling place of a man of position like the author from a witty letter which he addressed to his friend, Tajuddin, in which he describes the disasterous effects of heavy rains and storm "The roof was so badly leaking as if it was a sieve and so many

and described as 'Kuhl-al-Jawahir (collyrium or antimony in which gems along with other ingredients were reduced to a fine powder.) and a book 'Maqtal-i-Hussain', which appears to have been the earliest of the Elegiac works in India on the tragedy of Karbala, now unfortunately lost. We find reference (IV-330), to 'Nau Rozi or New Year's day of the Persian Calender being that which was observed originally by the Magians when the sun enters the Aries and also to the Muslim festivals of Rabi I commemorating the birth and death of the prophet. He tells us about Id-ul-Fitr, the day of festivities following the one months' fast of Ramzan; about Id-ul-Azha also called Id-ul-Qurban held in the commemoration of Abraham offering up his son, Ismail to God; and about Shab-i-Barat the night of the 15th of the month of Shaaban on which the Muslims made offerings and oblations in the name of the deceased personages. The night after 14 Shaaban, was also called Shab-Bedari or nocturnal vigil. On the day of the first Id garments of fine species of linen and silken clothes (Qasabaha) were worn, 'Halwa-i-Shakar Pech', and white fine cakes (Ruqaq) were also taken on 'Shasha-i-Id' or the 6th day of the Id (I-198). There are short epistles or notes on Shabi-i-Siyam, Shabi-i-Qadr, the two Ids and Ashura (IV 324-25). The first is called 'Roz-i-Qismat-o-Barakat (distribution of fortune and blessings). The pious and devout ones kept night vigil and spent the whole night in prayers. Innocent children played with fire works. The whole of the city became the garden of Khalil because of the light of the lamps resembling the flower of pomegranates and every one, in the light of his own condition, sent a few lamps to the neighbouring mosque. The writer also wished to burn the lamp of light in his own house and enlighten it with prayers. In Ramzan, after breaking the fast "Zalibay-Nabat" (the well known sweet Jilabi) and 'Fuqqa' (a sweet beverage) were offered in trays. Hearing the 'Bang' (call) of the Muazzin, they went to perform the special fast prayers called 'Taraweeh.' On seeing the new moon they broke the fast and congregated to make and enjoy festivities. The Drum was beaten for nine times and fine bread cake and Halwa were sent from house to house as presents. Rose water was sprinkled and fragrant perfumes were offered. On the occasion of the 2nd Id, sheep and goat (Gospandan) were sacrificed.

There is much worth noticing about sweets and other articles of food, clothes and costumes, utensils and furniture, housing arrangements, pastime and recreation, family life, social divisions, position of women, trade and professions, agricultural and industrial products, artisans and

sons, Ghayasuddin Ahmad,[4] Yaminuddin Mubarak, and Nuruddin Taiyab and entitled "W'az-o-Nasa, lh" (counsels and admonitions) deserves a separate treatment because of its importance.

It would be interesting to know that Amir Khusrau, who is reputed for his contributions towards a common medium of communication and a common mixed culture gives very little in the Risail about language and literature of the indigenous Hindu population. Excepting a single Doha[5] which occurs at the end of one of the Risails of the Ms. copy O.P L , Patna, there is no specimen, conversational or otherwise, of the vernacular or the regional language with which, however, he was not unfamiliar Of course, he has used some purely Hindi words several of which have, however, double meanings. Some such words are 'Chuna', 'Supari', 'Mar Mar', 'Maash', 'Mung', 'Rui', 'Jauo', 'Ayee', 'Ayee' etc. We also get other Hindi words such as, 'Bira','Bar' (tree) 'Jolaba', 'Di Di', 'Nayaka','Tils', 'Piyaz',' Vaid', 'Kulab', (potter) 'Deomandla', 'Nagbel', 'Chambertali' etc. He has given us much about Music not only in this book but also in 'Qiranus-Saadain' and other Masnavis; but it is the foreign rather the Indian system of music, musical instruments, musical melodies, and the musicians about which he writes. Of course, in the Risail he has something to say about the 'Hindi Kalavatans' and the 'Hindi Saaz and Sur' or (instruments and melodic tones or tunes) but it is the 'Pardas and Maqamats' rather than the 'Raags and Ragnis' which find mention in his works. He does not say anything about his own alleged contributions though he claimed proficiency in the art. He refers to competitive contests between the Indian and foreign musicians, but there is nothing about Gopal Naik or Sitar or Seh-tar and the introduction of a common mixed Indo-Persian system of music known now as northern system of Hindustani music.

There is a frequent mention of the use of collyrium or antimony in the eyes specially on the Ashura or the 10th day of Muharram, and the observance of Rozai-l-Maryam or Saum-i-Maryam or Saum-i-Samt which means the three day's fast in complete silence in the month of Rajab (I, 197, IV, 323). Amir Khusrau felt highly gratified on the receipt of such gifts from a Sayyad as a prayer book to be recited on the first ten days of Muharram, a 'Surma Daan' or box holding collyrium wrapped in paper,

---

4 Partly considered in a paper still unpublished.

5 Perhaps it is an interpolation.

answer the question, "how things actually were," but, one can very well realise "the way things were looked at" by one of the great 13th century's intellectuals.

The book is impressive in size and also in source-contents, covering as it does practically every aspect of life, socio-religious, economic and cultural. It does not ignore even such apparently commonplace but still current practices as the following:—"Water mixed with milk was sold at the rate of milk" (IV-259); the washerman who earns 100 Dirhams every week, utters 'si, si' while he is at work, was found garbed in the clothes of other people"; (II-112); "the tumbul attendants of poor means offer a few betels to the men of position and expect to be tipped" (II-257); "it does not behove one to take augury from sneezing which is due to cold" (IV-86); "they hang a black crow on a newly-built house to avert the calamity of evil eyes" (IV-87); "among the congregation of people of grief and lamentation they sing Hinduistic songs (while carrying the bier of an old person)" (II-250); "in India there is a custom that workers of spells and magic practise incantations with the help of a reed, and whosoever is struck with it becomes tractable and submissive" (IV-161); "the conjuror who swallows swords and daggers etc......" (IV-261).

The main Persian text is interspersed with verses which have got their own significance. Some of the letters and pieces covering many pages are in Arabic. Some sections called 'Harf' are fairly big and self-contained, but most of the pieces are small and disjointed. Harf 3 of volume II, concerned with the "fundamentals[1] and the derivative principles of Music" covers 17 pages, and will be dealt with separately. It is followed by a discourse on the games of chess and backgammon (Nard) Hunting of birds[2] and beasts, fowls and tigers, form the subject of another section of volume II (60-69). The games of Polo and Kite-flying also find mention in more than one place. The interesting section on Tambul[3] or betels which spread over 19 pages of volume II has been already utilized elsewhere. An important section, Harf 3 of volume IV (256-330), which consists of three long letters, addressed to the author's

---

1 Paper entitled "Amir Khusrau on Music in Risail-ul-Ijaz" at the Aligarh Session of All India Oriental Conference.

2 Dealt within a paper still unpublished

3 Vide the paper "Betel chewing among the early Muslims of India".

or a desire to demonstrate one's literary ability and accomplishments. They reflect more clearly and accurately the views and outlook, style and methods than the official writings and from their apparently crude stuffs there might possibly emerge a better and truer picture of contemporary human happenings.

An attempt was made in a paper contributed to the Ranchi Session of the Indian History Congress to throw some light on matters of historical interest found in Amir Khusrau's Risail-i-Ijaz-i-Khusravi. The utility of the large and ponderous volumes (5 in number) on epistolography, written in a most grandiloquent verbose style has been doubted by scholars, but one interested in social history cannot afford to neglect the cultural parts and the glimpses of the social and religious life which form the core of the book but are lying hidden in involved style of words and phrases, puns and puzzles. Amir Khusrau was an eys-witness of the multitude of happenings of a varied character and had become fully acquainted with manners and morals of the men not only in his surroundings but also of those whom he came in contact with in different parts of the land during a fairly long period covered by the reigns of Sultans from Balban to Ghiyasuddin Tughlaq. He held strong views on ethical and religious aspects of life, and had a certain antipathy against those who led lives of heterodoxy, immorality and corruption. If one of the purposes of history is that it should not only be true to facts but also morally instructive, the first hand observations of Amir Khusrau about the men and matters of the time and his literary disclosures of their faults and merits cannot but attract our notice. His style is difficult and epigrammatic and his inventive genius enabled him to coin many facts and events and names of persons and places. This might make one think that there is not much of actual information and it is not safe to deduce things of social import from what was not real but imaginary. But many things about the mental aspirations, ideas and outlook of the educated classes, and the manners and customs and religious and economic conditions of the time about which political chronicles are generally silent come only within the purview of this type of literature which is free from all restraints and inhibitions. The contents of even the fictitious letters and other pieces, some of which are dated, are not absolutely devoid of value, meaning and substance. At any rate, they may be taken as the reflection of the attitude and outlook and expression of the varied and accumulated experiences of one who was himself a part of history. They may not enable one to

LIFE AND CONDITIONS AS DEPICTED IN RISAIL-I-IJAZ-I-KHUSRAVI

There is a growing awareness of the need of adding to our knowledge of the socio-economic and cultural factors which were at work in Medieval India, and studying the variety of topics that come in the field of social history. Our knowledge of the life and conditions in the early Muslim period is still perfunctory, uneven and fragmentary. Life as depicted in purely nonhistorical, religious and literary works, such as hagiography, canonical or juristic books, folktales and romance, poetry, belles lettrs, epistolography etc. has not been studied as it was due to it. An adequate social history cannot be written without careful and painstaking scrutinization of all possible source-materials. It may be argued that isolated statements and fragmentary information that can be culled from the works of Sufi mystics, legists, poets, rhetoricians and writers of fictions and anecdotes have so much of the marvellous and the miraculous in them, are so exaggerated and over-dramatized, and are shrouded in such verbose and metaphorical language as to be hardly worth the time consumed and the energy spent over them. Some may say that fragmentary nature of such religious and literary sources have little or no bearing upon the general trends of social life, religious thought and movements.

But a student of history under the spell of the past which he seeks to understand as a key to the present, and concerned as much with vices as with virtues, would not feel deterred from his pursuits in what he considers to be his quarry, however, arduous it might be. He would sift and select from the fragmentary records, interpret them properly, give the detached and disjointed incidents and occurrences a coherence and make them meaningful. The outcome of his efforts may constitute stuffs of history, or least serve as backgrounds of history. The one great advantage of the above source-materials is that they emanated not as command-performance but because there was some inner urge or impulse, religious or otherwise

or fairy before the husband, but to be bashful, modest and fearful and to be known and seen from behind the curtain mounted with the fringed of the veil.

Our author enjoins upon the wives to keep themselves within the limits of their homes and have watchful eyes on all the resources of their houses; have privacy with none except husband, even with brothers and nearest relations; remain engaged in their domestic duties rather than being busy with the combs and mirrors; treat the husband's face as the mirror; practise thrift, and make particles of gold and silver, earned by the husbands, into thousand; avoid being quarrelsome, harsh-tongued and short-tempered lest they might annoy the husbands, and drive away the domestic attendants; behave well towards the female servants; consider contentment as their ornaments, if the husbands be poor and without means of subsistance; in short to cultivate such moral excellences as to make him feel proud of being the father of a daughter, hoping to be remembered as such, through her, after his death (M.A.).

from the pains of pregnancy and child birth she has undergone entails on her offsprings a load or burden the least particle whereof will suffice to weigh down the scale of the Judgment Day. Even if a son offers 30 cities to her for carrying his burden and sucking him during the period of 30 months he cannot render her all her dues (*H. Ijaz* II, 164, 325). The long sermons to his daughter and to "all the women" (Sair-i-Masturat) in *Hasht Bhisht* (38 verses) and *Matla-ul-Anwar* (109 verses) would lead one to think that the great poet was extremely orthodox and conservative in his attitude towards the fair sex. In one of his verses he seems to lament the birth of his daughter; but he immediately offers his thanksgivings to God for the gift and says that his father had also a mother; the latter was also a daughter; Messiah was born without a father; but there was no case of any one being born without a mother (H.B.).

Addressing his seven years old daughter, Mastura, he says "although your brothers like you are of good stars (disposition) they are not better than you in my eyes (MA)". When you enter into wedlock and qualify yourself for occupying the Sedan I would wish you first to be chaste and continent and then wealthy. My first counsel to you is that you should exert with assiduity in your devotion to God and remain under the arched place of worship like your eyes. There is no better ornament for you than the rosary. Seek good name and character through your own body by being chaste and abstemious, and be a friend of purity. For a woman of bold conduct and deliberations needles and spindles are spears and arrows. Even if you have enough of gold, don't feel ashamed of the spindle which is of iron. It is not sagacious to give up the spinning wheel and needle, for these are the means of covering the body. If you want to be at ease and free from all calamities, keep your face towards the wall and have your back at the doors. The secluded ones are applauded and those who wander about in the streets are disgraced. The woman who runs in the streets is not a woman but a bitch. The swing (Bad Pech) and tambourine (Duff) which the women play upon are no better than pillories and ropes for them. Songs and melodies appear at first to be simple affairs, but when carried to extremes they serve as virtual invitation to drunkenness. Wash your face of the false cosmetics (Gulguna), and try to be honourable without the red colour (ghaza) on the face. The real 'Jalwa' (meeting of the bride and bridegroom) is not that to look like a bedecked idol

old and young are quickly struck by their hypnotic charms. Another strange thing is their claim that they can fly high in the air like birds; but this does not stand to reason. Again by virtue of their charms they claim that they do not get drowned in the encircling whirlpool. Even if you put them in a tight sack and throw it on the surface of the water they would swim across from one bank to another without being drowned. Another strange thing is their claim to withhold and let go rains and moisture from the clouds. They have got such a collyrium that if a person desires and applies it to his eyes he can make himself invisible. There are many such wonderous things which are reported about them, but which may be said to be beyond the capacity of everyone except the watchful protectors (spiritual men) of the time. One who has seen all these things may not deny them; but those who have not seen them cannot believe all of them. Though all these are charms and fancies, yet, there is something which may be taken to be really true and I would tell you that for your approval."

There are many appreciative verses of Amir Khusrau in *Nuh-Sipihr*, a command performance, about the fidelity of the Hindus, male and female, to the object of their love and devotion The dying of the Hindus for expressing their fidelity is a thing to be astonished at; their dying either by the stroke of the sword or burning in the cruel fire. (*Hast Ajab Murdan-i-Hindu Ba Wafa Murdanash Az Tegh Wa Ze Atash ba Jafa*). The women burnt herself out of love for her husband and the man practised self destruction for his idol or for his lord and patron (*Zan Ze Paye, Mard Basa Zad Ba Hawas-Mard Ze Bahre But-o-Ya Munim-o-bas*). Although in Islam such things are not allowed, but see what great deeds these are. (*Garche Dar Islam Rawa Nist Chunin-Laik Cho Bas Kari-i-Buzurg Ast be bin*) If such kind of acts had been allowed by the Shariyat, many virtuous people would have gladly sacrificed their lives for the sake of their love and devotion. (*Gar ba Shariyat Bawad In Na'u Rawa-Jan Bedehand Ahl-i-Saadat ba Hawa*).

Amir Khusrau's conception of womanhood as a mother, daughter, and wife, and his ideas of the correct role of women in society, her interests and activities, deserve more than a passing notice. He says that the mother is "the origin of the mercy of God", and "the paradise is under her feet". The rights accruing

a variety of strategems they sometimes showed themselves as fairies and sometimes as devils"

More interesting is the versified account of the spells and incantations found in *Nuh-Sipihr*. "Many wonderous things have appeared in this land the like of which has not been mentioned of any other country. If I happen to describe most of them it would become as long as a tale, and, therefore, I am recounting only a few of them. Firstly, within this area, the enchanters bring a dead man back to life by their magical charms. This statement requires substantiation. I am giving a hint to those who will seek it. The person bitten by a snake who does not rise at the time is brought back to life after six months. In order to learn the art one has to proceed tc the East by way of water as swiftly as the lightning. When he reaches the borders of Kamrup the master magician turns him into an animal. The other thing is that the Brahmans treasure the powers of enchantment in their hearts and if they exercise their spell on a freshly killed person the latter becomes alive provided he has not been removed away. If he is asked about the future events he may tell that if they are not terrified. So long as his tongue remains intact he is capable of speech but when it is dissolved we should not expect any speech from him. Another wonderful thing is that either by a true method or any pretexts and pretences they prolong the life which is not prone to decay. This is achieved in this way that since the number of breaths of every man for each day is fixed by calculation, one who accustoms himself to the taking care or holding the breath prolongs his life when he takes less number of breaths each day. The Yogi by practising restraints of breath within the idol temple remains alive for 200 or 300 years. Another strange thing is that by their artful regulation of nose breathings they predict events of the future. That is, if they stop and release their breath through their right and left nostrils, they give out same thing of the future. The other thing is that they have developed the art of transferring their souls from their own bodies to those of others. In the hilly regions of Kashmir there are many cave habitations of such people. Another thing is that they knew the art of assuming the forms of wolf, dog and cat. Again by practising their art they remove the blood from one body and infuse it into that of another. It is also a strange thing that both

and magic) and Chashmbandi (tricks that deceived the eyes) which the Gabrs (infidels) practised so as to draw a veil over peoples eyes have been referred to in the K.F. also (63-64). In his masnavi of *Laila Majnun* the Amir refers to the conjuration (Shubada) or sleight of hand of the dagger-swallowing man (Khanjar-asham) and one who inflicts wounds on his arms and sides for the sake of his belly (Bazu ze paye shikam kunad resh).

In his masnavi named *Aina-i-Sikandari* Amir Khusrau has referred to some of the typical customs and manners of the Hindus "out of sheer foolishness the common Hindus drink water out of hands of their palms in spite of the fact that they had a hundred earthern pots with them (p. 32). From the red colour of the twilight the mountain peak looked like the forehead of the elephant which had been besmeared with vermillion. When the snake charmer catches a snake, he nourishes such a bloody reptile with milk (53-54). When I slightly removed the veil from the side of the ear I caused the cap to fall down on the head and the head from the shoulder, (this refers to the new bride's Anchal affair when she moves a little the border or hem at the end of the veil. She covered her rosy face under 'Maijar' (a cloth worn by women to preserve their headdress from being soiled by unquent or pomatum of their hair) and thus shaded closed the eyes of the evil wisher and prevented him from seeing her.

Here are a few lines from *Ashiqa* about the conjurors and acrobats and their juggling or sleight of hands. "They were so dexterous in their use of swords that they could split a hair into two halves like a young hero. With the dagger, clean and pure as the wing or the feather of the flies, they cut the flying flies into two without making any boast of it. The rope-dancer played on the top of the ropes just as the hearts are constrained by curling locks. He was not only exhibiting his feat by twisting his body round the rope but was rather playing with the thread of his life. With his dexterous hands he threw the ball high in the sky and with it went the galloping stead round the circular disc. The conjuror swallowed the sword like water as if he was drinking water as a syrup. He let the sharp poinard slip into his throat through his nose just as one takes water into his nostrils. The child warriors exhibited their feet by jumping to and fro on the running horses like flowers borne on the wings of the wind. The masqueraders exhibited their skill in different ways. By practising

calling the faithful to prayer (IV-81). Like the Hindu, a Muslim woman dying before her husband was decorated with vermilion paste being applied to her (gul-guna kunand). Festivals and festivities have also come in the picture. Such were the occasions of Nauroz (new year's day, according to Persian calender on which the Sun enters Aries); the two Ids; Shab-barat (14th or night of the 15th of *Shaaban* involving nocturnal vigil, making of offerings and oblation to the departed souls, display of lamps and general illuminations, and fire works, played by children); Lailat-ul-qadr (27th of Ramzan, when the Quran is said to have descended from heaven); Lailat-ul-miraj (the night of prophet Muhammad's ascent to heaven). When Amir Khusrau invited his mystic friends to attend a Qawwali get-together, some thrown in a state of ecstacy, danced, that is rotated on their legs (pa-koftand) their hips being in motion ('Kachol juftaha shud'), while some clapped their hands (dast zidand); Ashura (the 10th of Muharram when the orthodox Sunnis kept whole day fast, applied collyrium to the eyes, and also read out from the book, Maqtal-i-Husain which dealt with the tragedy of Karbala. On the occasion of Id-ul-Fitr, which marked the breaking of the Ramzan fasts, after the visibility of the moon, Dasta-i-Nan, Halwa and Zaliba-i-nabat were sent out in big trays (tabaq) to the houses of friends and the vessel with rose-water (gulabdan) was in frequent use. Id was announced by the beating of the drum nine times.

There are references also to some common place but still current practices. Water mixed up with milk was sold at the rate of milk (IV-259); goldsmiths, while pretending to purify gold use Suhaga (borax) and steal gold; the washerman who earns 100 dirhams every week, and who utters 'si, si' while he is at work, is found garbed in the clothes of other people (II-112); the tumbul attendants of poor means offer a few betels to the men of position and expect to be tipped (II-257); it does not behove one to take augury from sneezing which is due to cold (IV-86); they hang a black raven in a garden or on a newly-built house to avert fatal misfortunes and calamity of evil eyes (IV-87); among the congregation of people of griefs and lamentations they sing Hinduistic songs, while carrying the bier of an old person (II-250); in India there is a custom that workers of spells and magic practise incantations with the help of a cane and whosoever is struck with it becomes tractable and submissive (IV-161). The conjuror who swallows swords and daggers, etc.......... (IV-261). Afsun (spells

(IV-114) and also into the thatched houses of the poor people (Muflisan) covered with thorns (Khasposh) which cannot prevent the leakage of pearl-like drops (of rains) nor the penetration of sun's rays and particles of dust through its holes (II-18). On the other hand, he takes us into the high roofed, two storied houses of the upper class people which had vaulted halls (Suffa-i-taq), pool of water (Hauz Khana), bath room or privy (Ab-Khana), library (Kitab-Khana), courtyard (Sahan) threshold (Dahliz), portico (Rawaq) with lofty pillars, painted walls and high doorways (V-57-61, V-87-89). In *Nuh Sipihr*, Amir Khusrau tells us about a poor helpless Hindu (Hindu-i-Miskin), who works himself to death, on account of the tyranny of the Khuta (Khurad Az Khuta Khun). He tells us about the drunkard Sufi (Sufi-i-Qallash), who goes into the tavern, and also the pious mystic of pure character (Sufi-i-ba-safa), who has become extremely popular due to his character.

The *Nuh-Sipihr* again tells us of the Indian dancing girls, with their forehead decorated with sandals and jewels, the parting of their hair being filled with pearls and diamond pendants, wearing a nose ornament and clad in the Devagiri garment. At the end of the fifth of the *Risala*, there is a satirical reference to some bad type of the women of the south. One is the Didi Miskin of Devagiri who made her black face white by coming out of the flour mill to cast glamorous side glances on people, and the other was Uchhaldi, the mistress of a brothel, and a typical representative of Nayakans of India. She and her followers always looked youthful amongst men; her ears were like water-drawing buckets hanging down in wells, and her lips were like raise[illegible]les of a drain. On one side of her nose a pearl was suspended from the nostrial, while on the other the snot (neta) having frozen on account of cold breeze looked like a hanging pearl. Her nose made her much too self-conscious.

Birth of a male child was welcomed with festivities and presents (V-251). Father or guardian arranged the marriage of their sons and daughters, and sometimes the hands of a grown-up girl were asked for direct by the suitors (V-215). Rich presents were offered by friends and relations to the married couple (V-221-24); a professional people called Murda Khwan recited the Quranic suras specially of Yasin over the dying and the dead (IV-39-40). The public crier put his fingers in his ears while

jugs, jugglets, and flagons had disappeared. (R. II. 270-71). *Khazain-ul-Futuh* also tells us how the roots of all iniquities, lust and adultery were cut off; wine, the daughter of grape and the sister of sugar, was turned into vinegar, and the prostitutes with their locks at the lower part of their ears and addicted to adultery were chastised and became veiled. This is followed by references to thieves, robbers, highway-robbers, night-prowlers, cut-purse, grave-diggers, shroud stealers, pick-pockets, who were held up from the banks of Sindh river to the sea-coasts (on the East) and were thoroughly chastised. The blood-sucking necromancers, magicians and man-devouring witches (Kaftari), who speared their senseless teeth in the flesh of people's children and caused a stream of blood to flow were stoned to death after being buried upto the throat (Sangsar). Last in the list comes the heinous fraternity of incestuous miscreants (Ibahatian), who held secret nocturnal assemblies wherein a mother cohabited with her son, the aunt with her sister's son, the father with his daughter, the brother with the sister. These libidinous wretches were tortured to death, the saw of iron being drawn over their heads (K.F. text, pp. 18-21).

He also writes about "Sunnian-i-Pak-o-Saf (orthodox Charyari Muslims), Muatazilan and Rafizis (rationalists and Schismatics Muslims). At one place he writes "If in this age the Rafizis (Shia heretics) were to nominally claim their rights, the pure Sunnis ought to remind (warn) the rightful caliph on oath"......(KF). He refers in derisive tone to the polluted 'Hinduān'; the bearded and severely despotical Afghans (Afghanak-rishail and Ushtulum) who were vain and arrogant; the lion-nosed, dog-tongued, Tartar-lipped, thinly-bearded Mongols; the Tabbetans with narrow close eyelids; the dog-faced, cat-eyed Araxenian Chinese with frowning and wrinkled foreheads. On the other hand, he mentions about a dozen types of Turks such as the moon-faced Aibaka, silver-bosomed and iron-bodied Qamash and Tamar, white-headed Aqwaish, the vigorous and manly Sunqur, the warlike intrepid Qilich, the loud-talking red-haired Sanjar, the pleasing open-handed Tangar; Qizil Arsatan, the red-lions, the incomprehensible Gorid, and also Kam Tughid and Ai-tughid (R.I. 166).

Amir Khusrau gives us a peep into the "Dark corners" (Zawaya-i-Tarik) of people without provisions (Be-toshagan) which have neither fire in the day nor the light of the lamp in the night

others; and keeps the grain stored in the granary of the Judgment Day. The real benefactors will never allow their labours to go in vain. In the same piece we are told about a Navisinda-i-Hindu (Hindu clerk or accountant) whose two-faced reed pen (Qalam-i-Juftawan-Kah) which being wielded to keep an account of produce (Hirz Challa) becomes as important as the corn itself for it splits under the disposition (affects the mental equilibrium) of the poor peasants just as the plough does in the case of the cultivated field, and his tongue serves the purpose of a sickle (badas) of the field which splits and removes everything that comes in the way (this shows that in making the entries of the produce the petty Hindu official acted dishonestly and he was so sharp-tongued as to summarily dispose of all complaints, just as the sickle removes all that comes in the way (R.I.IV. 64-65).

The Amir's observations on the ways of the sots and drunkards, Rabis (usurers), Rashis (bribers), Zanis (adulterers) "who are alike in form and spirit" and also Muhtakiran (hoarders and profiteers) show that such vices were widely prevalent in his time. Wine drinking, though strictly prohibited by Islam, had become a habit with the people, and even some men included in his religious groups had become addicted to it. We are told of a drunkard Mu-ezzin who entered the magnificent mosque of Qazi Imran in a state of intoxication and the smell of liquor coming out of his mouth defiled the pillars and rafters of the mosque which had been made of sweet-scented sandal and aloe wood (R.I. IV-175). Some recluses joined the Sultan in secret drinking party and some Ulemas poured liquor in the same bosom in which the Quran was treasured" (*Matla-ul-Anwar*, Chap. 11). Of the trinity of joy, wine, women and music, all of which form important themes in the *Risai'l*, the first and the third have been accorded separate sections (II-267-275 and 275-291) which is also the case with the following discourses on Nard and Shatranj (games of backgammon and chess (II-291-298) which are also noticed in *Khazain-ul-Futuh* (pp. 42-43). In the "account of wine bibing the author who was himself a teetotaller gives an indirect hint to Alauddin's prohibition of the drinking and sale of wine". But by the vicissitudes of the revolving sky the big wine jars became small (were broken)...... the spiders had woven their webs on the doors and walls of the tavern......the fellow drunkards who were the flies of wine had dispersed and gone into retirement...... the minstrel, the cupbeare , Kabab, Nuql (desserts), the goblets,

Sandal, and many other perfumes. They had Gulala (locks of hair hanging loose), Jaad (ringlets of curly locks). The male Syeds had also double Jaad and men used Masma (dye made of leaves of wood or indigo).

We get some interesting observations in *Risai'l* (IV-856) on different kinds of cloth "Jama-i-Yak-Shiqqadar Muina (The garments with fissures or crevices) which wards off a whole hill of snow; Yakta-i-Bahraman (red coloured upper garment without lining which is very delicate like water and covers the beautiful ones upto the neck); Yakta-i-Hari (silken) which on account of its brilliant glare and fineness resembles the rays of the sun; Yakta-i-Chambartari, which had the quality of covering the defects (of poverty and misery), but had a defect of its own in that its wearer remained naked inspite of putting it on; the Yakta-i-Parnan, a green, thin and delicate garment like the feather of the flies; the Devagiri garments, white and fine like the spider's web; Yakta-i-Awadhi which had become sugar-coloured and stained on account of moisture; the jama (garment) of the special wardrobe is harsher (more coarse) than mean-minded ones, which the slave, asked to use as a pae-taba, kicked off with his legs; Katan-i-Rusi, which general Aibak Tatar sent, was harsher than the temperament of the Russians and was narrower than the eyes of the people of Khata (China). The *Yaktayi-i-Narma Latif* resembling the skin of the snake had been set as a memento and in lieu of that the green Maqna like Jama-i-Chuk (like green scum or kayee) has been received. The Dastar, as thin as water, Kulah-i-Chihar Taranji, the rose coloured Yaktai (Gulnari) a piece of long cloth (Katan) which on account of its being excessively cool is ever in tremor, and a piece of Jar Mauji and one Miyar-i-Ma'abari (turban or veil made in Ma'abar or Madura) from which water easily came out, and Yakta-i-Zabadi have also been referred to (I-177-8).

The *Risai'l* tells us about different kinds of people, good of bad. For example we are told about Kuzhawarzan-i-Miskin (poor cultivators) who take their pair of ploughs (Juftawanan) to the fields, and with pearl-like sweat trickling down from their fore-head break the dry or parched earth; irrigate it with their own hands; and when the seeds thrown inside the earth sprout and blossom up with grains, one into thousands, he plies his crescent like reaping sickle; gets the crops, say of Shali paddy, wheat or others, removes the grain from the straw; provides food for himself and

also refers to the varieties of cloth from 'Kirpas' to 'Harir' which cover the nakedness of body; from 'Bihari' to 'Gul-i-Baqli' which are used both in summer and winter, from 'shirt or under garments to Galim (blanket of goat's hair) which differ greatly in their hair; from 'Jaz' to 'Khaz' which are similarly engraved or painted; from Devagiri to Mahadeonagari which are allurement both to the body and the mind" (page 25).

The types and modes of dress have also been referred to. Such were the large turbans (Dastar) and Ammama, worn by Ulemas and religious groups on the head over a close-fitted skull-cap called Kulah and, consequently, they were called Dastarbandan, Mutammiamah, and Kulahdaran. In *Risai'l* we get that the big turban folded like a coiled serpent was made of such fine and light stuff that a hundred yards of this cloth could be wrapped round the head and yet the hair underneath was visible. The other clothes they used were Pairahan, Qaba (sleeved close-fitting jacket or coat open in front), Aba (a kind of coat or cloak), Jubba (a species of upper coat, resembling a skirt), Rida (mantle), Saravil (a sort of drawer or trouser like Pae-Jama), Shalwar (baggy trouser), Lungi (narrow strip of cloth passed round the waist and thigh), Barani (a cloth for keeping off rains), Dotai (a kind of double cloth). The sufis and durveshes were clad in Khiroa-i-hazar-Mekhi (the mendicant's habit made of numerous patches), Kulah-i-Chihar Taranji or Chihar Taraki (four cornered cap), Kafsh (shoe, sandal or slipper), Nalain (a pair of shoes of a particular kind with wooden soles), Labaicha or Labada and Chadar as, also Moza; and sandals were of different types we find mention being made of Kafsh-i-Yaky-Mehkhi and Seh-Mekhi (hooks), Kafsh-i-Zardozi (embroidered), and Kafshak-i-Hanni used by men of affluence). The garments of women consisted of Naqab (veil hanging over the face), Maqna (a veil worn over the head), Durrah'a (tunic; upper garment with buttons and loops), Pae-cha (drawer or trouser), Chadar (scarf), Qasb (women's headgear), Izar or Kishtak (drawer), Pairahan (loose or close-fitted shirt from the neck to the naval), Reshaha-i-Damani (women's skirt mounted with fringes), Sangchi-i-Zanan (sina posh or breast-belt), Gulband (neck cloth), Chirin Baf (a piece of cloth of delicate kind of texture). Izar and Fido were worn by both men and women. They parted their hair just in the middle of the head *i.e.*, a track was made just in the centre of the head (*Rah-ha az farq-i-rast rast kard-and*) R.I.-1-21). They used also cosmetics like Ghaza, Gulguna.

"Mail ba Qaisunqur o bughra makun-Shulla-i-Tutamajit Ighra Makun".

Our author has told us much about the second most essential need of man, that is, cloths and apparels. They were of various stuffs or texture, silken, cotton, woollen, linen, embroidered, painted and of gold work. There are many references, in different places of his various works, to Khaz (coarse kind of silken cloth), Deba (brocade), Harir (silken cloth), Zarbaft (cloth of gold), Zardozi (embroidered cloth), Makhmal (velvet), Atlas (dull coloured satin-red, tending to be black), Mushajjar (a kind of figured silk brocade of painted silk cloth), Daq (a kind of costly stuff; also a course darewsh garment, painted and embroidered), Katan (a kind of linen cloth said to be rent by the exposure to the moonlight), Kirpas (a kind of long cotton cloth; also fine linen or muslin), Parnean (a kind of fine painted silk from China), Aksun (a rich black-coloured silken cloth worn by princess or boastful people; also a species of brocade). Amir Khusrau is very lavish in his praises of the cloths of Devagiri and Bihar, and Oudh, specially the first. It is interesting to see what he says about Bihari or Rupak-i-Bihari and Devagiri cloth. He writes under Jama-i-Devagiri in his diwan called *Nihayatul-Kamal* (page 52).

"How can I describe adequately the fine quality of the cloths. Had it not been so, the hard-hearted planet (Mars) would have skinned the moon and brought it to the end of the month (what the poet means to say is that the Devagiri cloth is so fine and thin that if the moon is deprived of its skin and thinned, it would not be thinner than that). Even a hundred yards of such a fine cloth can be made to pass through the eye of the needle, and yet it is of such fine and strong texture that the point of the steel needle cannot pierce it without difficulty. It may be said to compare favourably with the drops of water, as if the drops trickle down against nature from the streamlet of the sun. Elsewhere he says, "It is so transparent and light that it looks as if one is wearing no dress at all, but has only rubbed the body with pure water". The fine subtle Hindustic silken garment of which, if doubly folded ten yards are out of one, were drawn. Owing to the extreme fineness ten (hundred) yards can easily be contained in the eyes which do not suffer in the least thereby. Neither water nor oil nor the iron or pointed needle can pierce or penetrate through it like drops of water. *Khazain-ul-Futuh*

drinking and their hearts and soul had got nourishment from the delicious delicacies, a few topmen stood up and uncovered in the name of each one present, a tray of Fuqqa (a kind of drink made of water and barley and of dried grapes, something like beer). Its strong effervessence went to the body and unloosened hundreds of knots of life's thread. When the provisions and the accessories were removed from the dinner table, the turn came for serving betel leaves among the men of the assembly"

This is followed by more than a dozen lines in praise of betel leaves. Amir Khusrau has made frequent mention of Pan which was invariably offered to the guests, specially at the end of the dinner, in his various works. This was the practice of his maternal grandfather, an Indian Muslim whose "rang-i-qirgun" (dark as pitch) glittering in sun's glare pleased the child Khusrau so much while he was perched on his shoulder. The long discourse in Volume II of the *Risai'l* in which we find 42 virtues mentioned as against 43 demerits of betels and betel chewing, has already been published elsewhere. The *Risai'l*, contains references to many articles of food such as Kabāb (meat cut in small pieces and roasted with onion and eggs and stuck on skewer), Zaliba-i-Nabat (IV 325 our Jalaibi), Sirka (vinegar), Jughrat (curds) (IV-51), Girda-i-Paneer (cake of cheese), Paludah (Paluda, a kind of flummery or Sweetmeat II-177-517), Murabba (I-169, a preserve or confection), Sikbat or Sikbati (I-612, a dish made of mea' wheat-flour and vinegar), Khushka (I-23 boiled rice), Shakkar Paich (I-196, a kind of sweetmeat made of rice or wheat and sugar; also paper to wrap with sugar in), Ruqaq (IV-325, thin cakes), Tutmaj (thin slices of pastry or vermicelli), Lauzina (a kind of sweetmeat in which almond is mixed up; also almond shaped confection IV-15) Sharabi-i-Asir, (grape-wine) and Sharab-i-Naishkar (wine manufactured out of sugarcane IV-53), Sikanjabin (1-23, lime-juice or other acid mixed with honey or sugar), Ghulahakkari (I-60, a kind of sweetmeat made of rose and sugar, something like Gulqand), a Qaisunqur (a kind of meat syrup of birds), Bughra (a kind of dish with dressed pastry or macaroni or a worm shaped white paste called vermicelli or *sewa'in* invented by King Bughra Khan) and Shulla (Pulao or dish made up of rice, spices, butter, flesh or fowl) have been also referred to in *Matla-ul-Anwar* (Chap. II).

dishes which were served on the table. The Nan (bread) was carried round like the circular disc of the sun. The nan-i-tunuk (thin fine bread like chapati) was so crystal clear that one's face could be seen through it. I should describe it as the disc of the sun rather than a bread; it was worth if Jesus spread it on the table. The nan-i-turi (of Turkish or Mongol variety) was puffed up like a dome because of the joy felt at being included among the royal dishes. This was the season why kak (biscuit or dry bread), became surly and pale-faced. The sambosa (a kind of small pastry of minced meat of a triangular form) became a delicacy because of the three elements constituted by it (Asar = Arad, Sarid, Raughan). The barra-i-biryan (fried or roasted kid) excelled the disc of the sun (refers to circular mutton chop). The tongue tasted the meat prepared out of the rib of the goat; it was placed at the top of the polaw (a dish composed of meat and rice, seasoned and cooked with butter, spices and honey. It refers to gravy or abgosht or yakhni of biryani). The meat pieces cut out from the sides of skinned goat looked like so many crescents. Strangely enough thirty first crescents (Ghurra) came out of the day of the new moon (Salakh skinned or flayed). The fat of the thick tail of dumba (a kind of sheep) weighed two *mans*; it was more delicious than that of ahu-barra (fawn). The head of the goat came intact with teeth exposed and excited the laughter from those sitting at the table (well-cooked but intact buz musallam like murgh musallam). The hilly dumba of which trayful of meat was brought had been reared and nourished for ten months till its two horns had come out on its head. Hundreds of delicacies and all varieties of food cooked in the cauldron (deg) were placed on the table and people partook of them with great relish, using their lips and fingers. A large variety of birds, fowls, such as waji (quail), tihu (a bird smaller than a patridge), durraj (black patridge), charz (bustard, a bird of game whose flesh is tender and delicate) had been cooked in a variety of ways. There were trayful of sugar-constituted halwa (a kind of sweet-meat made of flour, ghee and sugar) with a flavour and taste like that of the dishes of paradise. There were tablets or cakes of sabuni (a mixture of almond, honey, sesame oil), which was as tasteful as sugar and as good and straight as an old whitish garment. Then, many kinds of fragrant perfumes were sprinkled on, or mixed up with the eatables. They were more fragrant than camphor and saffron. When their palates had part-taken of their shares of eating and

and cultural pattern and performances as to display the writer's literary skill and accomplishments and to cater to the tastes and the needs of the time. The poets are generally in the habit of exaggerating things, and one should not expect their works to be marked by moderation and balance. Amir Khusrau was not an exception. He has gone to the absurd length in the later portions of the fifth *Risai'l* of his *Ijaz* in his highly obscene remarks, which cannot be put before the modern readers. Social standards of beliefs and practices, manners and morals are not necessarily the same among the different people and at different times. It is not safe to judge the past from the present. But even this part about episodes and persons concerned, is not altogether worthless for unfortunately Barni and others support him in some respects.

Though much that Amir Khusrau, who has been not unjustly styled as "the social historian" of the 13th century, has left to us in his numerous works, specially his masnavis and *Risal-ul-Ijaz* which is an interesting heritage as well as an example of the author's literary accomplishment, compels attention, we have to be very cautious and careful in clearing the grain from the husk. There are difficulties, and much painstaking effort is needed to tap the sources still wrapped up in Persian garb. We can confine ourselves in this short paper only to certain aspects and past conditions of society by way of examples, and draw the attention of the readers to what our author says about diet and drink, cloths and costumes, beliefs and practices, other than religious, and above all the various categories of people as to how they lived, thought and behaved, and what their good and bad points were

In Qiranu's-Sadain, while dealing with that which pertained to royalty and not to ordinary social life he writes about food and table inanners of Sultan Kaiqubad. After referring to the large (thousand) varieties of menus and dishes, sent in 9 tripod trays from the royal kitchen to the table, he writes about the nature and orders of the viands as follows :

"Hundred of cups of sweet vegetable juice, tasteful and nourishing as the water of life, were first taken round, and placed before the companians whose liquor-saturated palates were thus washed off by Jullab (purge of water and sugar). By taking the lip-sticking sherbat (syrup) broken (languishing) spirits were reunited and set right After this course the turn came of the

majority of unnamed Muzarian (cultivators), Dihqanan (rustic agriculturists), Qasbatiyan (villagers or townsmen), Sangtarashan (stone-cutters) were Hindus and Mahigiran (fishermen) and Margiran (snake catchers) have been definitely described as Hindus. Some of them were good and lived by their honest and industrious labour, while others were definitely bad and dishonest. A learned man and a mystic sufi himself, the Amir did not spare the greedy hypocrites among them and he considered the laity to be a "hundred times better than the priestly class." He writes in *Matla-ul-Anwar* (Chapter VI).

> *"Hast Base Sufi-i-Pashmina posh-kas na rasad bang-i-Muezzin ba gosh........................In hama Shaikhan-i-Khaza in parast-Barhamanand but-i-e Zarrin ba dast*

On the other hand, about low class wage earners he writes appreciatively that they pour the sweat of their brow to earn their lawful food; they work with their hands, night and day, and go to the length of making holes, with their teeth, in the leather to serve mankind. He has very good words to say about the tailors and the cobblers who were more hard-working and straight forward in their dealings than others, specially goldsmiths. The Amir writes frequently about the weavers who were simpletons but honest and industrious. We are told how they worked, at what they worked, their tools and apparatus and the services they rendered to society.

The characters portrayed and the situations depicted appear to be mostly imaginary, fictitious and overdrawn; yet the portraiture and the descriptions comprising the illustrative selections here may be taken to represent some real personality, actualities and possibilities as seen and found at the time in society by the observant eyes of the acute writer. Even the word-picture as drawn by the Amir and his pen-drawings are very often helpful and suggestive. Literature is the imperishable voice of life and of the period that produces it; and is, indeed, the mirror of the soul of society. It gives us a glimpse into the existing and actual social life of the time, and, therefore, there is much in it which forms a very interesting study of social evolution.

It may be said that literary picture based on scanty and scattered references is not only incomplete, but is also sometimes misleading. The motivating factor was not so much to paint a true picture of social elements, social organisation and institutions.

verbose contents and the ornate and occasionally over-dramatised picture of life and conditions from birth to death, about food and drink, cloths and costumes, manners and customs, festivities and festivals, social behaviour, family life, arts and crafts, games and music, hunting execursion, agriculture, irrigation, pastime and amusements, virtues and vices of society etc. may be taken as a fairly understandable delineation of what had existed or had been seen or thought about by our author. Those who have read Amir Khusrau's works in the original will not question the considered view of late lamented Dr. Ashraf that he was "pre-eminently a historian of contemporary social life" (*Life and Conditions in Medieval India*).

To reconstruct life lived and to form a consolidated picture of society as it existed in such a distant age from isolated and disjointed fragments and incidental allusions to contemporary men and events, scattered in books composed in high flown language and style, is neither easy nor a satisfactory task. It is difficult to get a full and vivid picture of contemporary life. But one need not be unduly skeptical about all that he says, specially what he writes in the *Risai'l*, about a variety of people such as the turbaned Ulemas, saintly and imposter Sufi mystics, quarrelling jurists, the Syeds with double locks of hair, slaves of both sexes and of different extractions, with characteristic names, artisans, and various functional groups, corrupt officials, dishonest merchants, shop-keepers (baqqal, or bazarganan) carpenters, blacksmiths, goldsmiths, money changers (sarraf), oil pressers (raughangran), black marketeers, hoarders (muhtakiran), singers, dancers (pa-koban) courtesans (tawaif, ruspiyan), mimics, acrobats, jugglers, conjurors (mushabbid, bazigar, gadan ghazian, rasan bazan), (rope dancer), maqamiran (gamblers); but in all his works except *Nuh-Sipihr*, it is Muslim rather than Hindu society, more of the urban areas than of the countryside, which arrested his attention most. There are only a few Hindu names in the *Risai'l* such as Saunpal Zargar (jeweller), Nepal Khuta (tax-gatherer), Narayan Raughangaghar (oilman), Deo Chand, Debir-i-Mudabbir (ingenious writer or secretary), as compared with a plethora of Muslim names of Jolaha (weavers), Tanindah (spinner), Bazzaz (cloth merchant), Challa Faroshan (grain merchants), Khaiyyat and Darzi (tailor), Ahangar (ironsmith), Zirahgar (armour maker), Kamangar (bow-maker), Ruingar (metal worker), Muzayyan or Hajjam (barber), Zarkoban (gold beaters), etc. Of course, the

and was above his age in taking detached view about men, alien and indegenous, high and low, rich and poor, nobles and labourers. But he had his limitations and unevenness as a writer of books of historical value for in marshalling his material and supplying factual information he becomes rhetorical with the result that sober facts are very often lost in his literary devices and mazes of words and expressions.

Whatever may be said about the political factors, dealt with, and there may, here and there, be some omissions, but not distortions or misrepresentations; but there is no lack of candour and impartiality in what he says, more in allusions than straight to the point, about things of social and cultural import. In places he shows himself sardonically human, distributing judicious criticisms, and also mild or unstinted praise with a fairly even hand. We may refer here to the third chapter of his book, *Nuh-Sipihr*, revealing the partriotic fervour of the first great national poet of Muslim India. It is thrilling to read the following :

> *"Hindu-i-Dahqan ba Kuhan Chadaragi-Shab ba Charaguh buwad ba Kharagi; Bar lab-i-Ju. Ze ab-i Khumuk Barhamanah Ghusl Kunand Akhiri-i-Shab Ghota Zarian-Khud Gah-e-Garma na buwad Shan Ghami-i-Khaz-Saya-i-Shakh bas o az kulba Do Gaz"*—And yet *"Barhamane hast ke dar Ilm-o-Khirad-Daftar-i-Qanun-i-Aristu to darad"*.

The ill-clad Hindu rustic or peasant who passes his night with his horses under the azure sky, and the Brahmin who takes his ceremonial bath in the cold water of the stream in the latter part of the night and who is content with a cell or a closet, even the shade of a tree, in all seasons should not be looked down upon. The Brahmin is such an embodiment of wisdom and learning that he can easily tear to pieces all the records and books of Aristotle.

His observations on many aspects of every day life, though scattered and found in bits and pieces, may be assembled into an orderly picture, and are, therefore, well worth consideration.

Amir Khusrau's oriental pattern of rhetorical history and his literary works reflect the spirit of the times and the tendencies at work, specially among the Muslims of his days, and this also is not devoid of some significance for those interested in social and cultural history. What emerges after a careful sifting of the

Khusrau's Works As Sources of Social History

Some works of Amir Khusrau like *Khazain-ul-Futuh*, which is in prose, and 5 out of 10 masnavis, namely *Qiranu's Sadain*, *Miftah-ul-Futuh* or *Tarikh-i-Alai*, *Nuh-Sipihr*, and *Tughlaqnama* have been included among the many different types and classes of historical literature. His *Kulliat*, the 4 diwans and the *Khamsa Masnavis*, and specially his stupendous epistolary and rhetorical work. *Risail-ul-Ijaz* are purely literary works and *Afzal-ul-Fawaed*, contains the table talks of his spiritual guide, Hazrat Nizamuddin Auliya but these are also not absolutely devoid of suggestive references and allusions of some historical and cultural interests.

Scant attention has been given to *Risai'l* which though verbose and full of verbal gymnastics and literary acrobatics bear some genuine documents and have a wide range and variety of details bearing on law and exegis, grammar, lexicography, tradition, morality etc., and also many things of historical value concerning social psychologoy, life and conditions of the period. It may, however, be argued that the work is diverting rather than authoritative since it is often difficult to distinguish between the fictitious and the imaginary and the actual; the historian would naturally like to have concrete facts.

Judged by the modern ideas on history as an objective study, Amir Khusrau may not be taken seriously by historical specialists. History with him was contemporary history. He had little or no spell of the past, and he was largely concerned with the experiences and observations of his own generation. Of course being highly connected, deeply learned, moving freely in all circles, not only in the imperial metropolis but in the different parts of northern and peninsular India, this celebrated poet and prolific writer had excellent opportunities of seeing and judging things for himself. He never professed himself to be a historian but gloried in being essentially an Indian and called himself the "Parrot of India". He had no religious narrowness or social and even racial prejudices

better than the moon, the expression amounted to a vow of separations, whether if a fly fell in a vessel of water that water could be used even though along with the poisonous feather the other feather which was its antidote, had been immersed in it; whether the water of a jar in which a *Karbash* (a poisonous lizard: Hindi *chalpasa*) had fallen, could be used for ablution, and so on and so forth. Our author makes a fun of the long-bearded regular observers of prayers and fastings who practised usury and made excessive profits by lending money and gold, and also of those who neglected their prayer in discussing the question of prayer and problems of *Fiqh* of the four schools of jurisprudence. He has no sympathy with those who were engaged in hair-splitting discussions of problems of logic and metaphysics. He writes, "O pedagog of religion and law, bad in disposition and fowl mouthed and big turbanned, what is the sense in wrangling over prayer when the time of prayer itself is missed." He writes, "there is no wisdom in that learning which represents and attempts to float the boat in a well. May that man of learning perish who defiles his learning by mixing it with envy and malice, and harms these creature of God. Verily, foolish persons want to cover the ill-concealed ignorance by attempting to make it forceful by loud voice."

The *Pandnama* or the letter of admonition forms a very interesting reading for the writer who throws much sidelights on his own disgusting experiences and he admits his own disllusionments. He tells us about the widely prevalent sins and corruption. 'Hama rui-zamin sail-i-fasad girafta ast' i.e. the world is flooded with deprevity and wickedness. The satanic people with their satanic ways had to be shunned ; cruelty, selfishness, lust, sensuality, inebriety and lethargy which were among the besetting evils, had to be kept away from ; liberality should be shown even to strangers for even a silly ass is generous to his wife and family ; royal favours which shed lustre but took away dignity should not be sought for ; craft which was a magnet attracting lawful means of subsistence towards itself, had to be resorted to and the indignity cf stretching out one's hands in supplication which was beggary, should be realised. The sweat on the silver-like forehead of the man who worked hard for lawful aims, was an alchemy. The Amir writes appreciatively of the weaver's craft and cobbler's profession and that they do for their lawful earning by dint of their hard labour. The *Kishawarz* (peasant or cultivator) plying his pair of ploughs in the field, cutting up the parched earth then irrigating it with their pearl like sweats which trickle down from their foreheads all the time, are at last rewarded with crops to which they apply their crescent-like sickle, and after cleaning the grains from the straw store it in the granary for the judgment day.

There is another aspect which may deserve cursory glance. The age in which Amir Khusrau lived was an age of moral deprevity, brutality and idle talks. The atmosphere appears to have been surcharged with corruption and also futile discussion of the trivies of 'Fiqh' and 'Hadith'. Amir Khusrau writes contemptuously about such people as *rabi* (usurer) and *zani* (adulterer) who resambled in form and deed and were the greatest among the sinners. He also ridicules pedantic '*Ulama-i-bahhas*' (disputent, dogmatic scholars) who indulged in profitless discussions in loud voices over such trivial questions as to whether a man could use the lamp oil ; whether it was allowed for one on the bank of the rivers to perfom *tayammum* or *Wazu* with sand instead of water ; whether when a man said to his wife that she was no

colletion of five treatises on Arabic grammar), *Sarf*, *Mizan* and *Munsha'ib*, the seeker received higher degrees of instructions in Madrasa or by sitting on their knees (*zanu zadan*) before learned divines in various branches of knowledge such as *Abad-o-Insha* (science of polite learning and Belles letters), *Ma'ani-o-Bayan* (Rhetoric), *Ilahiyat* (theologyg i.e. traditions, commentaries, law or jurisprudence), *Hikmat* (Philosophy, Mathematics and Airthmatic), *Ilm-i-Nazar* (speculative science); *Tanjim* (astronomy), *Tibb* (medicine), *Mantiq* (logic) etc. Though there is no express mention of curriculum or fixed series of studies required for graduation, we get reference to a large number of books on ethics, traditions, law, logic, scholasticism, mysticism etc. which may have been used in major fields of studies. Such are *Mashariq-ul-Anwar*, *Quduri*. *Zakhira*, *Maqamat-i-Hariri*, *Baizawi Jami-i-Saghir wa Kabir Lata'if Mufassal*, *Fatawa-i-Siraji*, *Misbah-ul-Doju*, *Ihya-ul-Ulum*, *Kashf-ul-Mahajub*, *Suluk-ul-Muridin* and the other books of Ghazali Majduddin Jajarmi, Zamashkeri, etc. There is no reference to examination held or any degree conferred, but we are told about *shamla bandi* (the ceremony of tying a shawl round the waist or throwing it on the shoulder or wrapping it about the head) which indicated the successful termination of educational career. The ideal to be kept by the learners (*muta'allimin*) was that by their studies and attainments each one should become a unique of the age (*yagana-i- ruzgar*) and reach such a stage in the advancement of knowledge that people might call them the second of *No'man* (the celebrated lawyer Imam Abu Hanifa) and the third of Shaikhain (i.e. the two worthy disciples of Imam-i-Azam, namely Imam Yusuf and Imam Muhammad.

In a long letter of counsels addressed by Amir Khusrau to his son Ghiyasuddin Ahmad, the importance of education and study (*Kitab wa ta'Jallum*) for differentiating the lawful from the unlawful has been emphasised upon. All such knowledge was to be picked up which could be put into practice but not in a way so as to make one a mere carrier of burdons like an ass carrying on a burden of books or a washerman's ass with loads of garments on it. Among the ten books mentioned for special study are *Quduri*, *Misbah-ud-Doja*, *Fatwa-i-Siraji*, *Zakhira*, *Muhit*, *Mabsut*. *Mufassal*, *Jami-i-Saghir-o-Kabir*, *Nafe'*.

even the pen was in mourning. A certain extract is well worth translating. "The benedictory prayer offered throughout these ten days, has been recei ed and the same time *Kuhl-ul-Jawahir* (collyrium mixed with ground pearls) placed in the special antimony box and folded within paper has been delivered to this sincere one. My pupil of the eye accepted it and it was applied to the black part of the eye. There was the book entitled *Maqtal-i-Husain* which also had been sent for. Because of the dust of the ground of that martyrdom which serves as an antimony for the penetrating sight of the true believers, that book had become so torn to pieces as you would say that in lamenting the fate of the Prophet's family members the garment got torn and was afflected; and its leaves had become highly disordered as if you would think that it had been struck at Karbala by a stormy wind". There is reference also to the distribution of alms and charities among the poor and the destitute beggars.

Although Amir Khusrau says that what emerged from his pen in the *Rasa'il* should be taked, as his *tasawwurat-i-zehni* or mental reflections, worth correction or refutation. The literary glimpses of social and religious life that we get are not all merely fanciful for many of the social customs that he depicts are not very different from those of today. Take the case of education which played a very important role in the social set-up of medieval Indla. The ceremony of initiating a Muslim child in the duty of reading and writing started with *Bismillah* and *Sura-i-Fatiha*: the child commenced learning to read by reciting in the name of God, and this was an occasion of social festivity. Letters of the Arabic alphabets were written on *takhta-i-chubin* (a school boy's written woodmade board) and the boy was made to put his fingers on each individual and spell them correctly. Later on the sounds of vowels and consonants, first separated and then combined were taught and care was taken to ensure correct pronunciation. Repetition of lessons (*takrar-i-sabaq*), according to necessity, in loud voice, was a must to fix them in the memory. The boy was taught prayers and benediction (*ai-tahiyyatand darud*). Some were made to be memorizers (*Huffaz*) and correct reciters (*Qari*) of the Quran (*Mushaf*). Passing through the elementary stage of private schools (*maktab*), and rising above the level of *Panj-ganj* (a

fasts when lips and mouths are completely sealed in respect of food and drink. The fast of *tai* (continuous fasting for 3 days observed by Sufi mystics) was observed. The 19th and the 27th of Ramazan was treated as Lailat-ul-Qadr or Shab-i-Qadr (when Quran descended from Heaven). The *tarawih* (an extra prayer and genuflexions with recital of the Qaran) was observed in the month and the fast was broken at evening with such kinds of drinks as *fuqa* (made of water and barely, and often of grapes) and sweets named *zaliba-i-nabat* (Jilebi), *lozina* (a confection of almonds).

Next is the reference to the two 'Ids.' Id-ul-Fitr or the festival of breaking the one month fast of Ramazan on the first of Shawwal, and 'Id-i-Azha or Id-i-Qurban, the sacrifice festival, held in commemoration of Abraham offering up his son, Ismail, on the 10th of Zihijja, the last Arabian month. The former was marked with great pomp and festivities; children were decorated and dressed with clothes of *harir* (silken garments); people ran to the *Idgah* to offer the *dogana* (two genuflexions in prayer). There was also beating of the drums nine times announcing the happy termination of the fast. Bread and halwa placed on trays were sent as presents from house to house. The *Gulabdan* (vessel for rose-water) was in constant use and so was the sprinkling of perfumes. The devout observed also *shesha* or Sheshroza or six days fast after Id. As regards the festival of sacrifice an ox or sheep or camel was sacrificed in discharge of a vow and the pilgrims at Mecca performed the rites of *Ihram* or the act of putting on a special dress and halted at Arafat (a sacred hill, 12 miles from Mecca). As regards India our author refers to the sacrifice of *gusfand* which means a sheep, a ram and a goat and to the offer of the usual prayer and also to the three days of *tashriq* turning the face eastwards and saying 'Takbir' i.e. Allah-o-Akbar).

The first ten days of the Arabic month, Muharram, are held sacred on account of the martyrdom of Husain, son of Ali and Fatima at Karbala, on the orders of Yazid. The tenth of the month is called *Ashura* which is the day of the celebration of the Muharram festival. Amir Khusrau describes the ten days and *Ashura* as the days of the slaughter of Husain for which

organization. For the Hindus the tradition had been built up of festivals for religious rnd commemorative purposes and the exact time and mode of conducting them had been fixed. They served as occasions of trade, amusements and recreation and display of devotional sentiments. The influence of festivals on social life and family relations of the Hindus was great. Somewhat different was the case of those of the Muslims. Amir Khusrau has written in his own way about all the important Muslim festivals such as Id-ul-Fitr, Id-ul-Zoha, Shab-barat, Muharram, Ashura, Nauroz, Prophet's anniversary, Lailat-ul-Qadr. Nobody knows the exact date of the birth, more specially of the death, of the Prophet of Islam. But people had taken that to have happened during the first 12 days of the month of Rabi I. This has been rhetorically referred to :

روز وفات بود قبله و بعده نیز با باید .

The letter *ha-i-hawwaz*, 27th of the Arabic alphabet counts five reckoning by *abjad*. Adding it before and after *ba*, the second letter of Arabic which counts two, we get 12 when Fatiha prayer is offered to the Prophet.

The 14th day of the month of Shaban and the night preceeding the 15th is generally called Shab-i-Barat which is appropriated to the commemoration of the dead ancestors and saintly personages; On this occasion the Muslims make offerings and oblation to the deceased. It was, as it is even now, believed that the Divine Predestinator apportions or bestows what is necessary for the support of life on the 14th. Referring to it Amir Khusrau writes 'commission or assignmeant of various kinds occurred on the occasion along with exemptions and immuniiy' He describes the 14th night as 'Lail-i-mubarak barat' 'Rozi-i-qismat-i-mubarak', refers to the observance of manifold prayers and night vigils, and tells us about the illumination and fire play of the children. The innocent children indulged freely in the play with fire and in throwing fire works and the whole town looked carnation-coloured garden like bright coloured red rose. He adds that every one, according to his means, sent lamps to the mosques for illumination. (*Rasa'il IV* p. 325). Then comes the month of Ramazan

matrimony, deserves in the opinion of the man, three divorces. But although a man may be water and fire (tears of grief and anger) the woman will have an upper hand because of the weapon of the paper she has in hand (i.e. Mehr or the marriage portion settled upon the wife before marriage). It serves as a chain binding the neck and the throat. But *mehr* (kindness) may become a bond of affection if between the two there is nothing *zir-o-zabar* (topsy-turvy): for a woman's affection (mehr) for man is far better than matrimony (mehr): but for man mehr (fondness) for woman is far worse than mehr or the bridal gift (fondness would lead to submissiveness and the peace of life would disappear). In these literary figures we get indication of polygamy, widow remarriage, termagant woman, docile husband, divorce and more specially dowry which sometimes served as a deterrant to a capricous husband. Perhaps Amir Khusrau disfavoured marriage with widows for he writes :

آنکو زنکهٔ پیوسته را زن خواهد درخانهٔ او خاستهٔ زن باشد .

'One who takes a widow as his wife, in the household everything will be as desired and wanted by the woman.'

Leaving aside the rhetorical parts some facts dealing with or reflecting the social life of the time can be easily drawn. But as the writer did not write for the historians. references to social customs and manners are scattered, disconnected and scanty, and even after a careful analysis there are difficulties in getting a full picture. The descriptions of contemporary society are often of imaginary society and necessarily coloured. But if we do not stick closely to the textual representation, with all their limitations the reference and allusions will be found to be very useful for constructing the life of the past.

Let us consider what Amir Khusrau says about festivals and festivities so as to see whether we get a picture which was as true to contemporary life as to that of the present. Muslim festivals as compared with those of the Hindus, are fewest and are not so closely inter-woven with religious worship and social

paraphernalia of marriage portion, rich ornaments studded with jewels and precious stones for head, neck, forefingers and feet have been referred to (*Rasa'il* II, p. 120).

Some were happy marriages, there being complete identitiy of views and sentiments; but sometimes, conjugal relations became loose and the relations between the couple became strained, largely due to the fault of the wife. The wife of Najibuddin was very harsh-tempered. To add to the trouble the father, Khwaja Saleh, was also of hot and sour temperament and he made the situation for his son-in-law so bad as to compel him to flee to his uncle for protection. Fortunately, the venerable aunt of the bride with rosary in hand intervened and expostulated with her brother. "Your son-in-law stands in a position of your son, and it is not advisable to cause separation of the wife from your virtual son." She cited the examples of 'Ayisha and Fatima, the prophet's wife and daughter respectively, from whom the lessons had to be learnt. We get in the *Rasa'il* an imaginary account of two beautiful, wealthy, grown up, highly chaste girls whose wealth attracted a greedy man who was bent on using force to have them. Fortunately they enjoyed the fatherly patronage of Khwaja Ariz who saved the situation and one of the two girls was given in marriage to his adopted son named Jauhar who was born of a chief (mehtarzada) but was a writer by profession. (*Rasa'il II, p. 60*).

While offering his hearty congratulation on the marriage of a certain couple the writer warns the husband against subjecting his will to that of his wife for yielding and submission might turn ease and comfort into pain and affliction. When one allowed one's hand to be clenched with that of the wife like henna it would not be strange if one's hand became bloodstained. If an old man gave ear to and submitted to the sermons of the woman, the woman would turn into man. Let not the 'arus or bride become the Shah or a king.

Incompatibility, infertility or other things led to separation of the couple by means of divorce. A man possessing two bags of dirham (one who has two wives) is in the view of the woman a double-shelled dice, and a woman who has entered twice into

Felicitation and offerings of presents also took place. There is very fond of his mother, speaks highly about her, and even in advanced age loved to sit at her feet. He writes much about the duties of the sons or daughters to their parents, specially to their mother at whose feet lay the paradise, and whose services could never be required adequately in presen. life. Yet he was much too obsessed with the idea of privacy and seclusion. He always uses the word *mukhaddarat* which means a virtuous woman, concealed behind the veii of chastity, true to the marriage bed, and always veiled when going abroad. He wished young vergins to be kept retired, behind the curtain. They were possessed of their own property, besides the irrefutable claim of bridal gift from husband, an essential element in marriage; but they were looked down upon as of the inferior position and subordinate to man. Some of Amir Khusrau's dictum says

عروسی را که پس غربال نهان کنند بیختنش حاجت نیست .

'The bride who keeps her face concealed behind the sieve does not require sifting'. And yet like many the birth of a male child was more welcome to him than that of a daughter. In *Hasht Behisht*, addressing his seven years old daughter he wrote, " Would to heaven that you could have come out of the mother's womb as the child of eight months (who usually do not survive)." But immediately after turning his language from such an obvious meaning, he writes, "But as what is God-given has to be judged right and proper, and it is sinful to quarrel with those who have been the gift of God, I have accepted whatever the Lord Almighty has bestowed upon me. What He has given cannot be turned back. I offer my thanksgiving for whatever has come 'from His door. He gives only to the deserving what is suitable and becoming to him". He goes further and says, "At any rate, my father also has come from a mother, and my mother has been the daughter of some one." He concludes "that it is possible for one to be born without a an allusion to a marriage in a high circle between Malik Najmuddin, son of Malik-ul-Jibal Hasan with Zumurrud Khatun, daughter of Malik Asad Shamsuddin. The bridal throne the

father, as has been proved by the birth of Messiah from the sinless Maria, but without a mother of happy existence nobody speaks of any one to have been born."

Amir Khusrau was a wealthy personage, but he exhorted his daughter never to give up her work at the spinning wheel; never to indulge in peeping from behind the door or the curtain, or cast her looks in different directions; never to forsake the women's spindle (*duk*) and the needle (*suzan*): never to neglect the use of veil or concealing sheet of cloth; and to always keep her face towards the wall and her back towards the door. According to him, "the woman who walks or runs in streets is not a woman but a bitch". He did not like woman's excessive fondness for embellishment of her body and much too adorning of the face for that might cause mischief, disgrace and ignominy. Also in his view "when the expenses of the wife exceeded those of the husband, the affairs of the household would become topsy-turvy.

Marriage as expressed by the terms *Kabin* (matrimony), *Nikah* as a social institution, and polygamy, keeping and purchasing slave girls, and divorce as prevailing social customs have been frequently alluded to in rhetorical language. The hand of a grown up girl was sought by suitors, sometimes by themselves, but more usually on their behalf by their parents. It, however, depended on the father to give consent to the marriage after consulting his relations. Bakhtiyar Amjad offered himself in marriage and gave an account of his high social status and also the wealth and prosperity that the family had once possessed; but the circumstances had changed for the worse. He had, however, many personal qualifications. (*Rasa'il* V, p. 314) On the occasion of the marriage the usual Quranic verse beginning with "fankehu hunna" (perform Nikah) was recited, and among the rites *Jalwa* (the meeting of the bride and the bridegroom in the presence of the relatives, and showing the face of one to the other through mirror) and scattering and throwing about money and flowers called *Rikhtani*, have been alluded to. There are frequent references not only in the *Rasa'il* but also in *Ashiqa* and *Dewal Devi Khizr Khan*, to some of the marriage rites and ceremonies, ornamentations by the bride, *mashshata* (bride's dresser), *takht-i-arusi* (bridal throne), *hajla* (the bridal bed with mirror and ornament).

consolidated picture of the society, as it existed in such a distant age, on the basis of isolated and disjointed fragmentary pieces, incidental allusions and references to men and events, and social divisions of castes and labours, yet the way in which the various classes of people, with their habits and manners, good and bad, have been referred to, suggest that we get glimpses of real contemporary life at the end of the 13th and beginning of the 14th centuries. The Amir refers to *Wazi'-o-Sharif* (nobles and prebians) *ashab-i-amal va shughl va hirfa* (workers, artisans and businessmen), *mashaikh* and *ulama* (the pious and theologians), *hukama* (philosophers and physicians), *muzakirin va mutarassilin* (preachers or letter-writers) who formed the upper stratum of the society. He also refers to *arazil-i-qaum* whereby he meant the ignoble sections of the society. They included *halwagaran* (confectioners), zar-kuban (gold-beaters), load-lifters, vessel-bearers, slaves, males and females, and also corrupt dishonest merchants, shopkeepers, money-changers, usurers, etc. His references to social divisions, market places, goods produced and sold by independent artisans on small scales suggest the existence of corporate bodies of artists and artisans, manufacturers, hoarders and marketeers. Amir Khusrau was conscious of the dignity of labour, and writes with admiration about the skill and knack shown by even such people as weavers and cobblers, blacksmith, ironsmith, etc.

But, perhaps he did not like that the professional artists and artisans should abandon their hereditary avocation and take to new lines of work. In this connection we may quote a line found in *Rasail*.

ضحك الورا اذ سل سيفا حائك

This means that it would look as funny if the weaver takes up and wields the sword ; people will laugh at those who cross the limits of what they have been cherishing in their hearts.

Judged from modern standards, Amir Khusrau's views about the females of his time may be taken to be very conservative and preservative of old traditional principles and practices. He was

There is an interesting sentence, "Musha'bid or the juggler or the conjurer (Hindi nat) swallows swords and daggers so that, through those wound inflicting implements, he may have a share in ease and comfort." There is a suggestive verse as

جوله ازین شرم که شد سایه شین   رفت فرو تا کمر اندر زمین

'The weaver blushed lest the shadow of disgrace should fall upon him and, therefore, desended upto his loins into the ground.' This refers to the weaver's shop or loom or *kargah* which has a hollow in the ground in which his feet play (work) moving from side to side or in and out.

Some terms and words convey something pertaining to the society — such as *masura* or the reed used by weavers to wind their thread upon; *nushra-i-tiflan* i. e. anything including amulet or charm for children to drive away evils. Another word is *minwal* or the beam or wooden stick of weaver's loom on which he rolls, twists and turns the cloth

کسی نداند که کسوت بخت بچه منوال بافته شود .

'Nobody knows how the frame or texture of his fate would be twisted and woven.' Many tit bits indicative, to some extent, of the atmosphere of the age can be found in the *Rasa'il*. In India a usage has developed that tne conjurors practise their charms or incantation with the help of their reed. Whomsoever he strikes with his reed becomes docile and submissive. We get an interesting reference to the token coins of leather "Diwan-i-Charmin"
"There is nothing surprising if by the enforced command of the august.........the leather dirham has been now current.'

Only those who are prone to taking one sided and unhistorical view can say that Amir Khusrau was an advocate of equality and universal brotherhood of man, and that he was entirely free from bias, prejudices or discriminative attitude. Though it is not quite safe to come to a final judgment about the life and paint a

while they were at work, earned hundred dirhams a weak, but freely donned the garb of their clients.

History is not a matter of imagination but of observations and study of evidences written or oral, direct or indirect. Indirect evidences furnished by literary sources may be sometimes misleading and liable to be misinterpreted; and yet they cannot be ignored altogether. Allusions and references in the texts even in their literary garb, have some essentials of historic value. The *Rasa'il* furnish many concrete examples. A few *tambolis* (betel-leaf sellers) who frequently brought these goods from the side of Gujarat were once carrying the load of these silvery pungent commodity and were passing through the jungle. They were suddenly attacked by some armed horsemen, who were the Rawats of Jalor, just when they were resting around a very old well. One of the tambolis drew out his 'Khanda' for self-defence but this provoked the assailants all the more who killed him along with a large number of his fellow people. Only a few survivors came to lay the complaint before *Majilis-e-Ala*. A similar plunder occurred when a caravan laden with such commodities as cloves and saffron (?) was proceeding from Bihar towards Agra and was passing through a Mango grove known as Chandranath. Sunbul Bihari was told that the whole of Hindustan was filled with the fragrance of alove-wood emitting from the perfumed mausoleum of the martyred saint at Bahraich and it behoved him and the members of his fraternal assemblies to banish the air of comfort and the odours of the pleasantness of life at Khalakhar (Kilokhari) which is at Delhi and, for Raihan (Imaduddin) the rebel had became so headstrong and powerful that he arrogantly asserted that he would destroy Sumbul root branch. We know that Salar Masud Ghazi, reputed as a warrior-saint and a nephew of Sultan Mahmud of Ghazni had fought against, was slain by the Hindus, and lies buried at Bahraich (U. P.). He had become a myth in the 13th and 14th centuries. Two Tughlaq sovereigns and Sultan Shamsuddin Haji Iliyas of Bengal paid their reverential visits to his shrine at Bahraich. Kilokhari, the new city of Delhi, had been colonised by Kaiqubad and Raihan, the Indian born rival of Balban, had once held charge of Bahraich in Muharram 657, five months before his overthrow and death at the hands of Malik Sanjar.

'On sneezing one should say praise be to God so that the heaviness or contraction may disappear.'

هرکه او (قمر) را دید چشم نگشاید مگر در روی خاص وعام .

'On seeing the new moon one does not open one's eyes except to glance first at the face of people high or low.'

رسم چنان بود که هرکه تقصیر میکرد او را در صف نعال کنند

'It is the custom that one who committed a fault or sin was made to stand in the place where shoes and slippers are left before being finally disposed of.'

In *Aina-i-Sikandari* and also in the *Rasail*, the poet laughs at some typical manners and customs of the Hindus.

بسی ابله هندوان کلال بدست آب نوشند باصد سفال

'Because of sheer foolishness the Hindu-potters drink water out of their palms inspite of the fact that they have hundreds of earthen pots besides them.'

Elsewhere he writes when the snake charmer catches a snake he (foolishly) nourishes such a bloody thing with milk. He refers in many places to the cow-herds who, though they carried their animals to houses, managed to mix water with milk and charged the price at the rate of milk. We are told about the tailor whose double-tongued scissors, inflicted injuries on something not belonging to him, and at the same time who shamelessly tore out a piece or patch for his own private use. Significantly enough Amir Khusrau disfavoured the manufacturing of arms and weapons of war for these implements inflicted injuries on the body of human beings. He also disapproved the profession of a goldsmith who pretended that the scum or dross of gold was purified by heating it with *kafshir* (borax or Hindi sohaga) but he actually managed to steal bits of gold. He rediculed the washermen who uttered *si si*

هفت و نهش کرده چو ماه تمام　　جلوه کنم در نظر خاص وعام

'Seven plus nine' or sixteen refers here to 'Solah Singar' or the sixteen ways of embellishments or ornaments of the Hindu ladies. The same thing has been referred to in a line addressed to the poet's daughter Mastura in the line

چون شدی بهر هفت و نه در رنج　　نقد عصمت فتاد در شش و پنج

'If you feel grieved for lack of 'seven and nine', the current coin of chastity will fall 'in sixes and fives' (distress)'. The references are to the articles of the ladies' toilet, dress and ornamentation, henna, *wasma* (woad), *surma* (collyrium), *surkhi* (red colour), *ghaza* (face-rouge), *safidab* (white paint), *ghalia* (civet), *sar-aweza* (head-dress or veil), *gushwara* (ear-ring), *silsila* (chain), *halqa-i-bini* (nose-ring), *galuband* (necklace), *bazuband* (armlet), *dastana* (bracelet), *khalkhal* (ankle-ornament), *angushtar* (ring), etc.

مخدرات موی ز فرق راست راست کرده

The veiled ladies divided their hair in a straight line at the top of their heads ; this is called in Hindi *mang*.

چون از نون کن متولد گشت صیت احمدی در گوش بانگ نماز دار .

Here is a reference to God, the omnipotent, Lord and Creator and to the Quranic verse "Be, and it was or is", and also to the age-old practice of sounding the call to prayers in the ears of the new-born child.

چون عطسه زند الحمدلله گوید تا سنگی بر طرف سر.

of such puzzling amphibolous words and expressions. In connection with the description of betel leaf he uses the words *Warak-i-Kafuri* which means both a white paper and also a *Kafuri* or *Kapuri Pan.* The expression 'Barin Muhimm-i-buzurg birah fitad', 'birah' means betel leaf made up, and if read as *herah* it means in Persian deviation from the right path. Then there is "pishi an jan-separi kunad" which in Persian means resigning one's life into that of another, while *Supari* is the Hindi betel nut. We get also the use of Nura (quick lime) and chuna which in Persian is *ahak* or lime and it also can be read as Chunna that is how like that. There is a sentence with "Mung Mung Maash Maash" which if read in Persian, indicates multiplicity, while the Hindi Mung and Maash are vetches.

There is a line in *Rasail*

جولاهه و تننده هر دو همکار اند وعکس یکدیکر

There is a pun in *jo-lah*, the latter meaning a kind of red silken stuff. The weaver and the spider have been likened with each other as the former weaves cloths of cotton and linen for garments and robes and the latter weaves a cobweb. In both cases the warp is rolled round and carried over the comb or the stick respectively.

As a court poet Amir Khusrau was mainly concerned with the affairs of the elite of the court circles. but his word-pictures give sufficient indication of his interest in the social life of the common people and his keen sense of observution enabling him to depict the views, feelings as also the habits and external practices of the masses. In the *Khazain* he writes

بنکر که چند جانهای دیوان هندو در غبار لشکر پادشاه کرد باد
شده اند-

'Behold, the spirit of so many Hindu demons which are revolving in the whirl wind of dust shooting up from the ground of the royal camp'. Many still believe in gobling or spirits called *deo-bhoot* which haunt and lurk in what is called *bagula* in Hindi and *gird-bad* in Persian. In *Matla-ul-Anwar* we get a line

رسیدی بدیدی مرا دی بخانی　　　زمانی بباشی بیاری بشائی

The first means 'you came yesterday, saw me in the house; if you halt a little you will be deserving a friendship'. In Arabic it would mean 'you are my guide and my match capable of salvation, the object of my desire, I feel disgusted for my women are quarrelling.' More important, however, are such lines in the preface of Ghurratul-Kamal and in other works which show the Amir's mastery over the Indian languages.

آئی آئی همان بیاری آئی　　　ماری ماری براه موری نائی

There is another elsewhere :

کفتم صنما بهای زلفت چه بود　　　آواز برآورد که در در موئی

The last words are significant, meaning either that 'each hair is worth a pearl' or what is the sense in Hindi 'begone, you rogue.' The word *Jauhari* in *Qiran-us-Sadain* and many places in the *Rasail* has been used in double sense, jauhari meaning jeweller or 'Jau' meaning barley, and 'Hari', that is diety. In the line

داریم آرزو که حکایت کنیم بات

the last word is Hindi which may also be read as *pat* meaning *barg* or leaf. In Persian it may stand for 'Ba-to' or 'Pae-to'. There is a couplet :

هر برهمن که دید رخ خوبت ای صنم
زنار را گسست و لکد زد بروی لات

Lakad in Persian means kick and so is *lat* in Hindi but the latter also means an idol worshipped by the pagan Arabs of Mecca. The *Rasail* furnishes numerous examples

been strained and torn off. A Muslim pilgrim to Mecca met him on the way and questioned him about his strange affair of crawling and wounding his body when he could easily walk on his feet and reach his destination safely and in a shorter space of time. The Hindu ascetic replied that he had dedicated his life to the god of Somnath which was the object of his worship. At this our author remarks that one, instead of deriding this attitude, should appreciate the sincerity of devotion and fidelity to the object of worship shown by the Hindu. He exhorts his fellow people and co-religionists to appreciate the spirit of self-sacrifice and imbibe such feelings.

I have already written elsewhere about different classes of people, good and bad, high and low, their essential needs of food and drink, cloths and garments, dwelling places, both lofty mansions, thatched houses and leaking huts with holes for sunrise and rain water to get in, and also separate papers containing Amir's observations on the principle and practice of music, listing more than two scores of merits and demerits, each side, of betel leaves Pan, hunting excursions with animals and birds of hunt, and have published a fairly big paper containing gleanings about social and economic aspects from the works of the Amir. The pen-drawings of Amir Khusrau in his poetical works or in *Rasail-ul-E'jaz* which, in size, form and contents, are quite different from his other works and are replete with multityped figures of speech, have also got their importance, for besides showing his extra-ordinary power of inventing new literary devices, they are helpful for a correct appraisal of his contribution to Hindi. His suggestive allusions to the manners and habits of the people in his time are no less interesting. He gratified the needs and desires of his contemporaries by providing literary food to them through his amphilogies or *iham* in which his words and couplets are to be read both in Arabic and Persian or Persian and Hindi. There are his anigmas or *mu'ammas* of various types centring on many things. Such acrobatic verses or sayings, include what the Amir calls *Sanayi and Badayi.* One is called by him as *do ruya* which is read in different ways. A certain Persian couplet may be turned into Arabic when entirely different meaning can be read:

be astonished at. A love-stricken Hindu woman was unique in that she dashed herself to death like the moths at the candle.

چون زن هندو کسی در عاشقی دیوانه نیست

سوختن بر شمع مرده کار هر پروانه نیست

هست عجب مردن هندو به وفا　　　مردنش از تیغ و ز آتش به جفا

He admired the dying either oy the sword or by burning in the cruel fire of men and women. The woman burnt herself due to love for her husband and the man practised self-distinction for the idols whom he worshipped as his lord and patron.

Although in Islam such things are not allowed, but see what great deeds, these do :

گر به شریعت بود این نوع روا　　　جان بدهند اهل سعادت به هوا

'If such kinds of acts had been allowed by the Shariat or religious law, many virtuous people would have gladly sacrificed their lives for the sake of the object of their love and devotion.'

Besides *Nuh Sepahr*, such appreciative verses are found also in *Ashiqa* and elsewhere. In the former we are told about a fire worshipping Hindu who being urged by his inner spirit of devotion tore off the skin of his limbs and threw them like parchments in the fire. Being chided for such an insane behaviour, said to be an act of worship, he replied that the questioner could not have seen the smoke arising from the fire of his grieved and anguished heart. What he did was to attain his object which was union with his beloved, separation from whom was like a dark gloomy night. According to Amir Khusrau, such a spirit of devotion and dedication should not be light-heartedly condemned. A similar story is found in *Laila Majnun* where we are told about a Hindu ascetic who, while proceeding on his pilgrimage to Somnath, was measuring the road with his paces. Lying on the ground with his face downwards he dragged himself slowly, step by step, with the results that much of the skin of his breast had

was meant for the Muslim readers. They are said to have been in comparable ring dove and turtle doves (fakhta and qumri) quite distinguished from the black crows (Zaghan Sayah ru) characterised by darkness of unbelief and infidelity with hearts full of black biles of errors and sins. Throughout the bulky volume one comes across of only 6 or 7 names of the Hindus. Balchand, the crow faced, Saunpal, the zargar or goldsmith, Narayan raughangar or oil presser, Nepal Khuta, Deochand etc,. All other names of different sections and of sexes and racial extractions are those of Muslim society. Amir Khusrau writes derisively and sarcastically about many of them also, but he showered choicest condemning epithets on the people of the major community.

We cannot miss the marked contrast in the writing and feelings of the great patriot and the first national poet of India. There are not factual evidences of many things recorded in the *Rasa'il* but what we find in the work leads one to think that the Amir had not got out of the rut and risen above the level of men imbued with false sense of superiority and resembling the narrow minded Mullas and conservative and even reactionary theologians of the time, despite his deep devotion and sincere attachment to the renowned Chishti Saint, Hazrat Nizamuddin Aulia Mahbub-i-Ilahi who was an embodiment of large-hearted liberalism and catholicism. The Amir, sometimes, fails to furnish proofs of his broad-minded views of toleration. The credit that is given to him for initiating and releasing the sympathising forces, liquidating barriers, social, religious, racial and linguistic, and making the development of the common cultural phases and outlook a reality, will require more cogent, authentic and specific proofs, than what we get in the *Rasa'il* which catered to the tastes, desires and tendencies of his Muslim fellow people.

The Hindus very often extorted the admiration of the Amir. This we find mostly in his Masnavis. In *Nuh Sepahr* he writes about the remarkable fidelity of the Hindu males and females to their object of love and devotion and incidentally he tells us of the age-old socio-religious customs which formed a confirmed feature of India. The dying of the Hindus for expressing their fidelity and sincerity was not an uncommon affair and such as to

pen; that as long as I do not pat it at its back with my hand, there is no playing to and fro; and that as far as the sword was concerned I had no hand over it in any way."

In the long account of this *Ma'rika-i-Saif-o-Qalam* there are other things which can be peeped through the figures of speech. Being touched and inflamed by the oral reproofs of the sword, the pen became highly infuriated and began to emit the blackish smoke of its heart's core like the reed pipe (flute). It said "Oh you who are like a juggling Hindu (*Hindu-i-Qarachuli*) and have become a protege and plaything in the hands of the Hindus; being deeply immersed like the Brahman in the Baids (Vedas) you are slumbering as a faithless one (bedin) within the scabbard with your bodies smeared with ashes like the idol worshippers of Benares; and you consider that to be the purification of your soul. You call yourself a Mehrabi (the curved or arched blade of the scimeter resembling the arches of mosques) and bring on the question of woollen garb and the shearing of the pain of the head."

One feels tempted to compare what Amir Khusrau writes in his Masnavis or *Qiran-us-Sa'dain*, *'Ishqia*, and particularly *Nuh Sepahr* with what one finds in *Miftah*, *Khaza'in*, and much more in *Raza'il*. One can understand and also make some allowance for what the Amir writes about *Hinduan-i- palid* (of impure faith) and *Dauzakhi* (hellish) in *Miftah* and *Khaza'in* for they deal with wars and campaigns against the infidels, but it would not be so easy to explain the highly derisive language used in the *Rasa'il* which does not deal with campaigns and conquest in a country dominated in number by the unbelievers. It does not look well for the great patriot and sincere lover of India which he took to be a paradise on earth, to refer to it as an abode of darkness (*Zulmat-i-Hindustan*) and to the Indians as men of bad faith (*bad kish*), crow-faced (*zaghru*) with hearts as hard as iron grown rusty (dil-i-ahanin zangar girefta). The *Rasa'il* was not written with an eye on the good will of men like Qutbuddin and more specially of the renegade Hasan Khusrau and the latter's relations and fellow people of Bradu tribe of Gujarat. This work, colossus in size, overburdened with a profusion of figurative language, and of artificially constructed words and expressions conveying far-fetched double meanings,

and their religious philosophy and culture had good deal of justification for his enthusiasm and pride in being a Hindustani and the parrot of India had to thank his Indian rather his Turkish ancestors. Though he often accompanied the army while it was on the march or active in the field and he writes much about wars and armament, strategy, organization, implements, equipments and weapons of various kinds, he never gave evidence of his warlike propensities and martial pursuits for which the Turks have been world famous. Neither he nor anyone of his contemporaries or even any later writer has given the least indication or reference that he weilded his sword, grappled with his enemies and shed their blood. He used his pen and not the sword against the Mongols who had taken him along with his friend, Hasan Sajazi, the Sa'di of India, as their captive, and dragged them for miles and miles together by tying them with ropes to their horses. Hasan never wrote a word about it but Amir Khusrau chastised them by satirizing the barbarian hords who wore baggy cotton cloaks and caps of sheepskin, had extravagantly long mustacheo and scanty goat beards and their bodies were covered with lice and they devoured dogs and pigs with their nasty teeth in their foul emitthing mouths. He was conscious of his weak point. In *Ghurrat-ul-Kamal* Khusrau compares Poetry with Music and gives reasons for his preference to the former. In the fifth of his *Rasa'il* a considerable portion has been devoted to a dialogic contest between pen and sword with the scale being made eventually to weigh heavily against the latter. A portion of the concluding extracts shows the Amir's self confession. In this contest the pen was at its best in giving lucid exposition of its view point, and the sword was manoeuvring to take the offensive and rebut all the propositions and arguments of the pen. Suddenly the pen tipped its point in the inkstand, and the sword getting its opportunity, turned its face towards me and said, "Oh Khusrau, you are a Turk and a gem of the sword: come and support me by lending me your helping hand for my strength lies in the strength of the arms of the Turks. I replied that I was indeed a Turk but only in (physical) forms, that my affair could not be well-settled (regulated) without the aid of the

هست یکی این زمین از دور زمن   هست مرا مولد و ماوای و وطن

and secondly, that according to the sayings of the Prophet of Islam, patriotism and love of one's country is an article of faith :

وین ز رسول آمده کای زمره دین   حب وطن هست ایمان به یقین

He never went outside India which was regarded by him as a paradise on earth

کشور هند است بهشتی به زمین

He admired the simple living and high thinking of the Indians, specially the learned class of the Brahmans, who though scantily dressed when performing his ritualistic ablution in cold water at dawn, carried such a great store of learning in his breast that he could tear to pieces all the canonical works of Aristotle :

برهمن هست که در علم و خرد   دفتر قانون ارسطو بدرد

His highly eulogistic descriptions of India and the Indians had some solid foundations. For example, though somewhat exaggerated, his references to the skill possessed by the Indian in producing very high order of textile fabrics and the garments made out therefrom are supported by other evidences :

جامهٔ هندی که ندانند نام   کز تنکی تن بنماید تمام
مانده بپیچیده به ناخن نهان   باز کشائیش بپوشد جهان

And much that he writes about the peculiar features and contributions of the Indians, their store of knowledge and learning

racial extraction, Turks and Hindustani. He refers to his father, Amir Saifuddin Mahmud Shamsi, an immigrant Turk of Lachin tribe, who died fighting in an Indian battle when his son was yet within his teens. He writes much about his maternal grandfather, a converted high caste Hindu, perhaps a Rawat or Rajput, who held the important office of *Ariz-i-Mamalik* and *Rawat-i-Arz* or defence minister for a long time under such a powerful sovereign as Balban who had a very poor opinion of low class people. The heritage of Amir Khusrau from his Indian-born mother and grandfather was greater than that from his paternal side. He admits that he was the offspring of a mixed parentage. He writes :

ز نسل عارض اسود منم آن نسخت معنی
کز اهل خویشتن یك یك نشانی باز دادم من
سوادی بود از نازکترین دیباچهٔ دولت
ز نوك کلك تقدیر و بیان آن سوادم من
خسان را من کنم غرقه گهر را من کنم اجرا
از آن ابر سیه بین طرفه دریائی که زادم من

Describing himself as 'turfa darya' or the wonderful stream and his maternal grandfather as *Abr-e-Seyah* or black cloud, he tells us that he not only belonged genealogically to that black complexioned *Rawat-i-Arz* but owed much to him for his teaching and education, and it was he who inspired him to cultivate his mind and acquire his varied and manysided accomplishments. The sharp and penetrating intellect and the skill to manipulate words and expressions in a variety of ways, were the legacies and an inheritance of his Indian parentage. Besides his intellectual brilliance, his amalgamating and progressive tendencies, his patriotism, intense love for the country of his birth, and his admiration for the contribution made to the world of learning and culture by the Indians can be easily explained. He was quite sincere when he assured his critics that his preferences to India were due mainly to two factors, first that it was the land of his birth,

country. For moulding his notions and sentiments to suit the prevailing atmosphere the poet was rewarded with an elephant-load of wealth.

Quite unlike his much talked poetical work *Nuh Sepahr*, was the imponderable rhetorical work, the *Rasail*, in which the Amir has wraught his literary marvels. The work treats mostly of the people of different types and may be taken to serve better the purpose of those who are interested in social history. It was not an outcome of a desire to please those who were high and mighty nor was it meant to serve the purposes of propaganda. Except the high pitched laudatory epithets lavishly showered, not without some justification, on Sultan Alauddin Khalji, but quite undeservedly on such a man of vile and worthless character as his son and successor, Qutbuddin Mubarak Khalji, who has been atrociously designated as "Hami Hamat-ul-Islam Wal Muslimin" and made to resemble the first of the orthodox caliphs who succeeded the Prophet and the second caliph well known for his justice (Adl-i-Umari was brought back after 700 years-he writes), there is little or nothing in this work to challenge the credibility of the author or to ascribe any mundane motive to him. The varied contents of this work marred by a profusion of figures of speech, curious specimens of verbal quibbles, puns and puzzles, and various kinds of literary devices, all being the invention of the writer, may be confusing to a modernist and are not easily intelligible and understandable to a reader of an average capacity. But they have got the value in that they have a great relevance to the spirit of the time and the tastes of the people. Amir's literary effusions in this work relate to the people and represent the portrayal of their social lifes and cultural forms of activities and of the behaviours of various classes of people, mostly of Muslim faith and professions and of the urban areas.

Amir Khusrau was the product and also an exponent of a new epoch and of a synthesised culture which was made up of elements, alien and indigenous, with opposites reconciled so as to appear as one unified whole. He was one of the rare types of writers who are self-revealing and self-expressive of their personalities, modes, emotions, thoughts and opinion. His personality was a sample of a cross-section of population combining the qualities, traditions and culture of different types of

and rhetorical works of Amir Khusrau may turn out to be very valuable working hypothesis for sociological studies. One has to apply historical methods for enquiring into the reality of things about the social aspects of the period. In judging Amir Khusrau as a social historian from his literary works we have to differentiate those which he wrote at the behest of kings and princes and deal with the courts and courtiers, costumes and apparels, varieties of menues of the table, appurtenances, equipments and parapherenalia, displaying their pomp and grandeur, from those which he wrote because of some inner urge and impelling influences to display his talents and press his view-points about arts and letters upon the attention of people of literary tastes. We should not be oblivious of the fact that the Amir had his limitations as a social historian. Much is made of the oft-quoted *Nuh-Sepahr* in which the writer is at his best in asserting the superiority of India and the Indians to all the countries and peoples of the world. He has written in it about the climate, famine, flora, and fauna of India, knowledge and learning of the Hindus, their contributions in scientific, literary and cultural spheres and to religion and philosophy. All this is taken as proof positive of the poet's passionate patriotism and his emotional love for the country of his birth. One should not ignore the stark reality that the great poet writes differently and rather contemptuously, about the Hindus elsewhere. His much admired Brahman of *Nuh Sepahr* loses his lustre in *Matia-ul-Anwar* where he says that the cow worshipping Brahman is an ass and so is one who venerates the cow-dung. He had a remarkable knack of swimming along the currents, changing and adjusting himself to every changing situation, and worshipping the rising sun, completely forgetting the benefits he had received from the sun that was set. It is not reasonable to suppose that his real feeling of respect and regards for the Indian intellectuals and emotional attachment to and love for the land of his birth was mixed up with and was influenced, to a considerable extent, by the desire to please the particular social group which was then in power. We can presume though we have no clear evidences that he was motivated to please Hasan Khusrau and his Baradu fellow-tribesmen who held a dominant place in the court, freely practised their Hinduism, and were perhaps imbued with the idea of changing the political complexion of the

widely travelled. Moving freely in all circles, not only in the imperial metropolis, Delhi, but in the different parts of northern and peninsular India, he had the capacity and excellent opportunities of seeing and judging things for himself. His semi-historical Masnavis and the *Miftah* and the *Khazain* that he wrote about the first two Khalji sovereigns and their campaigns and conquest in the north and the south, suffer not only from verbose, ornate and overdramatized descriptions, but also from a certain lack of candour in that, due to compulsion of circumstances, and exigencies of the situation. He had to omit certain inconvenient embarassing facts such as the atrocious murder of the first by the second of the Khalji ruler, some Mongol victories over Delhi army, the charge of parricide of the first sovereign levelled by some against the second of the Tughlaqs, and above all the strained relations between Hazrat Nizamuddin Aulia and some of the Mamluk, Khalji and Tughlaq Sultans. Be it said to his credit, however, that he had the courage sometimes to include in his panegyrical odes his ideas on conduct and duties of kings, and that he ignored but did not distort facts.

There was a good deal of justification for the considered view of the late lamented Dr. K.M. Ashraf that Amir Khusrau was pre-eminently a historian of contemporary social life, for what he has written about life and conditions of people from birth to death, about their food and drinks, cloths and costumes, toilets and ornaments, sports and amusements, manners and customs, social relations and behaviour, varied professions, means of livelihood, marriage and family life, arts and crafts, recreations, hunting excursions, agricultural and irrigational methods, language and literature, learning and education, virtues and vices of society, may be taken, when shorn of all verbiage and artificial literary ornamentations, as a fairly understandable delineation of what had existed or had been seen or thought about by our author. Such information as Amir Khusrau has furnished us within his Masnavis and in his *Rasail* enables us not only to theorise but also to get at the truth about the social conditions and cultural patterns of the age he lived in.

Considering the paucity of materials about social life in what are professed historical records, the allusions and references, remarks and observations, even of wit and humour in the literary

important in their own ways, for they sometimes provide valuable data which are useful in sociological studies, they are much too tinctured with superstitious beliefs, saturated with conservative traditions, preconcerted, irrational notions and beliefs, bias and prejudices, and tainted with a generality of puerile trifles. Much that is extraordinary, improbable and incredible is taken as miraculous and accepted as facts, and too much stress is laid on formal rituals and empty recurring of prayers. But even literary and religious sources with all their limitations are not absolutely devoid of importance because of the proximity of the time of the facts and things they record, the tastes of the age they indicate, and the picture of the times they depict. For our purpose and on this occasion it would suffice to concentrate on the most outstanding of the literary sources available to us in the works of Amir Khusrau, a man of versatile genius, of varied interests, humane and a humanist, liked by all classes of people, high and low, saying something about all whom he came in contact with. He was, however, not a Sufi in the proper sense of the term and many things attributed to him need critical survey and assessment. The chief importance of his works lies in the selection of Indian themes reflecting the tendencies, spirit, tastes, level, and pattern of society, culture, learning and conditions in general of the people of his age.

Some of his works like *Tarikh-i-Alai* or *Khazain-ul-Futuh*, *Miftah-ul-Futuh*, *Ashiqa*, *Nuh Sepahr* and *Tughlaqnama* have been included among the many different types and classes of historical literature. His *Kulliyat*, the five *Diwans*, and the *Khamsa* Masnavis, and his stupendous five-volume *Risail-ul-Ejaz* were neither command performances nor do they deal with historicai themes; they were the outcome of some inner urge, and what we get in them about the things of social and cultural import, after sifting the miscellaneous materials and clearing the grain from the husk are well worth our special attention. Amir Khusrau never claimed himself to be a historian, dealing with the past as a lesson for the future. He was interested in contemporary history and was largely concerned with what came within his personal experiences, and he made his observation about men and things, events and episodes of his own generation. Being a man of high connection, possessed of an inquisitive mind and keen observant eyes, deeply learned,

Amir Khusrau as a Social Historian

History has been generally considered as chronicles of kings, courts and conquests; and not as a record of the varying fortunes, variation of manners and beliefs of the people of a country like India. It is the narrative of occurrences and events, exploits, wars and politics, virtues and vices of rulers, foreign and indigenous which mattered most for the chroniclers and was the main reason for their attraction. They exaggerated the events, essentially political and military, ignored or paid scant attention to, or underestimated their social bearing, progress, or deterioration which were the outcome of pressures of parties and politicians. There is very little or clearly stated information in political chronicles about social conditions and institutions, groups or grades, social structures, aptitudes and functions, the modes and ideals of life of different classes, of people, upper, lower, middle, commercial, educated, uneducated, professionals, artisans, labourers, agriculturist, wage earners, slaves, beggars and vagrants, etc. of urban and rural areas. One wishes in vain to find in them full and understandable accounts of food and clothing, housing conditions, parts of the noble edifices, the conditions of lowly huts and dark corners, family or domestic life, feasts and festivals, games and pastimes, amusements and ornaments, rites and ceremonies, habits and customs, modes and morality, social ethics, interrelations, superstitious beliefs in omens and charms, astrology, good and bad days, dreams, witchcraft, and so on and so forth.

Important sources of information of such things are often found lying here and there, interspersed and hidden in literary maziness as artifices or in hagiological literatures. Literary works are laden with rhetorical, verbose expressions and sober facts are mixed with, and lost in, fanciful devices, verbal quibbles, hyperboles, and prolix trivialities. The hagiological works, though

17. *Ibid.*, p. 232.
18. *Ibid.*, pp. 83-4.
19. *Ibid.*, p. 23.
20. *Ibid.*, p 149.
21. *Ibid.*, p. 16.
22. There is a significant line in M. F. 'Kare Nami Bahadur Shah Sawaran Barun Zad Naubate Ba Chand Yaran' (Kare, the renowned brave Warrior and master of the horse came out and beat the forum with some of his followers). But Kare could not be Karad.
23. Amir Khusrau who was so fond of playing upon words with double meanings has given *Kabak* (partridge) and *Taihu* (Quail). In K. F. he mentions the Mongol chiefs, Iqbal, Tai, Bu and Kapak.
24. Rai Bunbal, Haider, Zirak as well as Kadar are not easily identifiable.
25. Compare the celebration in the recent times of *Monchon Ka Kunda.*'
26. *Tughlaq-Nama*, p. 25.
27. *Ibid.*, p. 86. Much more of such things are referred to in the *Ijaz-i-Khusrawl, Matta-ul-Anwar and Hasht-Bihisht.*
28. Generally the Bhats were geneologist or family bards and not the enchanters or *afsungaran.*
29. This 'hai, hai' is different from the auxiliary verb 'hai' of Khariboli. The text of the *diwan* of Hafiz, written or printed in India has this line which, if genuine, is very significant for those interested in linguistic studies. *Saqi agarat hawa-i-ma hai-juz bada mayar pesh-i-ma-shai.* The 15th century saint of Bihar, Qazi ola shuttari, puts this expression 'Khanda Hai Phanda Kahan' in the mouth of the 14th century Saint of Uchh, Makhdum Syed Jalal Bukhari *(Maadan-ul-Asrar)*.
30. According to some the addition in the *Ashiqa* came after the death of Mubarak Khalji, for Amir Khusrau could not afford to say anything disparaging of the Sultan in his life time.

reputation, and also to get reward for his literary performances. Viewed favourably he was a historian. It has to be admitted that his works have great historical value and the contributions made by him to historical literature are in no way negligible.

REFERENCES

1. Chapter V of P. Hardy's *Historians of Medieval India* deals with the treatment of History by Amir Khusrau.
2. See H. Elliot and Dowson, *History of India as told by its own Historians*, Vol. III, Chapter XII.
3. Hardy, *Historians of Medieval India*, p. 43.
4. He and his maternal grandfather were very enthusiastic about the characteristic Indian 'chew'. See the writer's fairly long paper entitled '*Betal Chewing and the early Muslims*.' Amir Khusrau writes about Imad-ul-Mulk, the Rawat-i-Arz or Ariz-i-Mamalik : 'I am the first of significant knowledge to owe my decent from that black-cheeked one (black *ariz*), and I have pointed out each and every particular of my family origin or lineage. That black one was the most elegant preamble to the state. I am a creation of the tip of the pen of destiny and a citation of that black one. I drown the dry grass (mean, base and ignoble thing) and bring out the pearl. Behold what a wonderful (ever-flowing) river has come out of that black cloud.'
5. Khusrau, *Ijaz-i-Khusravi*, (Lucknow 1865), Vol. I, pp. 28–31.
6. Strong and weak kings, Wazirs and other officials *Ibid.*, Vol. IV, pp. 40-44, good and bad artisans, Vol. IV, 48–49; also bad *Qazis*, corrupt officials, lawyers indulging in hair-splitting trivialities ; theologian ; Mashaikhs, good or bad, men of perverted tastes, *mukhannass*, dancers slaves, males and females etc.
7. See Khusrau, *Hasht Bihisht*, (Lucknow 1873), pp. 21–25, for the letter addressed to his daughter, Mastura.
8. Khusrau, *Matla-ul-Anwar*, (Lahore 1280 A. H.), the 10th Maqala, pp. 192–198.
9. They had advanced up to and invested the Imperial capital between 697-705 A. H. See Barani for a detailed account.
10. The question of court attendance, change of residence, rivalry with Khizr Khan, devotion to the saint, acceptance of Khusrau Khan's money, and *sama* were the chief factors.
11. Some of his versions are indirectly confirmed by other sources, e.g., Ibn-i-Batiuta describes Khusrau Khan's followers as being the bravest and the greatest who defeated Tughlaq's troops and pillaged his camp.
12. See Khusrau, *Tughlaq-Nama*, ed. Syed Hashimi Faridabadi (Aurangabad 1933) The published text which contains many errors wrongly gives '*si sad*' (3,000).
13. *Ibid.*, p. 112.
14. *Ibid.*, pp. 128–29.
15. *Ibid.*, p. 132.
16. *Ibid.*, p. 23.

fellows were engaged with their sorcery to give them protection.' We need not consider the ensigns and emblems of the Tughlaq except that, unlike the Hindus, the distinguished mark of his flag was the peacock feather. As regards the Hindi words and phrases, a number of these have been aptly brought in. It would suffice to quote one very significant line in its original : 'Cho Bukshadand Tir-i Be Khata ra-Bazari Guft' *(hai hai tir mara)*[29]

Before concluding, it seems necessary to say that Amir Khusrau's historical works have defects and merits of their own. His isolated fragments of historical continuum of about four decades, couched in a highly artificial, affected and obscure language and style cannot be put in comparison with the works of other medieval historians. His understanding of history did not centre upon records of historical occurrences systemetically and chronologically arranged, nor upon a set of ideas, but on persons and certain attractive themes. He does not always write in a straight forward manner, and seldom expresses his real sentiments lest that might offend and annoy those who were at the helm of affairs. He wrote with restraint about people whom he disliked for their character and conduct. He could not turn his eyes away from the atrocious deeds of Malik Kafur and Mubarak Khalji, but he had no hesitation in putting forward a lame excuse for the latter. He wrote in the *Ashiqa*[30] in the lifetime of that worthless son and successor of Ala-ud Din : 'When the unkind or callous *(be mihr)* Sultan became cynical and surly *(tursh chihr)* and malicious towards his kith and kin, he saw it advisable for his state to shed their blood and thought them to be fit for the sharp sword. He decided to become vindictive and malignant so that the country should be freed from co-sharers. He secretly despatched some one to Khizir Khan and disclosed apologetically what he had in his heart (the evil thought) that he was nursing against him.' One should keep a balance in one's praise and blame and should not be unnecessarily severe and deprecatory in one's attitude. It would not be fair to judge the past with the yardstick of the present standard. It cannot be said that Amir Khusrau felt any animus towards those who were vicious and worthless, but it was dangerous to be out-spoken in public life. The favourite of Nizam-ud-Din Aulia, the great saint of Delhi, was not a *khiraqa-posh darwesh* (wearer of Sufi garments made up of patches), and we cannot expect him to have laid bare the character and motivation of the great ones of the time or to have disentangled the casual relations of human events. His primary concern was to demonstrate his literary ability and gain a lasting

also through good fortune. Again, in the battle of Turtaq and Ali Beg you knocked down many heads like so many cauldrons. Your next target was the army of Kapak[23] and Taibu. You were responsible for the killing of the infidels, one by one. Again, near Bunbal, by the side of the river (sea), the army of the infidels had assembled like a river. It consisted of one Tuman (10,000) of fighting infidels. Similar was the number of the Rai of Bunbal.[24] The earth was bending under the weight of the infidels like a river. Your glorious name was Tughlaq-i-Ghazi and the Mughal also bore the name of Tughlaq. You Tughlaq had taken the sword in hand for the sake of the holy war. That Tughlaq had kept the arrow in the handle of his bow for the sake of the infidels......You pierced the heart of the infidels with your glance and made them all captives or slaves. You also exacted money from the Rai of Bunbal, and realised the river tolls for the year. You then marched against Haider and Zirak and broke the rank and file of those valiant ones. In this way you fought eighteen battles here and there, and in all these you came out victorious.'

The *Tughlaq-Nama*, like other works, is not devoid of things of social and cultural import. That it was a well established custom of the time to give a feast and entertain the guests at the first sign of the incipient beard,[25] is evident from the pathetic words of prince Abu Bakr, addressed to his miserable mother, just when he was about to be killed by the assassins. 'The down on the cheek of the youth is the signal for festive hospitality ; you may mourn for me without any mourner.'[26] We get here a glimpse into another prevalent practice. You see many jacket (or gown) wearing brides wandering about in the street of this city full of lusts.[27] Referring to the Hindu warriors, Amir Khusrau writes : 'There were Ahir Deo, Abar Deo, Amar Deo, demons upon demons, Narsih Sainsih, Barsih, Harmar, Bairimar, Parmar, all serpent-like and shouting *mar-mar* (strike, strike). The sandal-coloured robes on their bodies made the moist sandlewood dry with shame. All had wrapped themselves with a piece of silken cloth, ready to die, and felt proud of possessing bejewelled swords. Yet it is the custom with the Hindus that when they march out for battle, they wrap their heads with a kind of silken cloth called *baharaman*......By tying the tail of cows on to their flags the Hindus associated hundreds of violence with the hairs of the cow's tail. Many of them had hog's teeth hanging from their necks, symbolizing their ferocity and suggesting that they were in no way inferior to tigers. The war Bhatts[28] (bards) of those worthless

life of the age. Actually, very few have cared to scrutinize its contents, carefully and critically, and an ardent student of history is bound to be rewarded with useful information lying scattered here and there in it.

That the works of Amir Khusrau form a handy mine of factual information, which should not be taken to be historical irrelevancies, can be easily established. The historian Barani, at times, quotes him to confirm some of his views. In many particulars Barani's assertions are supplemented by the facts furnished by Amir Khusrau. There are many things which are found in his works alone. An example here will do. Barani tells us very little about the early life of the founder-Sultan of the Tughlaq dynasty. Amir Khusrau has put the following into the mouth of those who exhorted him to assume the crown : 'When the men of sober counsels heard this, they said what you have said befits you and is true ; but in throwing away your office you are taking away the pearl from yourself and putting it on others. All of us know what came about on account of your sword as that cannot be described by the tip of the pen. When the Khan (Ala-ud-Din) attacked the fort of Ranthambhor and laid siege to it, then the Rai Karad[22] made a stormy attack so that he should cut the iron siege by the sword of steel. He sent a strong force from within the fort which was like a mountain torrent sweeping off goods and chattels. There was such a loud and confused outcry in the camp of the Khan that one was falling on the other. You were ordered by the Khan to advance, and you went ahead of other chieftains. You displayed such valiant exertions in that battle as to make a whole world distressed. Two-thirds of the Rai's army was cut down and the remaining one-third managed with hundreds of pretexts to stay on. When you returned victorious from there you became a (much sought after) hawk in the hands of the Khan. This was the beginning of your good luck and the dawn of your rising fortune. When the Sultan was gone, the faith and the fidelities of the Tughlaqs remained with you......When another infidel (Mongols) marched against Baran (Bulandshahr) and made many Muslims his slaves like the Hindus, the king (Ala-ud-Din) sent you in that direction. You alone were responsible for the flow of the streams of their blood. There were four Tumans (each being the head of 10,000) and four Mirs (Chiefs) who were all princes of the Tartar dominion. When you encountered that agile, swift-winged force, you did what you did for a small return. When you decided to face the ill-starred Iqbal you came out victorious over him

and useful. There is not much to feel enthused over the ornate description of Delhi, of the Congregations at the Mosque, the lofty Minaret Mazina, and the Hauz-i-Shamsi or Sultani. The outer and inner Hisar (fortified enclosures) of the capital city, situated on the hills, the Shahr-i-Nau, wrongly said to have been built by Kaiqubad, the Rauza-i-Bagh and the river near by. The descriptions of the routes adopted from Delhi to Awadh *(Qiran-us-Saadain)*, Dipalpur to Delhi, *(Tughlaq-Nama)*, Delhi to the extreme southern regions across the Narbada and the Vindhya range *(Khazain-ul-Futuh)*, are not enlightening to some. The detailed account of the march of his army threading its way, stage by stage, from one place to another such as Alampur, Hansi, Madina, Rohtak, Mandoli, Palam, Kashanpur, Lahravati, *(Tughlaq-Nama)* is, perhaps, not of sufficient importance to catch the critic's eye, nor does the receipt of the letters by the provincial rulers of very distantly placed regions within the shortest possible time throw any light on the means of transport and communication available in the 14th century. As regards Ala-ud-Din's campaigns in the north and the south, though the dates, even months, have been given, the names of places, rivers and passes have been mentioned, and some indication is there, such as the reference to the availability of diamonds in abundance, the scheme of topography and chronology falls short of a historian's handiwork. It is not realised that many of the places mentioned are not easily identified because of their changed names on modern maps.

If the function of the historian is to enlighten and illuminate by throwing fresh, almost new, light on, and adding to the existing stock of knowledge of the past, then the wealth of solid, factual information, not available elsewhere, and furnished by Amir Khusrau's works, specially the *Miftah*, *Khazain*, and *Tughlaq-Nama*, entitle the author to be called a historian. Though the *Ashiqa*, *Nuh Sipihr*, *Qiran-us-Saadain* and even the *Risail-i-Ijaz* are not wanting in valuable information of political value, they are works of solid worth for those working in the field of social and cultural history. Of these the highly verbose, artificial, wearisome style of the *Risail*, which contains, in four big volumes, the accumulated mass of specimen letters and documents emanating from the inventive mind and prolific pen of Amir Khusrau between 682/1283 and 725/1325 have scared away scholars, and has been dismissed as a book of imaginary epistolary correspondence, full of frivolous futile matters, having no bearing on the political, social, intellectual and cultural

that the Delhi forces of Khusrau had already advanced upto Sarsuti, instead of being frightened by the numerousness of the enemy army he felt happy. He showed mirth and hilarity at his prospects like the ferocious wolf at the abundance of sheep and ram.'[18]

Amir Khusrau has been charged with not 'conceiving of human individuals as acting in or being acted upon by historical situations as modern historians would conceive them.' Some of his lines are well worth one's consideration in this connection. 'Such is the sure and certain narration of the story that whatever happened to Qutb-ud-Din (Mubarak Khalji) it was pre-ordained by the True Power.'[19] One single significant line tells us a lot about the whole background of Khusrau Khan's episode : 'If unfitting things had not been practised upon me such things would not have come out from me. I would not have committed this treachery.'[20] This laconic but meaningful reply, given in explanation of his misdeeds, refers to the root cause and to, perhaps, not an unjust grievance. What has been displayed in all its nakedness by Barani has been left unspecified by our refined and cultured poet-historian. He has not, however, spared his erstwhile deceased patron, has laid bare his character and conduct which caused his ruin, and has waxed eloquent on the consequences of licentiousness and negligence of rulers. 'Wine and love, lust and youth, pleasure and enjoyment, dominion and success. How can one whose mind is filled up with such air currents give thoughts to, and feel concerned with, the future ? It does not behove the ruler to become immersed in love and lust. A king is the constant protector of God's creatures. It would be wrong for such a guardian to remain intoxicated. If the shephered spoils himself by the use of pure wine, the herd goes in a state of sleep in the stomach of the wolf. In law, which means the rules and regulations of the Government, the stability of (political) affairs lies in vigilence and watchfulness. How can it befit a man who holds in his fists the cash of regions to lie carelessly on his back in his bed. It is not becoming on the part of a person to sleep over his affairs, for eventually he may be weighed down by the burden of his own remorse. This is specially the case with a king, for the enemies near his skin are much greater in number than his friends.'[21] If history has a moral purpose, such views and observations against the background of political events, as we find here and elsewhere, cannot be dismissed merely as trivial, unrealistic and conventional.

Amir Khusrau's critic does not find the particulars of geographical areas and topographical details given by him to be illuminating

the horse), had not lost their heart after their earlier discomfitures.' 'Malik Ghazi was standing in the battle-field, while his cavalry was engaged in plunder and pillage. All of a sudden a tumultuous Hindu horde, lying in ambush, appeared to deliver a severe assault. More than a thousand of Braus of black visage made a furious onslaught, and the Hindi daggers moved swiftly in shedding blood. That contingent of the Braus force fell on the standard and the rods of the banner were broken into pieces. The banner and ensign of Malik Ghazi were laid low on the ground. All glory to God 'What a bold heart was possessed by Malik Ghazi that in spite of this severe and surprise attack he did not stir out of the place he was occupying !'[14] This is followed by the lines indicating the measures adopted and the efforts put up to retrieve the situation. Here our poet-historian philosophises : 'When fortune places the crown on the head of a person, his enemy is annihilated in consequence of the damage done by him. Whatever lock is handled by him, every one of his fingers does the work of the key. If you see with discernment, you will find the quality of capability and fitness in everything through the ordination of Providence.'[15]

Was Tughlaq's victory and his eventual enthronement a mere accident, or was it destined by the Causer of Causes that he should act in a way so as to prevail ? Amir Khusrau's critic has a fling at the 'moral Islamic way' in which vicissitudes of fortune overtaking the Alais' family was lamented, but he does not fling his searching eyes on some significant lines which could provide answer to one of his charges about the non-mention of the sources of information.' 'Such misfortunes and calamities about which I used to hear before have now been seen by my own eyes.'[16] This observation occurs in connection with the detailed and pathetic account of the gruesome murder of the two princess, Farid and Abu Bakr, aged 15 and 14, who had received good education and had anished the Quran. One was practising archery, another was an intelligent boy interested in calligraphy, and both were in the act of prayer after performing the ceremonial ablution with dust in the absence of water when they were cut down by the sword of the ruffians. The sad and piteous tale of the blinding of the three surviving princes, Ali, Baha, and Usman, aged between 8 and 5 has been described on the testimony of a reliable eye witness. 'It is from the afflicted heart of one who was an eye witness of the calamity that such things have dripped out.'[17] Elsewhere, after dilating on the virtues of truth and fidelity, our authbr refers to a well-informed witness. 'Thus said one who was very well-acquainted with affairs that when Ghazi Malik came to know

Shaaban, 720, near Hauz-i-Khas of Delhi, our author says that a contingent of the usurper's army of probably ten thousand warlike Bradu (also spelt as Braus) cavalry broke through and paralysed the forces of Ghazi Malik, who was left only with 300[12] soldiers to rely upon. Nothing daunted, he stuck to his place. His bold stand and brave words inspired some of his followers led by Bahram Aiba, Baha-ud-Din Shaista and Malik Shadi. But they were hardly 500 in number. Let us read what Amir Khusrau has written in the *Tughlaq-Nama* : 'When all these gathered together they came to 500 and even less than that. When Malik Ghazi looked in front and behind he found only this small force and nothing more. But he did not care about the huge horde which he fancied was surrounding the umbrella *(chhatra)*. He cried out "God is great" at the top of his voice, and rushed forward foaming (as waves) towards the (opposite) umbrella and its bearer. He delivered his assault, boiling with rage, with such a fury that the entire battle-field began to resound with it. The impetuous attack of that excellent one of faith caused the confused assembly to become doubly confounded......In whatever direction Malik Ghazi turned his reins, no sooner the enemies saw him than they seemed to be giving up their ghost. A man suddenly appeared before him and at once received a fatal wound from an arrow. Then boldly, and with a fierce charge, he struck down the umbrella *(chhatra)* with such a hard blow that it fell upside down on the head of the luckless fellow (Khusrau). With the fall of the umbrella on the ground the order and arrangement of the enemy and the ceremonial dignity and insignia (carried as ensigns upon the elephant) fell in disorder. Hasan (Khusrau) was in headlong flight with his fleeing forces and the trumpet was blowing heralding proclamation (of Victory).'

Fortunately for the valiant Tughlaq his chief opponent was spiritless and over-awed. But by unloosening the purse-strings of the accumulated treasures, and playing, perhaps, on the explosive sentiments of his erstwhile fellow-religionists he had gathered an immense horde around him. There were the intrepid, desperate, 'Braus, arrayed in front of the war elephants.' 'Ten thousand cavalry of Ranas and Rawats,' and self-seeking Muslims 'who had become the attendants and servants of the Hindus and their constant companions and shadows.' In fact his army was so heavily manned by Hindus and Muslims as to astonish both the infidel and the faithful.[13] 'The Braus, each one of whom was swift and agile on the back (of

sallied out and rushed like a river full of raging waves. In this furious (swe:ping) charge they showed such firmness and constancy that one wing of the army of Malik Ghazi was dislodged and overthrown. Having penetrated through the opposite array of forces they fell on the rear. So much tumult and uproar arose among the people that one set of them fell upon the other. Many of the strong and sturdy troops took to flight and every one turned his bridle towards different directions. (But) Malik Ghazi did not leave his place with a small company of his troops, for he felt a pleasure in fighting for his life. Besides a single company of 300 cavalry behind him, none remained either in front or at the back. When Malik Ghazi saw the situation he was furious with rage and burst out angrily before those who were present. 'So long as my head remains in its place I shall not be alone. I would not look for help towards others for God is my helper.'

These extracts speak for themselves about the sane and sober attitude and methods of Amir Khusrau. But they may not be taken into account by those who think that 'Amir Khusrau's figures are either Virtuous or Vicious. They are gods or devils, not men.' The reference in the last sentence to the prospective Tughlaq Sultan's reliance on God may be provoking for one who contends that not only for 'Amir Khusrau but for all medievel Muslim historian and biographers, human characteristics are created outside the world of time and events, that is by God.' The orientalist and occidentalist ways and systems of religious and social thought do not always tally. It is the orientalist view that outstanding individuals are important in history, but an Invisible Power also plays, at times, a large part in making or marring their fortunes. The effort and endeavours of men are really responsible for the outcome of events and occurances, but human actions are always subject to the Divine ordination. Ali, the fourth Caliph, said : 'I have realised the existance of the Divine Power by the failure of my firm resolutions.' The Quran says : 'It often happens that the armies which are very small in number come out victorious over those which are numerically very large and superior.' The Western scholars, wedded to the materialistic view of life and actions, cannot appreciate these statements. But historical literature is not wanting in illustrative instances of unexpected occurances. It is worthwhile quoting some more verses from the same work.

Continuing his narrative of the second fight, on the initiative taken bv Khusrau Khan, on Saturday the first of the month of

intellectual honesty of our poet-historian, we have to take into account the prevailing atmosphere of the days of the despotic, meddlesome rulers and the need of advisable appropriate concealments. Partial omission of some provocative particulars, colourful verbose, literary presentation of facts and characterisation of high dignitaries were permitted by the stultifying conventions of the time, and they do not necessarily mean a tendency towards wilful suppression of truth. In fact, some of Amir Khusrau's seeming over-dramatizations, or over simplifications or even omissions and gaps do not matter much, for what emerges from his ornate and embellished picture is generally an accurate presentation of historical matters, including some new[11] facts not noticed by others. Amir Khusrau was a man of religion with a sense of dignity and responsibility. We may not forgive the historian in him for not bringing forward all the facts known to him, but considering his difficulties and limitations we cannot charge him with deliberate distortion of facts. On the other hand, we have evidence that he had an open, impartial and even a magnanimous mind. , While writing about the apostates, oppressors and exterminators of the Alai family, regarded as their worst enemies by the contemporary Muslims, he gives an unmistakable proof of a refreshing candour and objective attitude.

Those who have gone through the pages of Barani relating to the atrocious deeds committed by Khusrau Khan and his accomplices, may compare his fulminations and invectives against the people described by him as accursed and foul Parwari outcasts and scavengers, with the following verses of Amir Khusrau on page 19 of *Tughlaq-Nama :* 'Many Hindus who are known as Bradus had joined him and had become his accomplices in his perfidious deeds. Bradu is the descriptive epithet of those interpid Hindus who risk their lives (heads). These martial people are reckless of their lives and also know how to knock down the heads of others. This class of people are always in the front rank of their rulers, and are ever prepared to sacrifice their lives at the behest of their rulers. The unbelieving infidels, not looking into their futurity, are, in a war fought all at once, like ten-headed demons. Hasan (Khusrau Khan) assembled and stationed them all at a place (treasury) and put on their feet fetters of gold.' Again, on p 124 we are told about the fierce offensive taken by those dauntless warriors and the initial success that they achieved. When the two armies came to face each other with firm determination to create cracks in the opposite ranks, conquer and overthrow them from the side of the luckless Khusrau, one flank of his army

and chronologically, giving a connected and systematic account of the past and making valid historical analysis. But history with Amir Khusrau was contemporary history, and, he could not shake off his obsession with literary accomplishments.

Amir Khusrau has nowhere claimed to be a historian, and has frankly told us that he wrote his desultory studies on important historical topics either on the suggestion of, or for presentation to, the reigning sovereigns. There was no inner urge to do so. History cannot be written without some basis of selection from the multitude of happenings which constitute the quarry. Amir Khusrau's selection appears to be arbitrary and not in accord with what was inherent in the events and themes dealt with. But the principle of selection in most cases was not of his choice, but was dictated. He pours forth his eulogium with hyperbolic exaggerations not only on Ala-ud-Din, who was great in many ways, but also on his worthless and despicable successor in the *Nuh Sipihr*, and even in the prefactory[5] remarks of the *Ijaz-i-Khusrawi*. Even the best and the greatest of sovereigns had their virtues and vices, but Amir Khusrau is said to have been concerned with all that was good and he skips over all that was bad. Even a cursory glance over some of the pages of the ponderous volume of[6] the *Ijaz-i-Khusrawi* and over his observation in his romantic Masnavis, the *Hasht Bihisht*[7] and the *Matla-ul-Anwar*,[8] in respect of women, would suffice to enable one to revise such an opinion about him.

Many of the connected facts may have been known to him, but he has omitted some material which, circumstanced as he was, might have been embarrasing for him to recall. Perhaps he dared not mention in the *Khazain-ul-Futuh* or the *Tarikh-i-Alai* the brutal murder by Ala-ud-Din of his uncle and father-in-law, the mild good-natured founder-Sultan of the Khalji dynasty, on 16th Ramazan, 695. He mentions this date as the date of the accession of Ala-ud-Din to the throne. Even in his unofficial work, the *Ijaz-i-Khusrawi*, he ignores the heinous actions of his patron Sultan. We know from Barani about the critical situation created by the Mongols led by[9] Qatlagh Khawaja and Targhi, but Amir Khusrau has nothing to say about the discomfitures of the terrible and unscrupulous Sultan at the hands of his enemies, external or internal. He has made no reference to the uneasy relations between his spiritual[10] guide and Kaiqubad, Mubarak Khalji and Ghiyas-ud-Din Tughlaq in the *Qiran-us-Saadain*, *Nuh Sipihr* and *Tughlaq-Nama*.

But before challenging the character and questioning the

intervention of the Divine in human affairs,nor stereotyped descriptions of events connected with the deeds of kings, courtiers and nobles, unwholesome eulogium on those who were in power, and condemnation of those undeservedly praised during their life time, in total disregard of their good and bad, just and unjust, religious and impious actions. The historian is concerned more with groups than with individuals, more with human decisions than with Divine causation, more with the study of the past than with the delineation and appraisal of the facts and changes occuring in one's lifetime.

One cannot deny the aptness of much of such remarks, specially if one ignores the 13th Century tone, and the situation and the atmosphere of the age in which Amir Khusrau lived. He has been appraised mainly on the basis of his poetical and prose works, and, undoubtedly, he occupies a very high position as a talented litterateur and artist which he so eminently deserved. But his competence as a writer of history is questioned. Would it be fair, however, to say that his works do not contain all that a modernist likes to be the concept and appreciation of history. To what extent are we justified in blaming him for his failure to realise the need of a wide historical panorama, of a continuous, objective, critical, chronological, factual narrative, true to facts and morally instructive, and for his not rising above the pride and prejudices, fashions and traditions of the time ? Did he really miss the bus ? It is true that, as the son of an Amir of Iltutmish who was of Lachin Turkist extraction and the grandson, on his mother side, of a high official of Balban's court and of Indian origin, he had excellent connections in political circles, and had opportunities of observing many of the important events and gathering extremely important historical information from the notable and learned personalities he had contact with.

But history was not his prime concern. Religion, love of art and literature, search for beauty and the fulfilment of his economic needs by legitimate means were his dominant life motives. There was a possibility of his being deeply involved in contemporary politics by virtue of his upbringing and position, but as a Sufi and as one of the famous disciples of Nizam-ud-Din Aulia, he was of the world and also out of it in the sense that although he had to earn for his bread by his literary trade, he kept himself out of the controversial questions and situations arising from the ups and downs in the field of politics and religion. He was a man of learning and intelligence and was capable of handling historical subjects critically

determinatives. Nowadays we think that it is not the factual details, the mere narration in a dry as dust manner, of the series of events that actually happened—which count and constitute history. The more important thing is to say 'how this has come out of that.' A historian is expected to probe into the causes and effects and to find out the forces that helped to shape the events as they occured. The essence of history lies in an enquiry into the past, dedication to truth, objectivity, cause-effect nexus of events and movements, sound and critical judgement, and a sense of reasonableness in historical interpretation. The task of the historian is not like that of an advocate to prove or disprove a major fact or event, but to sift and evaluate the varied and multitudinous source-material and to act in the capacity of a judge and jury. He is mainly concerned with a diagnosis of the total situation on the basis of all available and verifiable evidence. He must tap and state all his source-material.

Judging by the standard laid down above, is one in a position to say that Amir Khusrau made some significant contributions with regard to history? Can one concede about him what Elliot and Dowson have said about Benakiti[2] that he was a poet as well as a historian? But a modern Western scholar opines that Amir Khusrau did not write history: he wrote poetry.'[3] The task of the historian is to reconstruct the past. He seeks to probe into things said and done so as to understand the present and predict the future. But the past did not have any spell for Amir Khusrau except when he was impelled by hopes of reward and desire for undying literary fame to carry out the behests of the ruling sovereigns. All his six historical works are characterized by disjointed themes, lacking in chronological sequences by florid, fanciful, verbose style and hyperbolic tone, by artificial literary devices, poetic imageries and literary art forms, sacrificing perspicacity, continuity, and accuracy of historical and topographical details. Looking at Amir Khusrau's life and career, the formative influences on him and the operating principles which might have guided him, a modernist may justly feel disappointed. He had a fairly long life, was possessed of potential capacity to understand and act upon his environment, and to utilise the accumulated experiences of past generations, interpreting them in such a way so as give them a realistic historical pattern and make them meaningful and useful for future generations. He allowed his opportunities to lapse. History does not involve, as Amir Khusrau might have thought, the assumption of unintelligible and inscrutable ways and course of Fate and

AMIR KHUSRAU AS A HISTORIAN

Unlike the philosophic Hindus who viewed this world, including human life, as an illusion and had, consequently, a certain disregard for history, the Muslims, like the ancient Chinese and the Greeks, seem to have had from the very beginning a keen desire to know the past and to collect and keep a record of men and events, happenings and occurrences. Their innate sense of enquiry and historical consciousness made them interested in the course of human affairs and anxious for rescuing the past from oblivion. They began to compile books containing biographical sketches, historical anecdotes and chronicles of events, public or private. Historiography, accordingly, flourished under the early Turks in India. Different types of historical literature were produced in India during the early medieval period. Historical writings of the period were of different variety in respect of style, literary form, outlook, method, content and value. The works of Minhaj Siraj, Hasan Nizami, Fakhr-i-Mudabbir are so different from one another, and also from those of Barani, Afif and others. But they were all professional historians and have been accepted as such by even modern European writers of history. The case of Amir Khusrau who, besides his five *diwans*, has four 'historical *masnavis*', and two prose works, also containing historical matter, is a little different, according to some writers,[1] as we shall see hereafter. The fact is that the view of history in that age was, as a whole, quite different from what we find today. The old medieval tradition of historiography that historical works could be written in a special style and might combine oratory and poetry, cannot commend itself to a modernist who abhors or finds very inconvenient the old patterns of rhetorical history. It is quite natural that the views on history and other subjects held by modern thinkers should have changed with the change of time, and the perspective of historians should not be the same as it was before.

History is now taken in a more comprehensive sense. Some centre their narratives on wars or conquests, others concentrate on law and government, state and politics ; and yet others view the economic, social, religious and cultural factors to be important

PROF. SYED HASAN ASKARI (b. 1901), Khujwa, Siwan / Saran, graduated, 1922, from G.B.B. (now L.S.) College Muzaffarpur, got his M.A. (in History) from Patna University, 1924, and B.L. 1925. Was Lecturer in History, Patna College, 1927, Asstt. Professor from 1934 to 1950, and Professor of History from 1950 to 56.

Associate Member of Indian Historical Records Commission, Member of Bihar Research Society's Council and Editorial Board of the Medieval India Quarterly, Served as Hon. Secretary of the Bihar Regional Records Survey Committee, Hon. Joint Director of the K. P. Jaiswal Research Institute, Patna.

He was conferred 'Honoriscausa' by Magadh University in recognisition of his valuable contribution to Medieval Indian History and Culture.



CONTENTS

AMIR KHUSRAU

AS A HISTORIAN

by
Prof. S. H. Askari
Patna

Contents

Printers : Liberty Art Press. New Delhi and Patna Litho Press. Patna.
Publisher : ______________ Khuda Bakhsh Library, Patna (Phone 50109)
Editor : Dr. A. R. Bedar
Annual subscription : Rs100-00 (Inland). 20-00 Dollars (Asian countries). 40 Dollers (other countries)Rs. 25-00 per copy.

Khuda Bakhsh Library

JOURNAL



47

1988

KHUDA BAKHSH ORIENTAL PUBLIC LIBRARY
PATNA-800004
(INDIA)

Khuda Bakhsh Library JOURNAL

47



Khuda Bakhsh Oriental Public Library
Patna